نسٹیئن

نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی کا ادبی مجلّہ

نسٹیئن

2012

جلد: 2

شمارہ: 1

نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی کا ادبی مجلّہ

سرپرست

انجینئر محمد اصغر

ریکٹر

مجلسِ مشاورت

انجینئر محمد شاہد

پرو ریکٹر

ڈاکٹر آصف رضا

پرو ریکٹر

محمود بشیر باجوہ

ڈائریکٹر سٹوڈنٹ افیئرز

اِدارت

ممتاز اقبال ملک

سرورق

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مِری نگاہ نہیں سُوئے کوفہ و بغداد
— اقبالؒ

زیرِ تعمیر نسٹ مین آفس کی ایک جھلک (دسمبر 2011ء)
SEECS کے طالب علم حسیب جمیل خان کا کمالِ فن

کمپوزکاری، تزئین: ندیم شہزاد

طابع: نسٹ پریس

ناشر: سٹوڈنٹ افیئرز ڈائریکٹوریٹ

ترتیب

الحمد لله رب العالمین

حمدِ باری تعالیٰ	سیّد مشکور حسین یاد	11

ذکرِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سلام	شاہ احمد رضا خانؒ	20
انسانِ کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	نسرین کوثر	18
آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دیدار		22
بلالؓ	علامہ اقبالؒ	23
راہِ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	حریم اکرام	24
ایسی محبت—اتنی محبت!		28
ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	جاوید چودھری	36

تابندہ باد

پاک سرزمین شاد باد		39
خونِ شہیداں کا تقاضا		41
قیامِ پاکستان ضروری تھا	سیّد حسنین کاظمی	45
سایۂ خدائے ذُوالجلال	محمد صادق	49
وطن کے لئے	یوسف شیدائی	50
نعمت آزادی کی	صہبا اختر	52

رُخِ آفتاب

قائدِ اعظمؒ		54
پیامبرِ اُمیدؒ		60
سلطان المجاہدینؒ		68
راجہ تری دیورائے	حسّان خالد	73

رشکِ چمن

خود انحصاری	سیّد یوسف حسین شیرازی	77
منزل ہماری	عاشق حسین	79
آبی ذخیرے	محمد سفیر تارڑ	81
کانِ نمک	محمد مرتضےٰ نعیم	87

بدلتے رنگ

کشمیر– حال اور مستقبل	اَرُون دتی رائے/ڈیوڈ بریسمین - تاریخ: حنا فاروق	94
تبدیلی کی لہر	ڈاکٹر انیس احمد	100
وال سٹریٹ کہانی	عبداللہ	104
بدلتی دُنیا	خالد رحمان	108

بزمِ ادب

حفیظ تائب کی آشوبِ مِلّت	سعید بدر	113
ادبی مُعمہ	انعام الحق	121
اردو کی اوّلیں ڈاکٹر	نُور السعید	125
الفاظ کی جادوگری	شان الحق حقی	127

بیانِ فطرت

نشانِ عظمت	سُمیّہ گُل	132
اللہ کی شان		138
زلزلہ	حامد افتخار شیخ	142

فسانے

زندہ باد	رفعت	147
وطن کی خدمت	نظر زیدی	153
کشمیر کا تحفہ	الطاف فاطمہ	157
بیٹی	سلطان جمیل نسیم	161
پہچان ہماری	نعمان منظور	165
دل کی فتح	عرفان پاشا	168
آخری تحفہ	محمد شعیب	171
اپنا گھر	انوشہ سلمان	173

شعلۂ آواز

حمد، نعت، نظمیں، غزلیں	سیّد محمود احمد، منیبہ زہرہ نقوی، سیّد نور الحسن، نوشابہ شیراز، محمد دیباج، اریبہ زہرہ، سیّدہ قُدسیہ، سارہ نزائین، زہرہ سیّد	178

موتی مالا

انتخاب	عمران بنگش AM College، سارہ جتوئی MCS، نیّرہ فاروق IESE، سبین راشد NBS، جنید احمد اعوان MCE، فاطمہ ریاض-اقصیٰ خورشید ASAB، کلثوم عباس SCEE، عمران اکبر اورکزئی، سیّدہ اسما IESE	185

افراداوراقوام	محمد اعظم	149
دلیرانِ گیاری	حُر رضا	151

گُفتارِ شیریں

چُھٹیاں	بشیر سیال	196
موبائل کبوتر	اشفاق احمد ورک	198
یہ میرا آشیاں	امجد اسلام امجد	202
مزاحیہ مشاعرہ	نسیمِ سحر، دلاور فگار، گستاخ گیاوی، کلیم چغتائی، انور مسعود، خالد محمود، عاصی اختر، ماجد صدیقی، ضیاء الحق قاسمی، اطہر شیر کوٹی، عبداللہ یزدانی، شاہد الوری، طٰہٰ خان، نذیر لدھیانوی، نیاز سواتی، جعفر رضوی، رضا رشید، عنایت علی خان، نذیر جالندھری	206

سائنس

ٹیکنالوجی کے بڑھتے قدم	ذوالفقار علی	211
لیلۃ القدر، آبِ زم زم، نماز: سائنسی جائزہ	عمل سرفراز	213
نوجوانی کی موت	سیّد اسلم	215
جسم کی دُنیا	معین الحق	219
کیوریاسیٹی	بسمہ سرفراز	89

جہانِ نَو

علامہ اقبالؒ سے مکالمہ		222
نسٹیئن بیاض		226
اظہارِ تعلق	اُسامہ حسن	230
معذرت کے ساتھ	مستنصر میر	232
آپ کا کیا خیال ہے	سامی مفتی	233
نسٹیئن پوسٹ	کلثوم عباس، اشہب حسن لودھی، حسن چیمہ، قانتہ طیّبہ، غلام قادر، فاطمہ ریاض، ریحانہ خان لعل خانی، جمال احمد، ساجد شفیع، زاہد نواز، عائشہ مشتاق	234

انتظاریہ

احوالِ بلوچستان	پروفیسر فتح محمد ملک	237
تہران پر طائرانہ نظر	قدرت اللہ چودھری	242
سوویت روس کا المیہ	میخائل گورباچوف - تاریہ: وقاص آفریدی	248
نئی اسلامی ریاست	محمد ایوب منیر	251
داستاں میری	سٹیو جابز - تاریہ: تسنیم مامون چیمہ	253
اولمپکس کا سفر	عتیق احمد	257
روہنگیا مسلمان	سلیم منصور خالد	263

ہمارے اِدارے

کالج آف الیکٹریکل اینڈ میکینکل انجینئرنگ	College of E&ME
ملٹری کالج آف انجینئرنگ	MCE
ملٹری کالج آف سگنلز	MCS
پاکستان نیوی انجینئرنگ کالج	PNEC
آرمی میڈیکل کالج	AM College
کالج آف ایرونا ٹیکل انجینئرنگ	CAE
سکول آف سِول اینڈ انوائرمنٹل انجینئرنگ	SCEE
سکول آف الیکٹریکل انجینئرنگ اینڈ کمپیوٹر سائنس	SEECS
سکول آف کیمیکل اینڈ مٹیریلز انجینئرنگ	SCME
سکول آف میکینکل اینڈ مینوفیکچرنگ انجینئرنگ	SMME
نَسٹ بزنس سکول	NBS
عطاءالرحمان سکول آف اپلائیڈ بائیوسائنسز	ASAB
ریسرچ سینٹر فار ماڈلنگ اینڈ سیمولیشن	RCMS
سینٹر فار اپلائیڈ میتھے میٹکس اینڈ فزکس	CAMP
نسٹ انسٹیٹیوٹ آف پیس اینڈ کانفلکٹ سٹڈیز	NIPCONS
سکول آف آرٹ، ڈیزائن اینڈ آرکی ٹیکچر	SADA
نسٹ انسٹیٹیوٹ آف لیڈرشپ اِن ایجوکیشن	NILE
سینٹر فار انرجی سسٹمز	CES

''نسٹین'' میں اشاعت کے لئے اساتذہ اور طلبہ اپنی تخلیقات براہِ راست اس پتے پر بھیج سکتے ہیں:

ایڈیٹر ''نسٹین''

سٹوڈنٹ افیئرز ڈائریکٹوریٹ، سٹوڈنٹ سینٹر، نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی، H-12 اسلام آباد

فون : 051-90851363 فیکس : 051-90851362

موبائل : 0321-5851363 ای میل : nustian@nust.edu.pk

پڑھنے/ڈاؤن لوڈ کرنے کے لئے: www.nust.edu.pk

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ تعالےٰ رحم وکرم فرمائے پاکستان اور اہلِ پاکستان پر کہ انہیں اعصاب شکن اندرونی مشکلات اور تشویشناک بیرونی معاملات کا سامنا ہے۔ بیرونی کھلاڑیوں کے کھیل کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے کہ شرارِ بُولہبی ازل ہی سے چراغِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پنجہ آزما ہے۔ سوال ہوسکتا ہے کہ یہ جو اندرونی بروکر ہیں' جو غیر ملکی سُنڈیوں کے حکم پر اُن کے زہر سے لُتھڑی زبانوں اور زیرِ زمیں وکھُلم کھُلا کارروائیوں سے بے چینی' عدم استحکام پھیلانے اور پاکستان و بانیانِ پاکستان ہی نہیں' اس کے اساسی نظریّے کے خلاف بھی ہرزہ سرائی کا کوئی موقعہ جانے نہیں دے رہے' ان کا مسئلہ اور بیماری کیا ہے؟ جواب سیدھا ہے اور آسان بھی- اور وہ یہ کہ ان لوگوں کو اللہ تعالےٰ نے قیامِ پاکستان کی بدولت ان کی اوقات سے زیادہ دے دیا! یہ بتائیں بھلا یہ کیا تھے قیامِ پاکستان سے پہلے اور انہوں نے کیا دیا پاکستان کو؟

ان کا ٹارگٹ نوجوان نسل خصوصاً ہونہار طلبا وطالبات ہیں جو اندرون اور بیرونِ ملک اپنی بے بدل علمی' تحقیقی اور تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت حیرتوں کی کتاب میں حیرت انگیز ابواب کا اضافہ کررہے ہیں۔ یہ بدزبان لوگ ٹی وی چینلز پر نوجوانوں سے کھُلم کھُلا کہتے ہیں کہ ''یہ ملک بھلا آپ جیسے ہونہاروں کے لئے کوئی رہنے کی جگہ ہے۔'' مخصوص چینلز کے اَن پڑھ اور اَن گھڑ ہاکرس کا ایجنڈا پیش کررہے ہیں؟ کون نہیں جانتا۔ جاہلوں سے بحث دانشمندی کی علامت نہیں اور ہمارے اقبال مند طلبا' طالبات اور نوجوان سب کچھ جانتے ہیں' پھر بھی ذکرِ نعمتِ ربِ کریم دوہرا دینا باعثِ ثواب ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے علاقے کی تین جوہری طاقتوں چین' روس اور بھارت کا ہمسایہ پاکستان کوئی معمولی نہیں' بڑا اہم ملک ہے جو بڑے بڑوں کے عزائم کا راستہ روکے کھڑا ہے۔ پاکستان اُس ایران کا پڑوسی ہے جس کو جلد یا بدیر زیر کرنے کے لئے اربوں کھربوں کے منصوبے رُوبہ عمل ہیں' کیونکہ اُسے ڈھیر کئے بغیر مشرقِ وسطیٰ پر تسلّط جمائے رکھنا ناممکن ہے۔ پاکستان اُس عوامی جمہوریہ چین کا قابلِ فخر پڑوسی اور بہترین دوست ہے جو آنے والے دنوں میں مغرب کو ہر میدان میں للکارے گا۔ پاکستان اُس افغانستان کا پڑوسی ہے' مخلوقِ خدا کو پتھر کے زمانے میں لے جانے کی دھمکی دینے والوں کو' جہاں سے جگ ہنسائی سے آلودہ پسپائی اور شرمناک فرار کے لئے پاکستان ہی کی مدد درکار ہوگی۔ کل کی بات ہے' سابق امریکی سیکرٹری خارجہ جارج شلز نے CNN کے ایک پروگرام کے دوران کہا: ''وسطی' مغربی اور جنوبی ایشیا کے سنگم پر واقع پاکستان کا وجود آزاد دنیا' حتیٰ کہ جاپان تک کی سلامتی کے لئے اہم ہے۔ خشکی میں گھری وسطی ایشیائی دنیا کے لئے یہ آکسیجن کی حیثیت رکھتا ہے...''

تو خود سوچئے دشمنوں کی نبضیں کیوں نہ ڈوبیں' اُن کی سانسیں کیوں نہ اُکھڑیں! اللہ تعالیٰ بچائے بڑے بول سے (آمین) ہم افغانستان اور ایران ہی نہیں' ماشا اللہ اپنے مخلص دوست اور اچھے بھائی چین کی بھی ضرورت ہیں۔ سِلک رُوٹ سڑٹیجی ہو یا اس خطے میں کسی بھی دوست یا دشمن کا کوئی سا بھی مفاد' پاکستان کو نظرانداز کرنا کسی صورت ممکن ہی نہیں۔ غور کرنے کی بات یہ بھی ہے کہ کیا شمالی کوریا نے بڑی طاقتوں کو انگلیوں پر نچا نہیں رکھا؟ کیا چین و جاپان کی ہر شعبے میں ترقی مغرب کے لئے خطرہ نہیں؟ کیا بھارت کا حجم' اقتصادی اَہداف' امریکہ کے ساتھ ساتھ چین' فرانس اور اب روس سے جنگی تعاون کے معاہدوں جیسے توسیع پسندانہ منصوبے کبھی نہ کبھی مغربی مفادات سے ٹکرانے کی چغلی نہیں کھاتے؟ اس سب کچھ کے باوجود اُن ممالک سے وہ خوف نہیں' جو مُلکِ پاکستان سے ہے! یہی بات اس قوت کا ثبوت فراہم کرتی ہے جو پورے عالَمِ اسلام سے بڑھ کر پاکستان میں موجود اور موجزن ہے' یعنی اس کا اسلامی نظریہ ونصب العین اور اس نصب العین کے تحفظ کے لئے جہادی عزم و جوہر۔ پاکستانیوں کی نسبت پاکستان کے بدخواہوں کو پاکستان کی اہمیت کا زیادہ علم واحساس ہے' اسی لئے تو یہ کھٹکتا ہے دلِ باطل میں کانٹے کی طرح۔

اپنی ساری کوتاہیوں اور کمزوریوں کے باوجود ملّتِ پاکستان میں بے حد صلاحیت' بے حساب امکانی قوت' اتحاد اور غیر معمولی جذبۂ خیر وفلاح موجود ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد پاکستان پہلا ملک ہے جسے فوجی جارحیت کے ذریعے دو ٹکڑے کردیا گیا' لیکن اہلِ پاکستان اِدھر ڈوبے' اُدھر نکلے کی اقبالؒ تعبیر بن کر ہر میدان کی صفِ اول میں نظر آنے لگے۔ بس ضرورت ہے بے لوث اور بے خوف قیادت کی جو قوم کی خوشحالی وترقی کے لئے صحیح نظم بندی' خطرات کے مقابلے اور بوقتِ ضرورت شر سے بھڑ جانے کے لئے درست تدابیر' واضح حکمتِ عملی اور جرأت مندانہ پالیسی اپنا سکے۔

اب اہلِ پاکستان کو فکری انتشار سے دوچار کرکے ذہنی عدم استحکام کا شکار بنانے کا محاذ کھول دیا گیا ہے۔ کہا' لکھا اور کہلوایا جارہا ہے کہ ''قیامِ پاکستان کی بنیاد پرانی ہوچکی' اس لئے (اللہ نہ کرے) اس کے وجود کو خطرہ ہے''۔ عرض یہ ہے کہ عقیدے اور نظریے لباس کی طرح صبح شام یا گرمی سردی میں بدلنے کی شے تو نہیں۔ ایسا ہو تو ہر قوم اپنی شناخت سے محروم ہو جائے۔ تحریکِ پاکستان قائدِ اعظمؒ کے اُس فرمان کی روشنی میں برپا ہوئی ''کہ مسلمان بھارت میں بسنے والی کوئی اقلیت نہیں بلکہ ایک ایسی جُدا قوم ہیں جس کا ربّ' دین' ایمان اور نظامِ عبادات ہندوستان میں بسنے والی دیگر اقوام سے قطعی جدا ہے۔ ہم پہلے مسلمان ہیں اور پھر کچھ اور...'' نتیجے میں 65 برس پہلے دنیا میں وہ ریاست وجود میں آئی جو انسانی تاریخ

میں پہلی بار دینی تشخص اور عقیدے کی بنیاد پر طلوع ہوئی۔ یہ تحریک و تاریخِ پاکستان اور دوقومی نظریّے کا مختصر اور جامع ترین پس منظر ہے۔ 1976ء میں عبدالولی خان کیس میں سپریم کورٹ نے قائدِ اعظمؒ کی پاکستان بننے سے پہلے اور بعد کی متعدد تقریروں کا حوالہ دیا جن میں دوقومی نظریّے کو تخلیقِ پاکستان کا بنیادی سبب اور اصل جواز قرار دیا گیا۔ تفصیلی فیصلے میں کہا گیا کہ ''... پاکستان کی بقا کی لازمی شرط بھی یہی نظریہ ہے ...'' (پی ایل ڈی 1976' سپریم کورٹ' صفحہ 167)۔ بے نظیر بھٹو بنام وفاقِ پاکستان کیس میں سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا ''... اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ نظریۂ پاکستان مسلم قومیت پر مبنی اور اسلامی نظریۂ حیات پر مشتمل ہے جس کا مطلب دستور میں واضح الفاظ میں 'قرآن وسنت کے احکام' قرار دیا گیا ہے اور یہی مسلم قومیت کے تصور میں اصل عنصر تھا۔ یہی تصورِ برِصغیر کی تقسیم پر منتج ہُوا جو دوقومی نظریہ کے نام سے معروف ہے۔ اسلامی نظریۂ زندگی کا تصور نظریۂ پاکستان کے ساتھ قطعی پیوست ہے۔ اسے اس سے الگ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ دوقومی نظریے کی بنیاد ہے' اس لئے پاکستان کی سالمیّت میں نظریۂ پاکستان ہی نہیں' اسلامی نظریہ (اسلامک آئیڈیالوجی) بھی شامل ہے ...'' (پی ایل ڈی 1988' سپریم کورٹ' صفحہ 416) اس نظریے کو [آرٹیکل 2' 13 کے تحت] آئینی تحفظ بھی حاصل ہے۔

اللہ کی مرضی! اس ملک میں رہ کر' اس ملک کا کھا کر بیرونی مفادات وافکار کی جگالی کرنے والے بیچو لئے اس ملک کے (خاکم بدہن) ٹوٹنے کی بات یوں کرتے ہیں جیسے کانچ کی چوڑی توڑنے کا ذکر ہو رہا ہو۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہر دور میں دنیا میں ایسی قوتوں کا دبدبہ وغلبہ رہا ہے جنہیں آج کے محاورے میں سُوپر پاور کہا جاتا ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران ہر سُوپر پاور کی سرتوڑ مخالفت اور مسلمانانِ ہند کی بے سروسامانی کے باوجود صرف سات سال کی جِدّ وجُہد کے بعد پاکستان کا معرضِ وجود میں آجانا ایک عجوبہ ہے۔ اس عجوبے کے ظہور سے کیا یہ حقیقت واضح نہیں ہو جاتی کہ قیامِ پاکستان اُس ذات پاک کا نمونۂ قدرت ہے جو دنیا کی تمام سُوپر پاورز سے بالاتر' قوی تر اور عظیم تر ہے۔ جو جب چاہے کسی ناتواں' بے سروساماں کو قوت وعظمت بخش دے اور جب چاہے کسی صاحبِ جبروقوت کو خاک پر پٹخ دے۔ جب ذات باری تعالیٰ کو منظور ہُوا کہ اپنے پسندیدہ دین کو سیاسی شوکت بخشنے کے لئے ایک خطۂ زمین کو جغرافیائی وحدت کے طور پر ہویدا کرنا ہے' تو پاکستان کو طلوع کر دیا۔ پاکستان کو نقصان پہنچانے کے لئے بیرونی دشمنوں کے علاوہ پاکستان کے اندرونی دشمنوں کی چالیں اور منصوبے بھی اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں بار بار تار تار ہوئے۔ اسی لیے تو پاکستان اپنے ہر خیر خواہ اور بدخواہ کو پکار پکار کر بتا رہا ہے' سنا رہا ہے:

''انشاءاللہ تعالیٰ مَیں نے رحمتِ باری تعالیٰ کے سائے میں بہرحال قائم رہنا ہے!''

عزیز طلبا وطالبات سے جاتے جاتے آخری گزارش کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کی منشا سے قائم ہُوا اور اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ ہی اس کی محافظ ودستگیر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے عطا کردہ پاکستان کو ہمیشہ یا لمبے عرصے کے لئے کسی مصیبت یا آزمائش یا سزا سے دوچار نہیں رکھے گا۔ پاکستان کے استحکام کے لئے جو کوئی بھی کوشش کرے گا' وہ اللہ تعالےٰ کی خوشنودی پائے گا۔ جس شخص یا گروہ نے اس ملک میں اپنی کبریائی کا تخت بچھانے کی کوشش کی- ہم دیکھ چکے ہیں- وہ نشانِ عبرت بنا۔ اس لئے اندرونی وبیرونی شر' تخریب' من مانی اور منہ زوری کے اندھیروں سے ہرگز بددل نہ ہوں۔ انہیں صرف چار کام کرنا ہیں' آگے اِس مُلکِ خداداد کا خالق ومالک جانے اور اُس کا انتظام وانصرام:

پہلا: مطالبۂ پاکستان کے وقت اللہ تعالےٰ سے کئے گئے وعدوں پر عمل پیرائی کا عملی مظاہرہ

دوسرا: اللہ تعالےٰ کی عطا کردہ نعمت- اسلامی جمہوریہ پاکستان- سے غیر مشروط وفاداری اور اس کے اساسی نظریے کی کارفرمائی وتحفظ کا حق ادا کرنا

تیسرا: زبان' قبیلے' طبقے اور صوبہ پرستی کی بدروح کو ذہن اور سوچ میں گُھسنے نہ دینا

چوتھا: دورانِ تعلیم اپنی تمام تر توجہ تعلیم پر۔ بعدازاں کام' کام' کام اور خدمتِ ملک وعوام

ان شاء اللہ تعالےٰ قُدرتی وسائل' افرادی توانائی اور امکانات ومواقع سے لبالب پاکستان آباد رہے گا اور پاکستانی شاداب۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس اور ناموس مبارک سے بے مثال محبت رکھنے والوں کے مُلک پاکستان میں شر پر خیر کے غلبے اور اندھیروں پر نُور کے راج کے لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تصرّف' توجہ' عطا اور نگاہ کا آغاز ہو چکا۔ اور یہ دُور نہیں' مستقبل قریب کا منظرنامہ ہے۔ دُنیا بھر میں جہاں بھی اعلیٰ تعلیم اور کامل مہارت کے حصول کے مواقع ملیں' ضرور فائدہ اُٹھائیں۔ یہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاکید کی تعمیل ہے۔ علم وہنر میں اضافے اور صلاحیت کو دوچند کرنے کے بعد آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبتوں کے اجر میں اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ وطنِ پاک میں آکر اپنے ہُنر اور تجربے سے پاک سرزمین کو شاد باد کر دیں اور اسلام اور پیارے پاکستان سے غیر مشروط وابستگی کو مرکزِ ایقان جان کر سُوئے منزلِ مُراد بڑھے چلیں' بڑھے چلیں۔ صرف حرفِ دعا اور زادِ راہ ہی نہیں' نویدِ کامرانی بھی ہے یہ اقبالؒ تبرّک:

پوری کرے دعائے محمدؐ تیری مُراد
کتنا بلند تیری محبت کا ہے مقام!

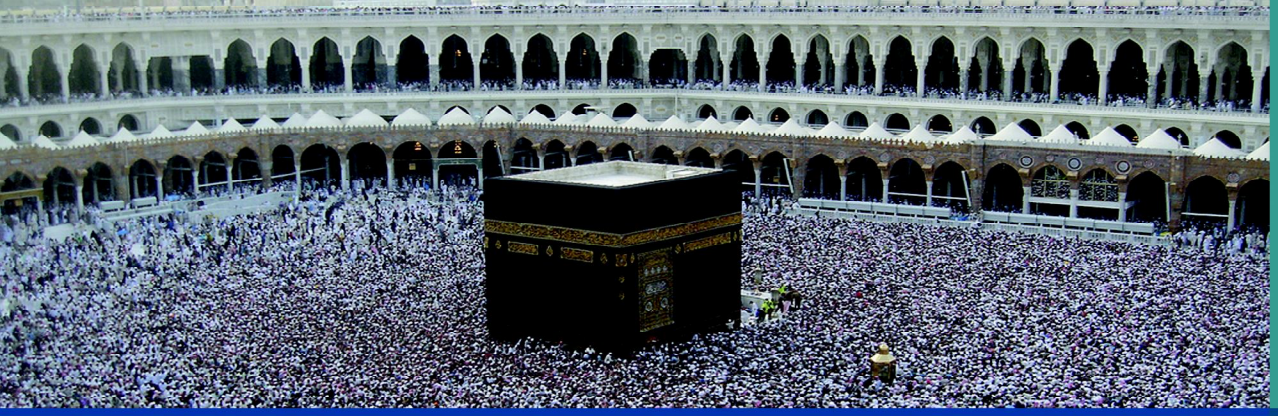

الحمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمین

رُتبہ تیرا ہے بڑا ' شان بڑی ہے تیری
پردۂ نور میں مستور ہے ہر شے تیری

— اقبالؒ

الحمدُ لِلہِ رَبِّ العالمین

ربِّ کریم نے سیّد مشکور حسین یاد کو حمد سرائی کا بڑا ہی اچھوتا انداز عطا فرمایا۔ وہ قرآنِ مجید کی مختلف آیاتِ مبارکہ کو ذہن اور روح میں سمو کر بارگاہِ ربّ العالمین میں حمد و ثنا پیش کرتے ہیں۔ یہ آیاتِ مبارکہ کا ترجمہ نہیں ہوتا' بس ایک مجموعی ذہنی تاثر اور گہری قلبی کیفیت کا عکس ہے جو کاغذ پر منتقل ہو کر دل و دماغ میں یوں رچ بس جاتا ہے کہ ہر پڑھنے والا اسے اپنی آوازِ دل قرار دیتا ہے۔ استاذِ گرامی نے یہ منفرد سوغات نسٹیئن کے قارئین کے لئے مرحمت فرمائی۔ ربِ کریم سیّد صاحب کو اجرِ بے کنار سے نوازے اور اس عطیۂ بے بدل کو ہر مسلمان کا وِردِ زباں بنا دے۔ آمین!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم کرنے والا ہے

اِسم کا تحیّر ہے
یا کوئی تصوّر ہے
اِس یقینِ محکم کا
جس نے اپنے سینے سے
یُوں لگا لیا مجھ کو
جیسے مَیں ہی وہ تنہا
معنیٔ درخشاں ہُوں
جس کی روشنی لے کر
وقت آگے بڑھتا ہے
اور صحنِ امکاں کی
اِک کتاب کُھلتی ہے

الحمدُ لِلّٰہ ...

تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا ربّ ہے

سورۂ الفاتحہ - آیت:1

صد شکر ہم بھی صاحبِ موصوفِ حمد ہیں
کیا بات ہے ہماری کہ مصروفِ حمد ہیں

شہرت بھی اپنی خوب' تعارف بھی خوب ہے
مشہورِ حمد کیوں نہ ہوں' معروفِ حمد ہیں

ہے ہم سے بڑھ کے صاحبِ ہوش و حواس کون
ہم میں وقوفِ حمد ہے' موقوفِ حمد ہیں

کیوں رحمتوں کے ساتھ نہ ہوں حکمت آشنا
ہم فیلسُوفِ وقت ہیں' ملفوفِ حمد ہیں

کونین ایک ذرّہ ہمارے وطن کا ہے
باشندگانِ خطۂ مالوفِ حمد ہیں

لقد خلقنا الِانسانَ فِي اَحسنِ تقوِیم°

ہم نے انسان کو بہترین صورت اور بہترین نظام میں پیدا کیا ہے

سورۃ التین - آیت:4

ترا کرم ہے کہ ہم فضائے دوام میں سانس لے رہے ہیں
تری عنایاتِ بے کراں کے نظام میں سانس لے رہے ہیں

ازل کی صبحِ عمل کے سارے جمال کو جذب کر لیا ہے
اَبد کی تازہ ترین رنگین شام میں سانس لے رہے ہیں

تری عنایت سے اپنے قلب ونظر کی وسعت پہ ہم ہیں نازاں
خواص سے بڑھ کے جی رہے ہیں، عوام میں سانس لے رہے ہیں

ہماری ایک ایک سانس پرہے عجیب کیفیتوں کا عالَم
دُرود کے جام پی کے دارالسّلام میں سانس لے رہے ہیں

نَفَس نَفَس لب پہ نام تیرا، ہے ذکر ہر صبح وشام تیرا
خوشا یہ توفیق! تیرے اِک اِک پیام میں سانس لے رہے ہیں

وہ اور ہی اہلِ غور ہیں جن کو خوفِ مرگ و حیات ہو گا
ہمارا کیا ہے کہ ہم تو تیرے کلام میں سانس لے رہے ہیں

مکان پیچھے زمان پیچھے، زمان کی آن بان پیچھے
کہ ہم ترِے نورِ معرفت کے خرام میں سانس لے رہے ہیں

تمام ارض و سما ہمارے حضورؐ کے آگے سَرنگُوں ہیں
ہم اِس ادا سے عبودیّت کے خیام میں سانس لے رہے ہیں

برہنہ شمشیر کی طرح بس تُو ہی نکالے گا ہم کو ورنہ
ہم اپنی تیغِ انا کی تِیرہ نیام میں سانس لے رہے ہیں

° تقویم کے معنی کسی چیز کو مناسب صورت، معتدل نظام اور شائستہ کیفیت میں لانا ہے

فا للهُ خیرُحٰفِظاً و ھُوَ اَرحَم الرّاحمین

پس اللہ خوب حفاظت کرنے والا ہے اور وہ بہت مہربان ہے

سورۂ یوسف - آیت:64

ہنگامۂ عالَم ہے ترے حفظ و اماں میں
اس زُلف کا ہر خم ہے ترے حفظ و اماں میں

ہاں غم ہے مگر غم ہے ترے حفظ و اماں میں
یہ کیف کوئی کم ہے ترے حفظ و اماں میں

سائے میں ترے وقت کی ہر تیکھی اَدا ہے
ہر شوخیٔ عالَم ہے ترے حفظ و اماں میں

یا ربّ دلِ بے تاب کِیا تیرے حوالے!
یہ خطرۂ پیہم ہے ترے حفظ و اماں میں

تُو جذبۂ غیرت کے تلاطم کا نگہباں
ہر موجۂ برہم ہے ترے حفظ و اماں میں

امیّد کا پرچم کوئی کس طرح جھکائے
امیّد کا پرچم ہے ترے حفظ و اماں میں

جب چاہے اِسے آدمی کر سکتا ہے حاصل
ہر عظمتِ آدم ہے ترے حفظ و اماں میں

زیر و بمِ امکاں کا ہے بس تُو ہی محافظ
آدم کا ہَر اِک دم ہے ترے حفظ و اماں میں

ہر سانس نیا جذب ہے، ہر سانس نیا کشف
جدّت تو مقدّم ہے، ترے حفظ و اماں میں

وَاَمَّا بِنِعمَةِ رَبِکَ فَحَدِّث

اور اپنے ربّ کی نعمتوں کو یاد کر

سورۂ والضحیٰ - آیت:11

ہر سانس ترے شغل میں مشغولِ جہاں ہے
اپنا تو یہی عرضِ جہاں، طولِ جہاں ہے

مردُودِ جہاں ہے کوئی مقبولِ جہاں ہے
پردے میں ابھی تک ترا معقولِ جہاں ہے

ہر لحظہ ترا ذکر ہے، ہر لمحہ تری یاد
یہ سلسلۂ شوق تو معمولِ جہاں ہے

ہے اِس سے کہیں آگے کی شے تذکرۂ ربّ
معقولِ جہاں ہے نہ یہ منقولِ جہاں ہے

ہر بات کا ملتا ہے جواب اہلِ وفا سے
ہاں جذبۂ ایثار ہی مسؤلِ جہاں ہے

انسان اُسے پھر بھی سمجھ لیتا ہے اپنا
جو راندۂ درگاہ ہے معزولِ جہاں ہے

وھُوَ الّذِی اَنشالکُم السَّمعَ وَالاَبصَارَ وَالاَفِدَة

اور وہ ایسی ذات ہے جس نے تمہیں کان، آنکھ اور دل (عقل) سے نوازا

سورۂ مومنون - آیت:78

یا ربّ تیری ایسی عطا ہے ہوش و حواس کا سرمایہ
جس کے سامنے بے مایہ ہے وہم و قیاس کا سرمایہ

پھر بھی ہم میں کتنے ہیں جو اس سے فیض اُٹھاتے ہیں
حالانکہ موجود ہے دل میں شکر و سپاس کا سرمایہ

موتیوں کے ویسے ویسے ہی اُس کو سمندر ملتے ہیں
جیسے جیسے جو رکھتا ہے اپنی پیاس کا سرمایہ

ہمیں ہے تیرے نام پہ مرنے جینے کی دولت سے غَرَض
ہم کیا جانیں کیا ہوتا ہے خوف و ہراس کا سرمایہ

آدمی کو جو کسی بھی حال میں دیکھ نہیں سکتا نادار
ایسا وسیع و عظیم ہے مولا تیری آس کا سرمایہ

تیرے نام سے نامعلوم کے لاکھوں بھید بتاتا ہے
حق کی اساس کا سرمایہ ہے، یہ احساس کا سرمایہ

لِمِثلِ ھذَا فلیعمَلِ العٰمِلُون

ہاں کوشش کرنے والوں کو ایسی جزا کے لیے کوشش کرنا چاہیے

سورۂ صافات - آیت:61

جو تری نگاہوں کی پرسشوں میں رہتے ہیں
وہ بھی کس قدر پیاری بندشوں میں رہتے ہیں

تیرے حُسنِ وحدت کی تابشوں میں رہتے ہیں
ہم کہ عینِ حکمت کی بارشوں میں رہتے ہیں

تجھ سے قربِ پیہم کی خواہشوں میں رہتے ہیں
ہم بھی کیسی خوش پیماں سازشوں میں رہتے ہیں

ہم سے کیا کوئی اونچا ہو گا اِس زمانے میں
ہم تری نوازش کی نازشوں میں رہتے ہیں

تیرے ذکر کا بادہ سانس سانس آمادہ
جسم و جاں کے پیمانے گردشوں میں رہتے ہیں

ہے شبابِ دو عالَم تیرے ذکر سے قائم
وقت کے تمام اعضا ورزشوں میں رہتے ہیں

اَلا اِنّ اولیاء اللہِ لا خوفُ علیھم ولا ھُم یحزنُون

سنو کہ اللہ کے دوست نہ ڈرتے ہیں اور نہ غمگین ہوتے ہیں

سورۂ یونس - آیت:62

جن کے دلوں میں ملن اُجالے اُن پر کوئی خوف نہ حُزن
جو ہیں تیرے چاہنے والے اُن پر کوئی خوف حُزن

جو ہر حال میں تجھ کو پکاریں خود کو سنواریں سچ کے سنگ
وہ تیری رحمت کے پالے اُن پر کوئی خوف نہ حُزن

جنہوں نے تیرے صبر و رضا کی راہوں میں رکھے ہیں قدم
ان کو تیرا فضل سنبھالے اُن پر کوئی خوف نہ حُزن

دنیا کے غم آدمی کو کر دیتے ہیں لاچار و حزیں
جو ہیں تیرے غم کے حوالے اُن پر کوئی خوف نہ حُزن

جو دنیا کے پیچھے بھاگے وہ یوں ٹوٹے جیسے دھاگے
جنہوں نے تیرے بھید نکالے اُن پر کوئی خوف نہ حُزن

دو عالَم کو احاطہ کر کے جنہوں نے تیرا نام لیا ہے
وہ ہیں رُخِ ہستی کے ہالے اُن پر کوئی خوف نہ حُزن

وما کانَ عطاءُ ربِّکَ مَحظُورًا

اور تیرے ربّ کی عطا کبھی کسی کے لیے ممنوع قرار نہیں دی گئی

سورۂ بنی اسرائیل - آیت:20

کیا آدمی کو اور مُرادِ تجرّد ملے
لیتے ہی تیرا نام حیاتِ اَبَد ملے

کیسے ترے شمارِ نوازش کی حد ملے
جب دیکھو بے شمار ملے، جو عدد ملے

اُس عبد کے نیاز میں کیا کیا نہ ہوں گے ناز
تہذیبِ قلب کو جسے ذوقِ صمد ملے

تیرے کرم سے نور میں تحلیل ہو گئے
جتنے بھی ہم کو خاکِ جَسَد سے حَسَد ملے

انعام ہائے جاں کو ہمی نے بُھلا دیا
تیری جناب سے تو بصد شدّ و مدّ ملے

ہے یہ بھی اختیارِ بشر پر نزولِ خیر
کیسے ملے، کہاں سے ملے، کیوں مدد ملے؟

اِنّ ھٰذا لَرِزقُنا مالہُ مِن نَفاد

یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا

سورۂ ص - آیت:54

تُو نے وحدت میں سموئی ہے جو ''ہے'' کی کثرت
کیوں نہ خیرہ کرے آنکھوں کو یہ شے کی کثرت

جس بھی آواز کو سنتے ہیں، تُو ہی بولتا ہے
تیری یکتائی کا اعلان ہے، لَے کی کثرت

دل میں کچھ ہو تو جبھی کون و مکاں گونجتے ہیں
نغمے برساتی نہیں دَہر میں نَے کی کثرت

حکمرانی تِری مانیں تو ہے سب کچھ، ورنہ
خاک ہے مملکتِ قیصر و کَے کی کثرت

اِس کی بے مانگی پر غور کیا ہے کس نے
بوکھلا دیتی ہے دُنیا کو روپے کی کثرت

وقت یوں دوڑا چلا جاتا ہے سرپٹ یا ربّ
جیسے گھوڑے کے سُموں میں ہے سَمے کی کثرت

وَقَالَ رَبُّکُمُ ادعُونِی اَستَجِب لَکُم

اورتمہارے ربّ نے کہاتم مجھ سے دعا کرو مَیں تمہاری دعا قبول کروں گا

سورۂ مومن - آیت:60

صبح کا وقت ہو یا تاروں بھری رات کا وقت
کون سا وقت نہیں تجھ سے ملاقات کا وقت

سجدے میں گذرے کہ افلاکِ ثنا میں گذرے
عرش تا فرش ہے سب فخر و مباہات کا وقت

ذرّہ ذرّہ ہمیں آنکھوں پہ بٹھائے ہر دم
یہ مدارات کا عالَم یہ مدارات کا وقت

نام لے کر ترا جب چاہیں دکھائیں ہمّت
ناقصوں کے لیے ہر وقت کمالات کا وقت

بختِ انساں کی خوشا تازگی و شادابی
سبزہ و گل سے ہے لبریز نباتات کا وقت

ہر گھڑی قیمتی کاموں میں ہے مصروف زمیں
جگمگاتا ہے جواہر سے جمادات کا وقت

سانس لیتے ہیں تو اِک معجزہ سا لگتا ہے
اور کہتے ہیں کسے کشف و کرامات کا وقت

کچھ نہ کچھ بخشتا رہتا ہے تُو ہر دم مولا
زندگی کیا ہے؟ ترے تحفہ و سوغات کا وقت

ہم سے سنبھلے کہ نہ سنبھلے یہ ہماری توفیق
تُو نے تو سونپ دیا صورتِ حالات کا وقت

کوئی آگے تو بڑھے حوصلہ تو دکھلائے
ہے سبھی کے لیے وا معجزۂ ذات کا وقت

وَاِنَّ رَبَّکَ لَذُو فَضلٍ عَلَی النَّاس

اور تیرا ربّ تو لوگوں پر ہمیشہ فضل کرنے والا ہے

سورۂ نحل- آیت:73

ہمارا حال تری رحمتِ سماع میں ہے
جبھی تو وقت کی اِک اِک اَدا دفاع میں ہے

وجود رکھتی ہے رحمانیّت قرار کے ساتھ
ہے شیطنت بھی مگر حالتِ وداع میں ہے

بَوجہِ عقل ہیں خُلدِ تعلقات میں دوست
بَوجہِ جَہل عدُو نارِ صد نزاع میں ہے

وہ تیرے نام پہ کیا کچھ لُٹا نہیں سکتا
یہی تو فائدہ انسان کو ضیاع میں ہے

ملے گا آدمی کو جلد آدمی کا مقام
ابھی تلک یہ خبر بزمِ اطّلاع میں ہے

عجیب طرح کا تنہا ہے یہ تیرا بندہ
کہ جب بھی دیکھو محبت کے اجتماع میں ہے

وَمَا نُنَزِّلُ مِنَ القُرآنِ مَاهُوَ شِفَآء

اور ہم قرآن کے ذریعے سے وہ چیز نازل کرتے ہیں جو شفا ہے

سورۂ الاسرا' آیت:82

تیرے کرم سے تاجِ صحت سر پر رکھے
جانچ رہا ہُوں کشورِ ہست و بُود کے نقشے

تیرے حکم اشیا پر پیہم جاری و ساری
میرے سامنے ہیں اشیا کے روپ انوکھے

صحت کے باعث وہ مجھ میں تازگی آئی
چمن چمن کا پھول مجھے کِھل کِھل کر دیکھے

تیرے شوق میں اتنا تیز اُڑا جاتا ہُوں
میرے سارے وجود میں شہپر لگ گئے جیسے

تو نے اُس پر شہر کے شہر آباد کئے
میں نے دل کی بات بتائی چپکے چپکے

وَاَن لَّیسَ لِلاِنسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی

اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس میں وہ کوشش کرتا (مصروف رہتا) ہے

سورۂ النجم' آیت:39

خدا کا شکر ہے اُس نے مجھے مصروف رکھا ہے
کہ جس کی وجہ سے ہر سانس میری صبحِ فردا ہے

مَیں جب کاموں کی فہرستِ فراواں دیکھ لیتا ہُوں
مجھے لگتا ہے میری ذات خوشیوں کا جھمیلا ہے

مِرے خوں میں جوانی کی روانی کیوں نہ آ جائے
یہ میرے کام ہیں یا مجھ کو دلداروں نے گھیرا ہے

رفاقت کی بشارت کیا' مِرے مولا نے بخشی ہے
مَیں اُس کے ساتھ ہوں ہر دم' وہ میرے ساتھ ہوتا ہے

مَیں اُس کا نام لے کر جب بھی کوئی کام کرتا ہُوں
پتا چلتا ہے کن کن طاقتوں نے مجھ کو پالا ہے

مِری ہر بات اِک دلدار ہے' خاموشی اِک دلبر
مِری مصروفیّت میں عاشقی کا بول بالا ہے!

رَبَّنَا اَفرِغ عَلَینَا صبرًا و ثَبِّت اَقدَامَنَا

اے ہمارے رب ہم پر صبر کے دہانے کھول دے اور ہمیں ثابت قدم رکھ

سورۂ البقرہ - آیت:250

ہم ہیں جو تیرے ذکر سے موسمِ صبر و شکر میں
عافیتِ کمال ہے عالَمِ صبر و شکر میں

زخمِ جہاں کہ زخمِ جاں' بَن گئے مُصحفِ قرار
کیسی شفا ہے دیکھیے' مرہمِ صبر و شکر میں

سر بسُجُود کیا ہُوا' اپنے سے بھی سِوا ہُوا
آ گیا جو بھی سایۂ پرچمِ صبر و شکر میں

ایک جہاں کی آرزو' اس سے ہے محوِ گفتگو
کیا کیا وقارِ عصر ہے' آدمِ صبر و شکر میں

وسعتیں صبر و شکر کی کیسے بتائیں یاد ہم
عالَمِ صد ثبات ہے اِک دمِ صبر و شکر میں

ذِکرِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

دِلَش نالد! چَرا نالد؟ نَداند
نِگاہے یا رسول اللہ! نِگاہے

— اقبالؒ

• مسلمانوں کا دل رو رہا ہے، کیوں رو رہا ہے؟ معلوم نہیں۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم پہ نگاہِ کرم فرمائیے

انسانِ کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نسرین کوثر

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اس اشرافیہ میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کاملیّت کا وہ درجہ بخشا کہ کوئی انسان آج تک اس درجے کو نہیں پہنچا' نہ پہنچے گا۔ آپ کی ذاتِ گرامی ہر اعتبار سے مکمل اور ہر پہلو سے بے مثال ہے۔ آپؐ کی زندگی کو جس پہلو سے بھی دیکھیں' درجۂ کمال کی انتہا ہے۔ تاریخ کے کسی دور میں بھی کوئی ایسا انسان نظر نہیں آتا جو آپؐ کی طرح مجموعۂ کمالات ہو۔ آپؐ کے ظہور سے پہلے بھی اولیاء' صلحا' حکماء اور انبیاء نے روحانیت' حکمت' نیکی اور اچھے اخلاق کی باتیں کہیں' لیکن ایمان' اخلاق' شجاعت' حق پرستی' حکمت' انصاف' سچائی' تدبّر' صبر و تحمل' بُردباری اور ایثار کی جو جامعیّت اور کاملیّت آپؐ کی ذاتِ گرامی کو حاصل ہوئی' وہ اور کہیں نظر نہیں آتی۔

چونکہ آپؐ خاتم الانبیاء ہیں اور آپؐ کا لایا ہُوا پیغام اللہ کا آخری پیغام ہے' جو قیامت تک آنے والے تمام زمانوں کے لئے ہے' اس لئے جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے اور انسان کے مادی ترقی کی بلندیوں پر پہنچنے کے باوجود جس طرح حرص' لالچ' غرور' نسلی تفاخر اور بے انصافی کے سبب بے سکونی کا دور دورہ ہے' امن اور انصاف کے متلاشی اور سوچنے سمجھنے والے ذہنوں پر آپؐ کی تعلیمات کی اہمیت واضح تر ہوتی چلی جارہی ہیں۔ انہیں یقین ہوتا جارہا ہے کہ انہی تعلیمات میں انسان کی فلاح کا راز مضمر ہے۔

خالقِ کائنات نے آپؐ کو جو مقامِ اُولیٰ عطا فرمایا' اس کی شہادت خود قرآنِ حکیم دیتا ہے: ''بلاشبہ آپ عظیم اخلاق کے حامل ہیں۔'' (سورۃ القلم۔ آیت: 40) پھر ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اے لوگو! تمہارے لئے رسول کی ذات عمدہ نمونہ ہے۔'' (سورۃ الاحزاب۔ آیت: 61) صرف یہی نہیں' آپؐ کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔ فرمایا: ''رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔'' (سورۃ النساء۔ آیت: 80) اس ارشادِ ربانی کی موجودگی میں اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ انسانوں میں کوئی آپؐ کے مقام کو نہیں پہنچا' اور آپؐ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ایسے رہنما ہیں کہ تمام جہانوں میں آپؐ کا نہ کوئی ثانی ہے' نہ ہوگا۔ آپؐ کے بعد رسالت و نبوت کے دروازے بند ہوگئے اور دین کے تمام لوازم کی تکمیل ہوگئی جو قیامت تک نوعِ انسانی کی رہنمائی کرسکتے ہیں۔

حضور پاکؐ کی ذاتِ گرامی کے بارے میں اُوپر جو کچھ بیان ہوا ہے' اس کی صداقت پر یقین ہر مسلمان کا جزوِ ایمان ہے۔ آپؐ کو رب العالمین نے جن اوصافِ حمیدہ سے نوازا' ان کا جائزہ کوئی غیر متعصب غیر مسلم بھی لے تو یہ تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپؐ ہر اعتبار سے انسانِ کامل ہیں اور آج تک کسی دور اور کسی زمانے میں' کسی قوم کے اندر کوئی ایسا رہنما پیدا نہیں ہُوا جس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہوں جو آپؐ میں تھیں۔ انسانی روابط کے اعتبار سے آپؐ کی زندگی کا جس طور سے بھی جائزہ لیا جائے' آپؐ ایثار' انصاف اور سچائی کے بلند ترین مقام پر نظر آتے ہیں۔ آپؐ ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ خوش اخلاقی اور مروّت سے پیش آتے۔ حلم اور عفو کا یہ عالم تھا کہ جب جنگِ اُحد میں آپ کا دانت مبارک شہید ہوگیا تھا'

تو صحابہ کرامؓ اس صورتِ حال پر بہت مضطرب ہوئے اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ! ان کافروں کے حق میں بد دعا فرمایئے۔'' آپؐ کا جواب تھا کہ میں بد دعا کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی مخلوق کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ پھر ان کافروں کے حق میں یہ دعا زبان پر جاری ہوئی: ''اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے، وہ جانتے نہیں ہیں۔'' شفقت، مہربانی، تحمل، بردباری اور انسانی ہمدری کی اس سے بڑی مثال بھلا کیا ہو سکتی ہے!

آپؐ کے جُود وسخا کے بارے میں حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ آپؐ نے سوال کے جواب میں کبھی ''لا'' (نہیں) نہ فرمایا۔ ایک دفعہ آپؐ کے پاس نوّے ہزار درہم آئے۔ آپؐ نے بانٹنے شروع کئے، جو سامنے آیا، اسے دیتے گئے۔ یہاں تک کہ سب اُسی وقت بانٹ دیئے۔

آپؐ کی شجاعت اور بہادری بھی بے مثال تھی۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب لڑائی کا معرکہ ہوتا، تو آپؐ سب سے آگے ہوتے۔ ایک رات مدینہ والوں کو کچھ خوف پیدا ہُوا اور لوگ گھبرا کر گھروں سے نکل آئے کہ دیکھیں کیا ہے۔ وہاں دیکھتے ہیں کہ آپؐ سب سے پہلے اس مقام پر موجود تھے جہاں خطرے کا امکان تھا۔ آپؐ ابوطلحہؓ کے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار تھے اور تلوار کندھے پر لٹک رہی تھی۔ آپؐ یہ فرما کر لوگوں کو تسلی دینے لگے: ''مت گھبراؤ، مت گھبراؤ''۔

آپؐ حد درجہ صاحبِ مروّت تھے۔ اگر کوئی شخص غلط کام کرتا اور آپؐ کو معلوم ہوتا تو نصیحت فرماتے وقت اس کا نام نہ لیتے بلکہ یوں فرماتے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو ایسا کام کرتے ہیں۔ آپؐ کے پاس بیٹھنے والا ہر شخص یہ خیال کرتا کہ آپؐ کی سب سے زیادہ توجہ اور نگاہِ عنایت اسی پر ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں آٹھ برس کی عمر تک آپؐ کی خدمت کرتا رہا۔ کبھی آپؐ نے ''ہوں'' نہیں کیا۔ اگر نماز کے دوران آپؐ کسی بچے کی رونے کی آواز سن لیتے تو نماز جلد ختم فرما دیتے تا کہ اس بچے کی تسکین و تشفی کر سکیں۔ بلّی پیاسی آتی تو آپؐ پانی کا برتن اس کی طرف جھکا دیتے اور جب تک وہ خوب پانی پی نہ لیتی، آپؐ برتن جھکائے رکھتے۔

پہلی مملکتِ اسلامیہ، جس کی حدیں آپ کی زندگی میں ہی بہت وسیع ہو گئی تھیں، کے سربراہ ہونے کے باوجود غریب ترین لوگوں میں سے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ نے دو دن برابر جو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ایک مہینہ چولہے میں آگ نہ جلتی اور معہ اہل وعیال صرف سُوکھی کھجوروں پر قناعت فرماتے۔ آپؐ اپنا جوتا اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیتے، اپنی بکریوں کا دودھ خود دوہ لیتے، پھٹے پرانے کپڑے سی لیتے، اپنا اکثر کام اپنے ہاتھ سے کر لیا کرتے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ اپنا کام خود کرنا چاہئے، کسی دوسرے کا اتنا محتاج بھی نہ رہو کہ مسواک کے ٹکڑے کے مطابق کسی سے مدد مانگو۔

تواضع وانکسار کا یہ عالَم تھا کہ مجلس میں جہاں جگہ مل جاتی، بیٹھ جاتے۔ اپنا زانو اہلِ محفل کے زانو سے آگے نہ بڑھاتے۔ اگر صحابہ کرامؓ آپؐ کی تعظیم کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے تو آپؐ منع فرما دیتے۔ کوئی مسکین بیمار ہو جاتا تو اس کی عیادت کو تشریف لے جاتے۔ اگر کوئی خادم بھی دعوت کرتا تو قبول فرما لیتے۔

آپؐ امین ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ قرآنِ پاک میں خود آپؐ کی امانت کی مدح فرماتا ہے۔ اس بات کے حق کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ کفارِ مکہ اگرچہ آپؐ کے بدترین دشمن تھے، لیکن آپؐ کے بارے میں اُن سے کوئی پوچھتا تو وہ جواب دیتے: ''چاہے کچھ ہو، محمد سچے اور امین تو ضرور ہیں۔'' کفار اپنی امانتیں آپؐ کے پاس رکھواتے۔

دس ہجری میں آپؐ کی زندگی کا آخری حج تھا۔ اس موقع پر عرفات کے میدان

میں آپؐ کا تاریخی خطبہ انسان کے بنیادی حقوق کا اہم ترین منشور ہے۔ اس منشور میں آپؐ نے رنگ و نسل کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان فرق کو باطل قرار دیا اور واضح الفاظ میں فرمایا کہ سب کا رب اللہ تعالیٰ ہے۔ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی برتری حاصل نہیں، مگر تقویٰ کے سبب۔ سب انسان آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے۔ سب مسلمان آپس میں بھائی ہیں۔ آقا اور غلام کا فرق مٹانے کے لئے ارشاد فرمایا کہ جو خود کھاؤ، وہی خادموں کو کھلاؤ اور جو خود پہنو، خادموں کو ویسا ہی پہناؤ اور عورتوں کے معاملات میں اللہ سے ڈرو۔ فرمایا: ''تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔''

رسولِ کریمؐ حضرت زید بن حارثہؓ کو ساتھ لئے پیدل طائف پہنچے، وہاں کے باشندوں کو اسلام کی دعوت دی۔ وہاں کے سرداروں نے اپنے اپنے علاقوں کے آوارہ لڑکوں کو کہہ دیا کہ وہ وعظ کے وقت نبیِ کریمؐ پر پتھر پھینکیں۔ حضورِ اکرمؐ لہو میں تر بہ تر ہو گئے، خون بہہ بہہ کر جوتوں میں جم گیا اور ایک دفعہ بدمعاشوں اور اوباشوں نے اتنی بدتمیزی کی کہ حضورؐ ایک احاطے میں جانے پر مجبور ہو گئے۔ اتنی چوٹیں آئیں کہ آپؐ بے ہوش ہو کر زمین پر آ رہے۔ حضرت زیدؓ نے اپنی پیٹھ پر اُٹھایا، آبادی سے باہر لے گئے۔ پانی کے چھینٹے دینے سے ہوش آیا۔ نبی اکرمؐ طائف سے واپس آئے تو کسی نے کہا کہ ان لوگوں کے لئے بددعا کیجئے۔ آپؐ نے فرمایا: ''مَیں ان لوگوں کی تباہی کے لئے کیوں دعا کروں؟ اگر یہ لوگ اللہ پر ایمان نہیں لاتے تو کیا ہُوا۔ اُمید ہے کہ ان کی آئندہ نسلیں ضرور اللہ واحد پر ایمان لانے والی ہوں گی۔''

انصاف کے معاملے میں اپنے پرائے سب آپؐ کی نظر میں برابر تھے۔ خاص طور پر غریبوں سے آپؐ کو محبت تھی اور ان کی مدد میں خاص اہتمام فرماتے تھے۔ رات اور دن، گھر اور باہر کا آپؐ کا لباس ایک ہی ہوتا۔ زمین پر بے تکلف بیٹھ جاتے تھے۔ کبھی کسی سے تُرش روئی سے پیش نہ آتے۔ سب کے ساتھ کشادہ دلی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ آپؐ کا رعب و جلال ایسا تھا کہ جو سامنے آتا مرعوب ہو جاتا،

سلام

مصطفیٰؐ جانِ رحمت پہ لاکھوں سَلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سَلام

فتحِ بابِ نُبوّت پہ بے حَد دُرُود
ختمِ دَورِ رسالت پہ لاکھوں سَلام

شہریارِ اِرم تاجدارِ حَرم
نو بہارِ شفاعت پہ لاکھوں سلام

جِس طرف اُٹھ گئی دَم میں دَم آ گیا
اُس نگاہِ عنایت پہ لاکھوں سَلام

جس کی تسکیں سے روتے ہوئے ہنس پڑیں
اُس تبسّم کی عادت پہ لاکھوں سَلام

کُل جَہاں مِلک اور جَو کی روٹی غذا
اُس شکم کی قناعت پہ لاکھوں سَلام

جِس سُہانی گھڑی چمکا طیبہ کا چاند
اُس دِل افروز ساعت پہ لاکھوں سَلام

جاں نثارانِؓ بدر و اُحد پر دُرُود
حق گزارانِ بیعت پہ لاکھوں سلام

مُجھ سے خدمت کہ قُدسی کہیں ہاں! رضا
مصطفیٰؐ جانِ رحمت پہ لاکھوں سَلام

—— شاہ احمد رضا خانؒ

لیکن جو قریب آ کر بیٹھتا اور آپؐ کے کلامِ معجز نظام سے فیض یاب ہوتا' وہ آپؐ کی محبت دل میں لے کر جاتا۔

حضور پاکؐ مریضوں کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔ مریض کے پاس ٹھہرتے' اس کو تسلی دیتے اور علاج کی طرف توجہ دلاتے۔ عورتوں' بچوں اور بوڑھوں کا خاص طور پر لحاظ فرماتے تھے۔ بچوں سے شفقت اور پیار کرتے۔ عورتوں کی امداد و اعانت کرتے اور بوڑھوں کی تعظیم اور مدد فرماتے۔ آپؐ کا ارشاد ہے ''جو ہمارے بچوں پر رحم نہ کرے اور بڑوں کی عزت نہ کرے وہ ہمارے زُمرے میں نہیں ہے''۔ مصافحہ کے لیے پہلے خود ہاتھ بڑھاتے۔ صحابہؓ کو ان کے ناموں سے نہ پکارتے' بلکہ عرب کے قائدے کے مطابق ان کی کنّیت پکار کر بلاتے۔ یہ سب اس لیے تھا کہ دوسروں میں عزت اور خودداری کا جذبہ پیدا ہو۔ گفتگو میں آپؐ دوسروں کی بات کبھی نہ کاٹتے۔ جب تک وہ کہتا رہتا' متوجہ رہتے۔ بزرگوں اور فاضلوں کی عزت فرماتے۔ مثلاً حضرت حسان بن ثابتؓ کے لیے مسجدِ نبوی میں منبر رکھوا دیتے' جس پر بیٹھ کر وہ حمد و نعت سناتے۔ اسی طرح ایک دن آپؐ صحابہؓ کے مجمع میں تشریف فرما تھے کہ حضرت سعد بن معاذؓ تشریف لائے۔ آپؐ نے انصار سے فرمایا ''اُٹھ کر اپنے سردار کی پیشوائی کرو''۔

مزاجِ مبارک میں حد درجہ نفاست اور لطافت رچی ہوئی تھی۔ کسی کو میلا کچیلا دیکھتے تو ناپسند فرماتے۔ خوشبو پسند تھی' اور خود بھی اکثر استعمال فرمایا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ کلام فرماتے کہ سننے والوں کو فوراً ہی آپؐ کے فرمودات یاد ہو جاتے تھے۔ کبھی بے ضرورت گفتگو نہ فرماتے۔ بہت کم ہنستے تھے۔ کسی نے آپؐ کو کبھی قہقہہ مار کر ہنستے نہیں دیکھا۔ اچھی باتوں پر صرف تبسّم فرماتے۔ آپؐ کا پسینہ خوشبودار ہوتا تھا اور جسم مبارک سے ایسی خوشبو مہکتی تھی جیسے مشک' مگر خوش گوار اور دھیمی۔

آپؐ کی عفت و عصمت کا یہ عالم تھا کہ بچپن سے جاہلیت کی کسی بیہودہ رسم اور کھیل کود میں آپؐ نے کبھی حصہ نہیں لیا تھا۔ عالم آشکار ہے یہ بات کہ بعثت سے قبل بھی آپ امانت و دیانت میں اتنے نیک نام تھے کہ سارا عرب آپ کو صادق اور امین کے لقب سے پکارتا تھا۔ آپؐ پر عوام کو اس قدر اعتماد تھا کہ نبوّت کے بعد جب قریش آپؐ کے بدترین مخالف اور دشمن بن گئے تھے' سب لوگ اپنی امانتیں آپؐ کی تحویل میں رکھتے تھے۔

زہد کی یہ کیفیت تھی کہ جس رات آپؐ نے رحلت فرمائی ہے' اس شب اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے پڑوسن سے تیل قرض لے کر چراغ جلایا تھا۔

حضورِ پاکؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایمان میں اس وقت تک پختہ نہیں ہوتا' جب تک کہ میری محبت اس کے دل میں اس کے باپ' بیٹے اور تمام انسانوں سے بڑھ کر راسخ نہ ہو جائے (مسلم بخاری) عشق و محبت کا یہ مرتبہ ایمان کا خاصہ اور لازمہ ہے۔ رسول کریمؐ کی تعلیمات کی پیروی کے بغیر محبت رسولؐ تصور میں نہیں آ سکتی۔ حضور پاکؐ کے نقشِ قدم پر چلنا محبت رسولؐ کے لیے لازم ہے۔ آپؐ عمدہ اخلاق سے متصف تھے۔ مردِ مومن کو بھی اپنے اندر اخلاقِ پسندیدہ پیدا کرنے چاہیں۔ جو کوئی مقامِ نبویؐ سے دُور رہے اور اسوۂ حسنۂ رسولؐ کی پیروی نہ کرے' وہ اسلامی معاشرے سے خارج ہو جاتا ہے۔

دنیا میں اس وقت جتنی بدامنی' پریشانی اور انسان سے انسان کی دشمنی کے سبب بے اطمینانی اور دکھ موجود ہے' نسل پرستی' قومی عصبیتیں اور سب انسانوں کے حقوق کو برابر تسلیم نہ کرنا اس کی وجہ ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رنگ و نسل کے فرق کو مٹا کر جس طرح دُنیا کو انصاف اور احترامِ آدمیت کی بنیاد پر انسانی حقوق کی حفاظت کا سبق پڑھایا' اسی کی روشنی میں سارے قیامت تک آنے والے انسانوں کی فلاح و اصلاح ہو سکتی ہے۔

آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دیدار

سرکارِ دو عالَم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت پر صحابہ کرامؓ پر قیامت قائم ہوگئی۔ان میں حضرت بلالؓ سرِ فہرست تھے۔وہ مدینے کی گلیوں میں دیوانہ وار پھرتے اورلوگوں سے پوچھتے: بھائیو!تم نے کہیں رسول اللہ کو دیکھا ہے؟بھائیو! مجھے بھی آقا کا دیدار کرا دو۔ بھائیو! میرے آقا کہاں چلے گئے؟ بھائیو! مجھے سرکارِ دو عالَم کا پتہ دو۔ حضرت بلالؓ جدائی کی تاب نہ لاکر آ کر کار مدینہ سے ہجرت کر کے ملکِ شام کے شہر حلب چلے گئے۔

تقریباً ایک سال بعد حضرت بلالؓ کو خواب میں حضورِ اکرمؐ کا دیدار نصیب ہُوا۔آپؐ فرما رہے تھے: بلال !تم نے ہم سے ملنا کیوں چھوڑ دیا' کیا تمہارا دل ہم سے ملنے کو نہیں چاہتا؟

حضرت بلالؓ کی آنکھ کھُل گئی۔ اضطراب بڑھ گیا۔ ''لبیک یا سَیّدی''(آقا مَیں حاضر ہُوں) کہتے ہوئے اُٹھے اور اونٹنی پر سوار ہو کر مدینہ کی طرف چل نکلے۔رات دن برابر سفر کرتے ہوئے آخر مدینہ کی نورانی اور پُر کیف فضاؤں میں داخل ہوگئے۔مدینہ میں داخل ہوتے ہی دل کی دنیا زیر و زبر ہوگئی۔سیدھے مسجدِ نبوی میں پہنچے اور اپنے آقاؐ کو تلاش کرتے ہوئے کہتے جاتے: ''آقا! غلام حاضر ہے۔آپ کہاں ہیں آقا' مَیں حاضر ہُوں آقا!''

آقاؐ نظر نہ آئے' تو حجروں میں جا کر تلاش کیا۔وہاں بھی نہ ملے تو بے قرار ہو کر مزارِ پُر انوار پر حاضر ہوئے اور روتے ہوئے عرض کیا: ''یارسول اللہ! حلب سے غلام کو بلایا اور خود پردہ فرما گئے۔زیارت بھی نہ کرائی!''

روتے روتے بے ہوش کر قبرِ انور کے قریب گر گئے۔

اس دوران اہلِ مدینہ کو حضرت بلالؓ کی مدینہ میں آمد کی اطلاع ہوگئی۔ ہر طرف غُل تھا کہ بلالؓ مسجدِ نبوی میں موجود ہیں۔جب حضرت بلالؓ کو ہوش آیا تو دیکھا کہ ہر طرف لوگوں کا ہجوم ہے'لوگ التجا کر رہے ہیں کہ اے بلال ایک بار وہ اذان سنا دیجئے جو ہمارے اور اپنے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سناتے تھے۔

بلالؓ ہاتھ جوڑ جوڑ کر سب سے معذرت طلب کر رہے ہیں: بھائیو! یہ میری طاقت سے باہر ہے' کیونکہ مَیں جب آقاؐ کی موجودگی میں اذان کہا کرتا تھا' اور جس وقت اشہد ان محمد الرسول اللہ کہتا تھا تو آنکھوں سے پیارے آقاؐ کا دیدار کر لیا کرتا تھا۔اب تو آقاؐ پردہ فرما چکے' بتاؤ کہ اب اذان میں اُنؐ کا دیدار کیوں کر ہوگا؟ مجھے اس خدمت سے معاف کر دو' مجھ میں برداشت کی قوت نہیں۔

لوگوں نے بے حد اصرار کیا' مگر حضرت بلالؓ نے انکار کیا۔

بعض صحابہ کرامؓ نے رائے دی کہ کسی صورت حضرت امام حَسن اور حضرت امام حُسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو بلا لاؤ' اگر وہ بلالؓ سے فرمائش کریں گے تو بلالؓ ضرور مان جائیں گے کیونکہ حضور پاکؐ کے اہلِ بیتؓ سے بلالؓ کو بے حد محبت ہے۔

ایک صحابیؓ حضرت حَسن و حُسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو ساتھ لے آئے۔

آتے ہی حضرت امام حسینؓ نے حضرت بلالؓ کا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا: بلالؓ آج ہمیں وہی اذان سنا دیں جو نانا جان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سنایا کرتے تھے۔ حضرت بلالؓ نے حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کو گود میں اُٹھا لیا اور کہا: ''آپ میرے پیارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلیجے کے ٹکڑے ہیں۔ مصطفیٰؐ کے باغ کے پھول ہیں' اگر میں نے انکار کر دیا اور کہیں تم رُوٹھ گئے تو میرے آقاؐ بھی رنجیدہ ہو جائیں گے۔''

حضرت بلالؓ نے اذان شروع کر دی۔

مدینہ کی فضاؤں میں جب اذانِ بلالؓ کی پُر سوز آواز گونجی' تو اہلِ مدینہ کے دل ہِل گئے۔ ایک سال کے بعد بلالؓ کی اذان سُن کر لوگوں کی نگاہوں کے سامنے سرکارِ دوعالمؐ کی زندگی کا سماں بندھ گیا۔ ہر شخص گھر سے باہر آ گیا۔ عورتیں' بچے' بوڑھے سبھی ''بلال آ گئے' بلال آ گئے'' کہتے' روتے دھوتے مسجدِ نبوی کی طرف دوڑ پڑے۔ لوگ غمِ مصطفیٰؐ سے نڈھال ہو رہے تھے۔ جس وقت سبھی زار و قطار رو رہے تھے' تو ننھے منے بچے اپنی ماؤں سے لپٹ کر پوچھ رہے تھے کہ امی' امی! رسول اللہؐ کے موذن بلالؓ تو آ گئے' رسول اللہؐ کب مدینے تشریف لائیں گے؟

اس پر مائیں اور دیگر سننے والے دھاڑیں مار کر رونے لگتے۔

حضرت بلالؓ نے جب اشہد ان محمد الرسول اللہ کہا تو حسبِ معمول نظر منبرِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اٹھی۔ خلافِ معمول منبر خالی تھا' آقاؐ کا دیدار نہ ہو سکا۔ حضرت بلالؓ ہجرِ رسولِ کریمؐ کی وجہ سے بے حال ہو گئے' غمِ مصطفیٰؐ کی تاب نہ لا سکے' بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

بہت دیر کے بعد ہوش آیا تو بڑی مشکل سے اُٹھے اور اہلِ مدینہ کو روتا چھوڑ کر' خود زار و قطار روتے' اونٹنی کو برق رفتاری سے دوڑاتے ملکِ شام کی طرف روانہ ہو گئے!

[استفادہ: فیضانِ سنت از مولانا محمد الیاس قادری]

اقبالؒ بحضور بلالؓ

چمک اُٹھا جو ستارہ ترے مُقدّر کا
حَبَش سے تجھ کو اُٹھا کر حجاز میں لایا
ہُوئی اسی سے ترے غمکدے کی آبادی
تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی
وہ آستاں نہ چُھٹا تجھ سے ایک دم کے لیے
کسیؐ کے شوق میں تُو نے مزے ستم کے لیے
جفا جو عشق میں ہوتی ہے' وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں
نظر تھی صورتِ سلماںؓ اداشناس تری
شرابِ دِید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری
تجھے نظارے کا مثلِ کلیمؑ سَودا تھا
اویسؓ طاقتِ دیدار کو ترستا تھا
مدینہ تیری نگاہوں کا نُور تھا گویا
ترے لیے تو یہ صحرا ہی طُور تھا گویا
تری نظر کو رہی دِید میں بھی حسرتِ دِید
خنک دلے کہ تپید و دمے نیا سائید
گِری وہ برق تری جانِ ناشکیبا پر
کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسیٰؑ پر
تپش ز شعلہ گرفتند و بر دلِ تو زدند
چہ برقِ جلوہ بخاشاک حاصلِ تو زدند!
ادائے دِید سراپا نیاز تھی تیری
کسیؐ کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی
نماز اُسؐ کے نظارے کا اِک بہانہ بنی
خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اُسؐ کا
خوشا وہ دَور کہ دیدارِعام تھا اُسؐ کا

راہِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حریم اکرام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی دُعا میں اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے تھے کہ اے اللہ تو نے اپنے کرم سے میرے جسم کی ظاہری بناوٹ اچھی بنائی' اسی طرح میرے اخلاق بھی اچھے کر دے۔ (حضرت عائشہ صدیقہؓ: احمد)

نیک کام کا اجراء: جو شخص اسلام میں اچھا طریقہ نکالتا ہے' اس کو اس کا ثواب اور اس کے بعد جو اس طریقہ پر عمل کریں گے ان سب کا ثواب ملے گا اور عمل کرنے والوں کا ثواب بھی کم نہیں کیا جاتا۔ جو شخص اسلام میں کسی بُرے طریقہ کی بنیاد ڈالتا ہے' اس کی گردن پر اس کا گناہ اور اُن تمام لوگوں کا گناہ ہوتا ہے جو اس کے بعد اس طریقہ پر عمل کریں گے اور عمل کرنے والوں کے ذمہ جو گناہ ہیں' ان میں بھی کچھ کمی نہیں آتی۔ (حضرت ابی جحیفہؓ: ابن ماجہ)

احسان: تم دوسروں کی دیکھا دیکھی کام کرنے والے مت بنو اور نہ یہ کہنے والے بنو کہ اگر دوسرے لوگ ظلم کا روّیہ اختیار کریں گے تو ہم بھی ویسا ہی کریں گے' بلکہ اپنے دلوں کو اس پر پکا کرو کہ اگر اور لوگ احسان کریں تب بھی تم احسان کرو گے اور اگر وہ بُرا سلوک کریں تب بھی تم ظلم اور بُرائی کا روّیہ اختیار نہ کرو گے' بلکہ احسان ہی کرو گے۔ (حضرت حذیفہؓ: ترمذی)

بے لوث خدمت: جو بندہ کسی بے سہارا عورت' کسی مسکین اور حاجت مند آدمی کے کاموں میں بے لوث دوڑ دھوپ کرتا ہو' وہ اجر و ثواب میں اس مجاہد کی طرح ہے جو اللہ کی راہ میں لڑتا ہے۔ (حضرت ابوہریرہؓ: مسلم)

توکل اور رضا بالقضا: آدمی کی نیک بختی اور خوش نصیبی میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے جو فیصلہ ہو' وہ اس پر راضی رہے اور آدمی کی بدبختی اور بدنصیبی میں سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے خیر اور بھلائی کا طالب نہ ہو اور اس کی بدنصیبی اور بدبختی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بارے میں اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے ناخوش ہو۔ (حضرت سعدؓ: مسند احمد)

وقار: اچھی سیرت اور اطمینان و وقار سے اپنے کام انجام دینے کی عادت اور میانہ روی ایک حصّہ ہے نبوت کے چوبیس حصوں میں سے۔ (حضرت عبداللہ بن سرجسؓ: جامع ترمذی)

انصاف: میری اُمّت اسی وقت تک سرسبز رہے گی جب تک کہ یہ تین خصلتیں اس میں باقی رہیں گی: ایک یہ کہ جب وہ بات کریں تو سچ بولیں۔ دوسرے یہ کہ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کریں تو انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تیسرے یہ کہ جب ان سے رحم کی درخواست کی جائے' تو وہ کمزوروں پر رحم کریں۔ (متفق علیہ۔ ابویعلی)

جذبات پر قابو: جس آدمی میں یہ تین باتیں نہ ہوں' اس کا کوئی عمل کام نہ آئے گا۔ ایک یہ کہ وہ اپنے جذباتِ نفسانی کی باگ ڈھیلی نہ ہونے دے۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی نادان آدمی اس پر حملہ کرے تو وہ تحمل سے خاموش ہو جائے' تیسرے یہ کہ لوگوں کے درمیان حُسنِ اخلاق کے ساتھ زندگی بسر کرے۔ (حضرت ابوہریرہ: طبرانی)

امانت: جب کوئی شخص کسی سے کوئی بات کہے (یعنی ایسی بات جس کا چھپانا وہ پسند کرتا ہو) اور پھر وہ چلا جائے تو وہ امانت ہے (یعنی سننے والے کے لیے امانت کے مانند ہے) اور اس بات کی حفاظت امانت کی

طرح کرنا چاہیے۔(حضرت جابرؓ: ترمذی)

عمر کا لحاظ: جو اپنے چھوٹوں پر رحم نہ کھائے' بڑوں کی تعظیم نہ کرے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کرے' ہم میں سے نہیں (حضرت ابوہریرہؓ: مسلم)

شرم وحیا: حضورِ اکرمؐ نے ارشاد فرمایا جب اللہ کسی بندے کو ہلاک کرنا چاہتا ہے تو اس سے حیا چھین لیتا ہے۔ جب اس میں شرم نہیں رہتی تو وہ لوگوں کی نظروں میں حقیر و ناپسندیدہ بن جاتا ہے۔ جب اس کی حالت اس نوبت کو پہنچ جاتی ہے تو پھر اس سے امانت کی صفت بھی چھین لی جاتی ہے۔ جب اس میں امانت داری نہیں رہتی تو وہ خیانت در خیانت میں مبتلا ہونے لگتا ہے' اس سے صفتِ رحمت اُٹھا لی جاتی ہے۔ پھر وہ پھٹکارا مارا مارا پھرنے لگتا ہے۔ جب تم اس کو اس طرح مارا مارا پھرتا دیکھو تو وہ وقت قریب آجاتا ہے کہ اب اس سے رشتۂ اسلام ہی چھین لیا جاتا ہے۔(حضرت عائشہ صدیقہؓ: ابن ماجہ)

نرم مزاجی: میں تم کو ایسے شخص کی خبر نہ دوں جو دوزخ کے لیے حرام ہے اور دوزخ کی آگ اس پر حرام ہے۔ سنو سنو! دوزخ کی آگ حرام ہے ہر ایسے شخص پر جو مزاج کا تیز نہ ہو' نرم ہو' لوگوں سے قریب ہونے والا ہو' نرمی سے بات کرنے والا ہو۔(حضرت عبداللہ بن مسعودؓ: ترمذی)

وعدہ خلافی: جب کسی آدمی نے اپنے کسی بھائی سے آنے کا وعدہ کیا اور اس کی نیت بھی تھی کہ وہ وعدہ پورا کرے گا' لیکن (کسی وجہ سے) وہ وقتِ مقررہ پر آیا نہیں تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔(حضرت زیدؓ بن ارقم: سنن ابی داؤد)

رحمِ الٰہی سے محرومی: تین آدمی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ قیامت میں کوئی کلام نہیں کرے گا اور ان کا دل صاف نہیں کرے گا۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ ان کی طرف نگاہ بھی نہیں کرے گا اور ان کے لیے آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ ایک بوڑھا بدکار' دوسرا جھوٹا حاکم' تیسرا نادار اور غریب متکبّر جو تنگ دستی اور مجبوری کے باوجود تکبّر اختیار کرے اور خود کو بڑا ظاہر کرے۔(حضرت ابوہریرہؓ: مسلم)

ادائے شکر: جس نعمت کے اوّل میں بسم اللہ اور آخر میں الحمدللہ پڑھا گیا ہو' اس نعمت سے قیامت میں سوال نہیں ہوگا۔(حضرت عبداللہ ابن عباسؓ: مسلم)

صبر: جب کسی بندے کا بچہ مرجاتا ہے' اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتا ہے تم نے میرے بندے کے بچے کی جان لے لی۔ وہ کہتے ہیں جی۔ پھر فرماتا ہے میرے بندے نے کیا کہا؟ وہ جواب دیتے ہیں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی اور انا للہ وانا الیہ راجعون کہا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے اس بندے کے لیے جنت میں ایک گھر بناؤ' اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔(حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ: احمد)

نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا جو شخص صبر کرنے کی کوشش کرے گا' اللہ تعالیٰ اس کو صبر بخشے گا اور صبر سے زیادہ بہتر اور بہت سی بھلائیوں کو سمیٹنے والی بخشش اور کوئی نہیں۔(حضرت عبداللہ بن عمرؓ: بخاری ومسلم)

چار چیزیں ایسی ہیں کہ وہ جس شخص کو مل گئیں' اس کو دنیا و آخرت کی بھلائیاں مل گئیں: دل شکر کرنے والا اور زبان ذکر کرنے والی' اور بدن جو مشکل ومصیبت پر صابر ہو اور بیوی جو اپنی جان اور شوہر کے مال میں اس سے خیانت نہیں کرنا چاہتی۔(حضرت ابن عباسؓ: بیہقی)

شکر: تم میں سے کوئی ایسے شخص کو دیکھے جو مال و دولت اور جسمانی بناوٹ یعنی شکل وصورت میں اس سے بڑھا ہوا ہے (اور اس کی وجہ سے اس کے دل میں حرص وطمع اور شکایت پیدا ہو) تو اس کو چاہیے کہ کسی ایسے بندہ کو دیکھے جو اِن چیزوں میں اس سے بھی کمتر ہو (تاکہ بجائے حرص وطمع کے اور شکایت کے صبر اور شکر پیدا ہو)۔(حضرت ابوہریرہؓ: بخاری ومسلم)

جو بندہ کسی جانی یا مالی مصیبت میں مبتلا ہو اور وہ کسی سے اس کا اظہار نہ کرے اور نہ لوگوں سے شکوہ وشکایت کرے' تو اللہ تعالیٰ کا ذمہ ہے کہ وہ اس کو بخش دے۔(حضرت عائشہ صدیقہؓ: معارف الحدیث)

سخاوت وبخل: اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو ارشاد ہے کہ تم ضرورت مندوں

پرخرچ کرتے رہو؛میں تم پرخرچ کرتا رہوں گا۔(حضرت ابوہریرہؓ: بخاری ومسلم)

حرص وبخل اور ایمان کبھی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے (یعنی بخل، کنجوسی اور ایمان کا کوئی جوڑ نہیں)۔(حضرت ابوہریرہؓ: سنن نسائی)

قناعت واستغنا: انصار میں سے کچھ لوگوں نے رسول اللہؐ سے کچھ طلب کیا۔آپؐ نے ان کو عطا فرمایا (لیکن ان کی طلب ختم نہیں ہوئی) اور انہوں نے پھر طلب کیا۔آپؐ نے پھر ان کو عطا فرما دیا۔یہاں تک کو جو کچھ آپؐ کے پاس تھا، وہ سب ختم ہو گیا اور کچھ نہ رہا تو آپؐ نے انصاریوں سے فرمایا: سُنو! جو مال و دولت بھی میرے پاس ہوگا اور کہیں سے آئے گا، میں اس کو تم سے بچا کر نہیں رکھوں گا اور اپنے پاس ذخیرہ نہیں کروں گا، بلکہ تم کو دیتا رہوں گا لیکن یہ بات خوب سمجھ لو کہ اس طرح مانگ مانگ کر حاصل کرنے سے آسودگی اور خودعیشی حاصل نہیں ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جو کوئی دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچنا چاہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرماتا اور مانگنے کی ذلت سے اس کو بچانا چاہتا ہے اور جو کوئی بندوں کے سامنے اپنی مجبوری ظاہر کرنے سے بچنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بندوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔اور جو کوئی کسی کٹھن موقع پر اپنی طبیعت کو مضبوط کر کے صبر کرنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو صبر کی توفیق دے دیتا ہے اور کسی بندہ کو بھی صبر سے زیادہ وسیع کوئی نعمت عطا نہیں ہوتی۔(حضرت ابوسعید خدریؓ: مسلم)

کفایت شعاری: جو میانہ روی کی چال چلے (یعنی نہ کنجوسی کرے اور نہ فضول اُڑا دے) بلکہ سوچ سمجھ اور سنبھال کر، ہاتھ روک کر کفایت شعاری، انتظام اور اعتدال کے ساتھ ضرورت کے موقعوں پر مال صرف کرے تو اس طرح خرچ کرنا بھی آدھی کمائی ہے۔جو شخص (خرچ کرنے میں اس طرح) بیچ کی چال چلے، وہ محتاج نہیں ہوتا اور فضول اُڑانے میں زیادہ مال نہیں رہتا۔(حضرت انسؓ۔مسلم)

مولانا رومؒ گزرے تو میدان میں کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ان سب نے مولاناؒ کو سلام کیا۔آپؒ ایک ایک بچے کا سلام الگ الگ قبول کرنے کے لیے دیر تک کھڑے رہے۔ایک بچہ ذرا دُور کھیل رہا تھا، اُس نے وہیں سے پکار کر کہا: حضرت! ابھی جایئے نہیں، میرا سلام بھی لیتے جایئے۔مولاناؒ بچے کی خاطر دیر تک رکے رہے اور اس کا سلام لے کر روانہ ہوئے۔کسی نے پوچھا آپؒ نے بچے کے لیے اس قدر انتظار کیا؟ آپؒ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوتے، تو ایسا ہی کرتے۔''

—— سیرتِ رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: پروفیسر نور بخش توکلیؒ

معافی چاہنا: جس شخص کے ذمہ اپنے کسی مسلمان بھائی کا کوئی حق ہو (مثلاً غیبت کی ہو یا مال تلف کیا ہو) پس اس کو چاہیے کہ آج (دنیا میں) ان حق تلفیوں کی معافی مانگے۔روزِ قیامت اس کے پاس نہ دینار ہوگا، نہ درہم۔اس کے پاس نیک عمل ہوگا تو بقدر اس ظلم کے اس کا نیک عمل اس سے لے لیا جائے گا اور اس کے پاس نیکیاں نہ ہونگی تو اس کے مظلوم بھائی کی برائیاں لے کر اس کے اوپر لاد دی جائیں گی۔(حضرت ابوہریرہؓ: مشکوٰۃ)

خاموشی: جو درجہ خاموشی کی وجہ سے انسانوں کو ملتا ہے، وہ ساٹھ برس کی نفل عبادت سے بہتر ہے۔(حضرت عبداللہ بن عمرؓ: مشکوٰۃ)

ترکِ لایعنی: مسلمان کے حُسن و کمال میں یہ بھی ہے کہ جو بات اس کے لیے ضروری اور مفید نہ ہو، اُس کو چھوڑ دے۔(حضرت علیؓ: مشکوٰۃ)

صدقاتِ جاریہ: علم کی اشاعت کرنا، نیک اولاد چھوڑ جانا، مسافر خانہ یا مسجد بنانا، قرآن مجید ورثہ میں چھوڑ جانا، نہر جاری کرنا اور جیتے جی تندرستی کی حالت میں اپنے مال میں سے خیرات کرنا یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کا ثواب مرنے کے بعد مسلمان کو ملتا رہتا ہے۔(حضرت ابوہریرہؓ: ابن ماجہ)

غصہ: حضورِ اقدسؐ کا ارشاد ہے کہ مسلمانو اگر تم میں سے کسی کو غصہ آئے

تو اس کو لازم ہے کہ وہ خاموش ہو جائے۔ (حضرت ابن عباسؓ: بخاری)

غیبت: غیبت بدکاری سے زیادہ سخت اور سنگین ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! ایسا کیوں ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ آدمی اگر بدکاری کر لیتا ہے تو صرف توبہ کرنے سے اس کی معافی اور مغفرت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو سکتی ہے۔ مگر غیبت کرنے والے کو جب تک خود وہ شخص معاف نہ کر دے جس کی اس نے غیبت کی ہے اس کی معافی اور بخشش اللہ کی طرف سے نہیں ہوگی۔ (حضرت عائشہ صدیقہؓ: مسلم)

کیا تم جانتے ہو کہ غیبت کس کو کہتے ہیں؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسولؐ کو زیادہ معلوم ہے۔ آپؐ نے فرمایا تمہارا اپنے بھائی کی کسی ایسی برائی کا ذکر کرنا جو واقعۃً اس میں موجود ہو اور اگر اس میں وہ بُرائی اور عیب موجود ہی نہیں ہے (جو تم نے اس کی طرف منسوب کر کے ذکر کیا) تو پھر تو بہتان ہُوا اور یہ غیبت سے بھی زیادہ سخت اور سنگین ہے۔ (حضرت ابو ہریرہؓ: مسلم)

بدگمانی: بدگمانیوں سے بچو اس لیے کہ بدگمانی کے ساتھ جو بات کی جائے گی، وہ تباہ کُن ہوگی۔ (حضرت ابو ہریرہؓ: بخاری)

دورُخی: دنیا میں جو شخص دورُخا ہوگا اور منافقوں کی طرح مختلف لوگوں سے مختلف قسم کی باتیں کرے گا، قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔ (حضرت عمار بن یاسرؓ: معارف الحدیث)

خود بینی: خود بینی ایسی بُری بلا ہے کہ اس سے ستّر برس کے بہترین عمل برباد ہو جاتے ہیں۔ (حضرت ابو ہریرہؓ: بخاری)

بُرائی کی اشاعت: بے حیائی کی باتیں کرنے، ان کی اشاعت کرنے اور پھیلانے والا سب گناہ میں برابر ہیں۔ (حضرت علیؓ: مسلم)

ریاکاری: مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ خطرہ ''شرکِ اصغر'' کا ہے۔ بعض صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ شرکِ اصغر کا کیا مطلب ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ریا (یعنی کوئی نیک کام لوگوں کو دکھاوے کے لیے کرنا)۔ (حضرت محمود بن لبیدؓ: معارف الحدیث)

بُغض و کینہ: ہر ہفتہ میں دو دن سوموار اور جمعرات کو لوگوں کے اعمال پیش ہوتے ہیں تو ہر بندۂ مومن کی معافی کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ سوائے ان دو آدمیوں کے جو ایک دوسرے سے کینہ رکھتے ہوں، پس ان کے بارے میں حکم دے دیا جاتا ہے کہ دونوں کو چھوڑے رکھو (یعنی ان کی معافی نہ لکھو) جب تک کہ یہ آپس کے اس کینہ اور باہمی دشمنی سے باز نہ آئیں اور دلوں کو صاف نہ کر لیں۔ (حضرت ابو ہریرہؓ: مسلم)

خودکُشی: جس نے اپنی جان کو ہلاک کیا تو قیامت میں اس کو یہی عذاب دیا جائے گا کہ وہ اپنی جان کو ہلاک کرتا رہے گا۔ جس طرح سے دنیا میں اپنی جان کو ہلاک کیا ہے، اسی طرح دوزخ میں ہلاک کرتا رہے گا۔ جس نے اپنے آپ کو پہاڑ پر سے گرایا ہوگا، وہ پہاڑ پر سے گرایا جاتا رہے گا اور جس نے زہر پیا ہوگا، وہ زہر پلایا جاتا رہے گا اور جس نے اپنے آپ کو چُھری سے ذبح کیا ہوگا، وہ چُھری سے ذبح کیا جاتا رہے گا۔ (حضرت ابو ہریرہؓ: مسلم)

بدزبانی: قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے کم مرتبہ وہ شخص ہوگا جس کی فحش گوئی اور بدزبانی کے ڈر سے لوگ اس سے کتراتے ہوں یا جھوٹ موٹ عزت کرتے ہوں۔ (حضرت عائشہؓ: بخاری و مسلم)

بدنگاہی: کسی عورت پر اچانک نگاہ پڑ جائے تو نظر پھیر لو۔ دوسری نگاہ اس پر نہ ڈالو۔ پہلی نگاہ تو تمہاری ہے، مگر دوسری نگاہ تمہاری نگاہ نہیں ہے، بلکہ شیطان کی ہے۔ (حضرت بریدہؓ: حیٰوۃ المسلمین)

ظالم کی مدد: جو لوگ امراء کی حاشیہ نشینی اختیار کرتے ہیں اور ظالموں کی مدد کرتے ہیں، ان کا انجام سخت خراب ہوگا۔ نہ تو مسلمانوں میں ان کا شمار ہوگا اور نہ وہ میرے حوضِ کوثر پر آئیں گے۔ خواہ وہ کتنا ہی اسلام کا دعویٰ کریں۔ (حضرت عائشہ صدیقہؓ: مسلم)

ایسی محبت ــ اتنی محبت!

کوئی کہاں سے مثال لائے گا؟

کفارِ مکہ نے دھوکے سے دس صحابہ کرامؓ کو تبلیغِ دین کے لیے مدینہ منوّرہ سے بلوایا۔ راستے ہی میں آمادۂ فساد ہوئے۔ آٹھ صحابہؓ نے کفار سے لڑ کر جامِ شہادت نوش کیا۔ حضرت خبیبؓ بن عدی اور حضرت زیدؓ بن دثنہ گرفتار کر لیے گئے۔ مقتولینِ بدر کے بدلے میں قتل کرنے کے لیے کفار انہیں حدودِ حرم سے باہر لے آئے۔ جرمِ بے گناہی کی سزا کا ''تماشہ'' دیکھنے کے لئے کفار گروہ در گروہ قتل گاہ میں آن جمع ہوئے۔ ابوسفیان نے آگے بڑھ کر حضرت زیدؓ سے کہا: ''زید! بھوکے پیاسے قتل ہو رہے ہو، کیا اچھا نہ تھا کہ آج اپنے اہل وعیال میں آرام سے ہوتے اور ہم تمہارے بجائے محمد کو (نعوذ باللہ) ختم کر دیتے۔'' حضرت زیدؓ نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر توانا لہجے میں کہا: ''اے اللہ کے دشمن! قسم اللہ کی، ہم تو یہ بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کانٹا بھی چُبھے اور ہم بیٹھے رہیں''۔ ابوسفیان کھسیانا ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ حضرت زیدؓ تلواروں کے پے در پے وار کھا کر، کلمہ طیبہ پڑھتے پڑھتے اپنی جان اپنے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان کر گئے۔

حضرت زیدؓ کے بعد حضرت خبیبؓ قتل گاہ میں لائے گئے۔ انہوں نے دو رکعت نماز نفل پڑھنے کی اجازت چاہی۔ جلدی سے نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو کہا کہ مَیں نے نماز مختصر کر دی، کہیں تم یہ نہ سمجھو کہ موت کا وقت مؤخر کر رہا ہوں۔ انہیں سُولی پر لٹکا دیا گیا اور کفارِ مکہ نے چاروں طرف سے نیزے کی انیوں سے ان کے جسم کو چھیدنا شروع کر دیا۔ کسی نے شوخ انداز میں کہا: ''خبیب! کہو تو تمہیں چھوڑ دیا جائے اور محمد تمہاری جگہ لے لیں۔'' نیم جاں خبیبؓ نے بڑی ہمت سے بہ آوازِ بلند جواب دیا: ''اللہ کی قسم! مَیں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ میری جان کے بدلے میرے آقاؐ کو گرم ہوا تک لگے۔'' نیزوں کے وار تیز ہونے لگے، جسم کے ٹکڑے کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ خبیبؓ آخر دم تک اپنے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دُرود وسلام بھیجتے بھیجتے جنت الفردوس کو سدھارے۔

شربتِ دید نے اِک آگ لگائی دل میں
تپشِ دِل کو بڑھایا ہے، بجھانے نہ دیا
اب کہاں جائے گا نقشہ تیرا میرے دل سے
تہ میں رکھا ہے اُسے دل نے گُمانے نہ دیا

(غزواتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: بریگیڈیئر گلزار احمد)

غزوہ اُحد میں کفار نے افواہ پھیلا دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دُنیا میں نہیں رہے۔ یہ خبر مدینے پہنچی، تو بے شمار خواتین گھروں سے نکل کر میدانِ اُحد میں آ گئیں۔ قبیلہ بنو دینار کی خاتون ہندؓ بنتِ عمرو بن حرام بھی اسی جانب آ رہی تھیں۔ ان کے شوہر حضرت عمروؓ بن جموع، بیٹے حضرت خلادؓ بن عمرو اور بھائی حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن ہشام بھی معرکۂ اُحد میں شریک تھے۔

راستے میں کسی سے پوچھا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا حال ہے؟

اُنہوں نے کہا: تیرا شوہر شہید ہو گیا

وہ بولیں: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خبر دو

ایک بزرگ نے کہا: تیرا تو بھائی شہید ہو گیا

کہنے لگیں: لیکن میرے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیسے ہیں؟

جواب ملا: تمہارا بیٹا بھی شہید ہو گیا

پوچھا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس حال میں ہیں؟

اور پھر ''میرے آقا کیسے ہیں، میرے آقا کیسے ہیں'' پکارتی میدانِ اُحد کو دوڑتی گئیں۔ وہاں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی آنکھوں سے بخیر و عافیت دیکھا تو بے اختیار پُکار اُٹھیں:

کُل مصیبة بعدك جلل

(یارسول اللہ! آپ سلامت ہیں تو کوئی مصیبت، مصیبت ہی نہیں)

بڑھ کے اُس نے رُخِ روشنؐ کو جو دیکھا تو کہا
مَیں بھی، فرزند بھی، شوہر بھی، برادر بھی فدا

یا نبیؐ! آپ کے ہوتے ہوئے کیا چیز ہے غم
آپؐ زندہ ہیں تو سب ہیچ ہیں یہ رنج و الَم

(فیضانِ سنت: مولانا محمد الیاس قادری)

حُبِّ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حیرت انگیز مظاہرہ کرنے والی حضرت ہندؓ کے شوہر حضرت عمروؓ بن جموع کی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبتوں کے احوال بھی جان لیجئے۔ آپؓ ایک پاؤں سے معذور، لنگڑا کر چلتے تھے۔ چار بیٹوں کے باپ تھے۔ بدر میں تو ان کے بیٹوں نے جہاد میں جانے سے روک دیا لیکن اُحد کے موقع پر کہنے لگے: ''مَیں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ اپنے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دشمن کے درمیان اکیلا چھوڑ دوں۔ روزِ قیامت اپنے رب کو کیا منہ دکھاؤں گا اور آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سامنا کیسے کروں گا۔ مَیں ضرور جہادِ اُحد میں شرکت کروں گا۔'' بیٹوں نے منت سماجت کی کہ معذوری کے سبب آپ پر جہاد فرض نہیں ہے، لیکن ان کے دل میں جذبہ حُبِ رسولؐ یوں موجزن تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہو گئے اور جہاد کے لیے اصرار کیا۔ حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی معذوری کی بابت فرمایا، مگر جب انؓ کا اصرار دیکھا تو ان کے بیٹوں کو سمجھایا کہ انہیں مت روکیں۔ عمروؓ بن جموع اپنے بیٹے خلادؓ اور اہلیہ کے بھائی عبداللہؓ بن عمرو بن ہشام کے ہمراہ میدانِ جنگ میں اُترے۔ کفار کے اُس جتھے پر جا حملہ آور ہوئے جو وقتی طور پر حالات بدلنے کے بعد رسولِ پاکؐ پر مسلسل وار کر رہا تھا۔ کفار کو مولی گاجر کی طرح کاٹتے پھینکتے یہ تینوں مردانِ دلیرؓ رتبۂ شہادت پا گئے۔ جب حضرت عمروؓ بن جموع کی میّت کو مدینہ منورہ منتقل کیا جانے لگا، تو اونٹ بیٹھ جاتا۔ اُحد کا رخ کیا جاتا تو اونٹ تیزی سے چلنے لگتا۔ یہ ماجرا رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سنایا گیا تو آپؐ نے پوچھا کہ گھر سے نکلتے وقت عمروؓ بن الجموع نے کیا کہا تھا؟ عرض کیا گیا کہ انہوں نے کہا تھا کہ یا اللہ! اب اس گھر میں واپس نہ لا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اسی وجہ سے تو اونٹ چل نہیں رہا۔ پھر فرمایا: ''قسم ہے اُس ذاتِ مقدّسہ کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم میں سے بعض لوگ اس حیثیت کے حامل ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کو کسی بات کی قسم دے دیں، تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کی لاج رکھ لیتا ہے۔ یہ عمروؓ بن الجموع بھی انہی لوگوں میں سے ہیں۔ مَیں انہیں جنت میں اسی لنگڑاتے پیر سمیت چلتے ہوئے دیکھ رہا ہوں''۔ (ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: جسٹس محمد کرم شاہ الازہری)

معرکۂ اُحد میں پانسہ پلٹا، تو پھرے ہوئے کفار حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پہلو بدل بدل کر حملہ آور ہوئے۔ اس موقع پر آپؐ پر ستّر تلواروں سے

حملہ کیا گیا مگر جاں نثارانِؓ رسولِ کریمؐ دشمنوں کے راستے کی دیوار بن گئے۔ زیادؓ بن سکن ساتھیوں سمیت آگے بڑھے اور اپنے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ڈھال بن کر کھڑے ہو گئے۔ حملہ آوروں سے لڑتے بھڑتے سینکڑوں وار اپنے جسم پر سہتے، یہ تمام جاں نثارؓ جامِ شہادت نوش کر گئے یا شدید زخمی ہوئے مگر کیا مجال کہ آقاؐ کو ذرا سی ضرب بھی لگنے دی ہو۔

جنگ ختم ہوئی تو اُحد کا میدان زخمی مسلمانوں اور شہدا سے بھرا پڑا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے دیکھا کہ حضرت عمارہؓ بن زیاد زخموں سے چُور چُور خون میں لت پت پڑے ہیں، سانس اُکھڑ رہی ہے، غور سے سُنا تو کہہ رہے ہیں:

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اللہ اُنؐ پر رحمتیں نازل فرمائے

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم.....

پھر بمشکل کہا: کاش کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بُلا لائے!

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیزی سے اپنے زخمی کے سرہانے تشریف لا کر فرماتے ہیں: عمارہ! آنکھیں کھولو۔ دیکھو مَیں آ گیا ہوں، عمارہ!

حضرت عمارہؓ نے آنکھیں کھول دیں۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی خوشی میں آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: عمارہ کوئی آخری تمنا؟

حضرت عمارہؓ کراہتے ہوئے، گلوگیر ہو کر بولے: ''صرف ایک تمنا ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ پھر اپنا نیم جاں جسم بمشکل تمام گھسیٹ گھسیٹ کر اپنے آقاؐ کے قدموں میں رکھ دیا اور آہستہ آہستہ کہنے لگے:

[ترجمہ: اللہ تعالیٰ سے ربّ ہونے کے باعث، اسلام سے دینِ حق ہونے کے ناتے اور حضرت محمد مصطفیٰؐ سے نبی ہونے کی حیثیت سے راضی ہُوں۔'']

پہلے اپنے رخسار اور پھر لب سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاؤں مبارک پر رکھے اور پورے زور سے کہا: فُزتُ بِرَبِّ الکَعبۃ

[ربِّ کعبہ کی قَسم! مَیں کامیاب ہو گیا] اور جانِ جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

''سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' میں علامہ شبلی نعمانیؒ نے اس لمحۂ جاں فزا کی شعری تصویر کشی یوں کی:

بچہ ناز رفتہ باشد زجہاں نیاز مندے
کہ بوقتِ جاں سُپردن بسرش رسیدہ باشی

[کس قدر خوش بخت ہے وہ شخصیت اور کس ناز و ادا سے جانِ ربِّ کریم کے سپرد کی ہو گی، جب انؓ کے آقاؐ انؓ کے سر کی جانب موجود تھے]

اس بے بدل سفرِ آخرت کے حوالے سے مولانا غلام محمد ترنمؒ نے کہا:

سر بوقتِ ذبح اُنؐ کے زیرِ پائے ہے
یہ نصیب اللہ اکبر! لوٹنے کی جائے ہے

(سیرتِ رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: پروفیسر نور بخش توکلیؒ)

حضرت عمّارہؓ اور زیادؓ بن سکن سمیت سات جانفروشوں کے زخمی اور شہید ہونے کے فوراً بعد حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ دیگر صحابہؓ کے ہمراہ کفار اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان کھڑے ہو گئے۔ حضرت طلحہؓ اس موقع پر گیارہ کفار سے تن تنہا لڑے۔ تیروں کو اپنے بازوؤں پر روکا۔ قیسؓ بن خازم کہتے ہیں کہ میں نے طلحہؓ کے شل اور چھلنی بازو کو دیکھا، اُسی کے ذریعے اُحد کے معرکے میں رسولِ کریمؐ کا دفاع کیا۔ طلحہؓ دفاع کر رہے تھے اور حملے بھی، اُن کی انگلیاں دشمن کی تلوار کے وار سے کٹ گئیں، بدن زخموں سے چُور اور بازو شدید زخمی، مگر دل میں ایک ہی جذبہ موجزن تھا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی گزند نہ پہنچے! حضرت طلحہؓ کو تیروں اور تلواروں کے اسّی سے زیادہ زخم پہنچے۔

تین مضبوط کمانیں اُن کے ہاتھ میں ٹوٹ گئیں۔ ابوطلحہؓ نے اپنی ڈھال کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ اطہر کے سامنے کر رکھا تھا تاکہ مکمل حفاظت رہے۔ حضرت ابودجانہؓ نے اپنی کمر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم مبارک کے لیے ڈھال بنادی۔ کفار کے تمام تیر جو رسول اللہؐ کی جانب آرہے تھے ابودجانہ کی پشت پر آکر لگتے، مگر ابودجانہؓ تمام تر زخموں کے باوجود اپنی جگہ سے نہ ہلتے کہ کہیں کوئی تیر جسدِ رسالت مآبؐ کو چھو نہ جائے۔

(سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: مولانا شبلی نعمانیؒ)

حضرت معصبؓ بن عمیر اسلام کا جھنڈا بلند کئے ہوئے تھے، کفار کی خواہش تھی کہ پرچمِ اسلام کو جُھکا لیں یا گرا ڈالیں، حضورِ پاکؐ پر بھی حملے کر رہے تھے۔ حضرت معصبؓ بن عمیر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کے ساتھ ساتھ جھنڈے کا دفاع بھی کر رہے تھے۔ ابنِ قمیہ کے تابڑ توڑ حملے جاری تھے، حضرت معصبؓ بن عمیر اس کے حملے کا نشانہ بنے اور دایاں ہاتھ، جس میں جھنڈا تھا، کٹ گیا۔ حضرت معصبؓ نے جھنڈا فوراً دوسرے ہاتھ میں لے لیا۔ کفارِ مکہ نے بائیں ہاتھ کو بھی کاٹ ڈالا۔ حضرت معصبؓ کے دونوں ہاتھ کٹ چکے تھے، وہ زمین پر بیٹھ گئے اور پرچمِ اسلام کو سینے اور گردن کا سہارا دے کر کھڑا کئے رکھا، یہاں تک کہ ابنِ قمیہ نے پرچم بردارِ اسلامؓ کا سر تن سے جدا کردیا۔ یوں اس جانثارِ باکمالؓ نے جان دے دی، مگر پرچمِ اسلام گرنے یا جھکنے نہ دیا، بلند رکھا!

حضرت معصبؓ بن عمیر قریش کے وہ فرزند تھے کہ قبولِ اسلام سے پیشتر مشک وعنبر میں بسے نظر آتے تھے، ریشمی لباس زیبِ تن کرتے۔ جب کہیں دُور سے کوئی اُن سے ملنے کی خاطر آتا تو انہیں اس خوشبو سے پہچان لیتا جو اُن کے راستے سے گزرنے کی گواہ بن جاتی۔ خوشبو بتادیتی کہ معصبؓ اس راہ سے گزرے ہیں۔ اہلِ خانہ کی مخالفت کے باوجود اسلام قبول کیا۔ ہجرت کے بعد ایک روز مدینہ میں پیوند لگے کپڑوں میں دکھائی دیئے تو رسول اللہؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، فرمایا: ''اے اللہ رب العالمین! بس تیری ہی شان سب سے اونچی ہے''۔ غزوۂ اُحد میں جب شہداؓ کی میتیں اکٹھی کی جا رہی تھیں، تو سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معصبؓ کا لہولہو چہرہ، لخت لخت جسم، خاک سے اٹا سر اور خون میں گُندھے بال دیکھ کر رُندھی ہوئی آواز میں فرمایا: ''اے خوشبوؤں سے نہانے والے! کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔'' حضرت معصبؓ کو دفن کرنے کی باری آئی تو کفن کی چادر چھوٹی تھی۔ چہرہ ڈھانپتے تو پیر نظر آنے لگتے اور پیروں کو ڈھانپتے تو چہرہ کُھل جاتا۔ بالآخر ٹانگوں پر گھاس ڈال کر سپردِ خاک کردیئے گئے۔ رسولِ کریمؐ نے اس موقع پر فرمایا: ''مکہ کی گلیوں میں ریشمی لباس پہن کر گھومنے والے کو دیکھو، سبحان اللہ! اُسی شان سے جنت میں گھومتا پھر رہا ہے''۔

(سیرتِ رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: پروفیسر غُلام بخش توکلیؒ)

حضرت انسؓ بن مالک کے چچا انسؓ بن نضر غزوۂ بدر میں شریک نہ ہوسکے تھے، اس پر انہیں بہت ملال تھا۔ وہ کہا کرتے کہ آئندہ جہاد کا کوئی موقع ملا تو دکھادوں گا کہ کس طرح شہید ہوتے ہیں۔ معرکۂ اُحد میں وہ شروع ہی سے شریک تھے۔ جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کی افواہ سنی تو بولے کہ جس مقصد کے لیے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہوگئے، اب اُن کے بعد ہم جی کر کیا کریں گے۔ یہ کہہ کر اپنی تلوار تھامی اور آگے بڑھے۔ ایک شعر پڑھتے جارہے تھے جس کا ترجمہ یوں ہوسکتا ہے:

جو تُجھ بِن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اِس عہد کو اب وفا کر چلے

سامنے سعدؓ بن معاذ ملے، انہوں نے پوچھا کہ کہاں جارہے ہو؟ کہنے

لگے: ''اے سعد! یہ ہے جنّت ۔نضر کے ربّ کی قسم! جنت کی خوشبو اُحد پہاڑ کے نیچے سے آ رہی ہے''۔ پھر دشمن پر ٹوٹ پڑے اور جس جگہ کی خوشبو انہیں کھینچ رہی تھی' اس کو پالیا۔ جنگ کے اختتام پر جب حضرت انسؓ نے اپنے چچا کی میّت دیکھی تو پہچانی نہیں جا رہی تھی ۔تلواروں' تیروں اور نیزوں کے اسّی سے زیادہ زخم تھے۔ان کی بہنؓ نے انگلی پر تِل کے ایک نشان کے ذریعے پہچانا کہ یہ ان کا بھائی نضرؓ ہے۔ (محسنِ انسانیت: نعیم صدیقی)

غزوۂ اُحد میں مشہور صحابیہ حضرت اُمِ عمارہؓ نے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایسی محبت' جانثاری اور عزم و استقامت کا مظاہرہ کیا کہ تاریخ میں ''خاتونِ اُحد'' کے لقب سے شہرت پائی۔''طبقاتِ ابنِ سعد'' کی روایت کے مطابق اُنؓ کے دو فرزند حضرت عبداللہؓ اور حضرت حبیبؓ بھی غزوہ اُحد میں شریک تھے۔ جب تک مسلمانوں کا پلّہ بھاری رہا' اُمِ عمارہؓ دوسری خواتین کے ساتھ مشکیزوں میں پانی بھر بھر کر مجاہدین کو پلاتی اور زخمیوں کی خبر گیری کرتی رہیں۔ جب ایک غلط فہمی سے جنگ کا نقشہ بدل گیا اور مجاہدین انتشار کا شکار ہو گئے تو اس وقت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس گنتی کے چند سرفروش باقی رہ گئے۔حضرت اُمِ عمارہؓ نے یہ دیکھا تو مشکیزہ پھینک کر تلوار اور ڈھال سنبھالی اور حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب پہنچ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ڈھال بن گئیں۔ کفار بار بار یورش کر کے حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف بڑھتے' اُمِ عمارہؓ دوسرے مجاہدین کے ساتھ مل کر انہیں تیر اور تلوار سے روک کر پیچھے ہٹا دیتیں۔ یہ بڑا نازک وقت تھا' لیکن یہ شیر دل خاتون کوہِ استقامت بن کر میدانِ رزم میں ڈٹی ہوئی تھیں۔ایک مشرک نے آگے بڑھ کر رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملہ کرنا چاہا تو اُمِ عمارہؓ نے اس کے پاؤں پر تلوار سے وار کیا۔ چند لمحے بعد وہ پھر رسولِ پاکؐ پر حملہ آور ہوا تو اُمِ عمارہؓ نے اُسے پیچھے دھکیل دیا۔ اس نے اُمِ عمارہؓ کے قریب پہنچ کر پوری قوت سے تلوار کا وار کیا۔اُمِ عمارہؓ نے اسے اپنی ڈھال پر روکا اور اس کے گھوڑے کے پاؤں پر اپنی تلوار کا ایسا بھرپور وار کیا کہ گھوڑا اور سوار دونوں زمین پر آ رہے! آپؐ نے اُمِ عمارہؓ کے فرزند کو آواز دی: ''عبداللہؓ! اپنی ماں کی مدد کر''۔حضرت عبداللہؓ فوراً اُدھر لپکے اور تلوار کے ایک ہی وار سے اس مشرک کا کام تمام کر دیا۔ عین اس وقت ایک دوسرا مشرک تیزی سے ادھر آیا اور حضرت عبداللہؓ کا بایاں بازو زخمی کرتا ہُوا نکل گیا۔اُمِ عمارہؓ نے اپنے ہاتھوں سے بیٹے کا زخم باندھا اور پھر فرمایا: ''بیٹے جاؤ اور جب تک دم میں دم ہے' لڑو''۔ وہی مشرک جس نے حضرت عبداللہؓ کا بازو زخمی کیا تھا' پلٹ کر پھر حملہ آور ہُوا۔حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُمِ عمارہؓ سے فرمایا: ''اُمِ عمارہؓ! سنبھلنا' یہ وہی بدبخت ہے جس نے عبداللہؓ کو زخمی کیا''۔حضرت اُمِ عمارہؓ یہ سنتے ہی غضبناک ہو کر اس پر جھپٹیں اور تلوار کا ایسا کاری وار کیا کہ وہ دو ٹکڑے ہو کر اوندھے منہ زمین پر آن گرا۔رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ دیکھ کر متبسّم ہوئے اور فرمایا: ''اُمِ عمارہؓ تُو نے اپنے بیٹے کا خوب بدلہ لیا''۔

حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک بدبخت نے پتھر پھینکا جس سے آپؐ زخمی ہو گئے۔ اس کے فوراً بعد ابنِ قمیہ نے قریب پہنچ کر حضورِ پاک پر تلوار کا بھرپور وار کیا۔حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود (لوہے کی ٹوپی) پہنے ہوئے تھے۔ابنِ قمیہ کی تلوار خود پر پڑی تو خود کی دو کڑیاں رخسارِ مبارک میں گُھب گئیں اور خون کی دھاریں بہہ نکلیں۔ یہ سب کچھ چشمِ زدن میں ہو گیا۔اُمِ عمارہؓ نے ابنِ قمیہ کا راستہ روکا اور اس پر تلوار کا وار کیا۔ وہ دوہری زرہ پہنے ہوئے تھا' اس لئے اُمِ عمارہؓ کی تلوار اُچٹ گئی اور ابنِ قمیہ کو جوابی وار کرنے کا موقع مل گیا۔اس سے انؓ کے کندھے پر شدید زخم آیا' لیکن ابن قمیہ کو بھی وہاں ٹھہرنے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ تیزی سے گھوڑا دوڑا کر بھاگ گیا۔حضرت اُمِ عمارہؓ کے زخم سے خون کی

دھار بہہ رہی تھی۔حضورِ پاکؐ نے اُنؓ کے زخم پر پٹی باندھی اور کئی بہادر صحابہؓ کا نام لے کر فرمایا: ''واللہ! آج اُمِ عمارہؓ نے ان سب سے بڑھ کر بہادری دکھائی''۔ حضرت اُمِ عمارہؓ کے جسم پر بارہ زخم آئے ۔ جن خواتینِ اسلام نے میدانِ رزم میں مجاہدانہ کارنامے انجام دیئے ان میں حضرت اُمِ عمارہؓ کا نام سرِ فہرست ہے۔ وہ مدینہ کے خاندان خزرج کی شاخ بنونجار سے تھیں۔ہجرتِ نبوی سے پہلے قبولِ اسلام کا شرف حاصل کیا اور بیعتِ عقبۂ کبیرہ(13 نبوت) میں شریک ہوئیں۔غزوۂ اُحد کے بعد وہ بیعتِ رضوان، غزوۂ خیبر اور عمرۃ القضا میں شریک تھیں۔ فتح مکہ کے موقع پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھیں۔ پھر غزوۂ حنین میں دادِ شجاعت دی۔ان کے ایک فرزند حضرت حبیبؓ کو نبوت کا دعویٰ کرنے والے بد بخت مسیلمہ کذاب نے بڑی بے دردی سے شہید کر دیا تھا، انہوں نے یہ صدمہ بڑے صبر اور حوصلے سے برداشت کیا۔حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگِ یمامہ پیش آئی، تو حضرت اُمِ عمارہؓ اپنے فرزند عبداللہؓ کے ساتھ اسلامی لشکر میں شریک ہو گئیں اور دونوں ماں بیٹا مرتدّوں کے خلاف سر بکف ہو کر لڑے، یہاں تک کہ ان کے فرزند عبداللہؓ اور وحشیؓ بن حرب (جس کے ہاتھوں حضرت حمزہؓ شہید ہوئے تھے) کے ہاتھوں مسیلمہ مارا گیا۔اس لڑائی میں حضرت اُمِ عمارہؓ کا ایک بازو کٹ گیا اور معرکۂ اُحد کی طرح اُس دن بھی ان کو بارہ شدید زخم لگے۔ (خواتین میدانِ جنگ میں: طالب الہاشمی)

غزوۂ اُحد میں کئی خواتین کو دلدوز صدمات سے دوچار ہونا پڑا، لیکن انہوں نے حُبِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صبر و ثبات کا ایمان افروز مظاہرہ کیا۔حضرت حمنہ بنتِ جحشؓ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن اور حضرت معصبؓ بن عمیر کی اہلیہ تھیں۔لڑائی میں انؓ کے ماموں حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب، بھائی حضرت عبداللہؓ بن جحش اور شوہر حضرت مصعبؓ بن عمیر شہید ہو گئے۔لڑائی کے فوراً بعد انؓ کی ملاقات رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انؓ سے فرمایا، اے حمنہ! اپنی مصیبت پر اپنے خالق سے اجر طلب کر۔انہوں نے عرض کیا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس کی موت کے صبر کا اجر اللہ سے طلب کروں؟ حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، تمہارے ماموں حمزہ بن عبدالمطلب شہید ہو گئے۔حمنہؓ نے انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا اور دعا کی۔حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر فرمایا، اپنی مصیبت کا اجر اپنے رب سے طلب کرو۔حضرت حمنہؓ نے عرض کیا، اب کس کی موت پر صبر کا اجر اپنے رب سے مانگوں؟ حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، تمہارا بھائی عبداللہ بن جحش لڑائی میں شہید ہو گیا۔حضرت حمنہؓ نے انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھ کر حسبِ سابق دعا کی، تیسری مرتبہ بھی حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے جیسے الفاظ ارشاد فرمائے اور حضرت حمنہؓ کے سوال کے جواب میں فرمایا، حمنہؓ! تمہارے شوہر معصبؓ بن عمیر نے بھی جامِ شہادت پی لیا۔حضرت حمنہؓ نے حضورِ پاکؐ کی جانب دیکھا اور حسبِ سابق استقامت کا مظاہرہ کیا۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حمنہؓ اور ان کے بچوں کے لئے دعا مانگی کہ ان پر اللہ تعالیٰ اپنا فضل اور احسان فرمائے''۔ (قربانیوں کی فصلِ بہار: سیّد ریاض الحسن گیلانی)

غزوۂ خندق میں عرب کے مشرکین اور یہود نے متحد ہو کر مدینہ منورہ پر چڑھائی کر دی اور مدینہ منورہ کے اندر آباد یہود بنی قریضہ نے آستین کے سانپ کا کردار ادا کرنے پر کمر باندھی تھی۔ مسلمانوں کے لئے یہ بڑا نازک وقت تھا۔مسلمان عورتوں اور بچوں کو یہود بنی قریضہ کے شر انگیزی سے بچانا ضروری تھا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنظرِ احتیاط تمام

مسلمان خواتین اور بچوں کو ایک قلعہ (فارع یا اطم) میں منتقل کر دیا تھا اور حضرت حسانؓ بن ثابت (شاعرِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ان کی نگرانی پر مامور فرما دیا تھا۔ قلعہ اگرچہ خاصا مضبوط تھا' لیکن یہ انتظام خطرے سے خالی نہ تھا کیونکہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے تمام جان نثاروںؓ کے ساتھ حملہ آور دشمنوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ انہی پُر آشوب ایام میں ایک یہودی ادھر آ نکلا' قلعے میں موجود لوگوں کی سُن گُن لینے لگا۔ قلعے میں موجود خواتین میں حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب بھی تھیں۔ اتفاق سے ان کی نظر اس یہودی پر پڑ گئی۔ اپنی خداداد فراست سے سمجھ گئیں کہ یہ شخص جاسوس ہے' اگر اس نے بنوقریضہ کے شریرالنفس لوگوں کو جا کر بتا دیا کہ قلعے میں صرف عورتیں اور بچے ہیں تو ہوسکتا ہے کہ وہ میدان خالی دیکھ کر قلعے پر حملہ کر دیں' چنانچہ انہوں نے نگرانِ قلعہ حضرت حسانؓ بن ثابت سے کہا کہ باہر نکل کر اس یہودی کو قتل کر دیں۔ حضرت حسانؓ نے کہا ''مَیں شاعر ہوں' دل کا نرم' میں اس (ہٹے کٹے مسلح) یہودی سے لڑنے کے قابل ہوتا تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم رکاب نہ ہوتا؟'' حضرت صفیہؓ معمر تھیں لیکن بڑے دل گردے کی مالک۔ حضرت حسانؓ کا جواب سُن کر فوراً اُٹھیں' خیمے کی ایک چوب اُکھاڑی اور یہودی کے سر پر اس زور سے ماری کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اندر سے تلوار لائیں اور مُردہ یہودی کا سر کاٹ کر قلعے سے نیچے پھینک دیا۔ کٹا ہُوا سر دیکھ کر یہودیوں کو یقین ہو گیا کہ قلعہ کے اندر بھی نفری موجود ہے۔ انہیں قلعے پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ (انسانِ کامل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: خواجہ غلام السیدین)

8 ہجری میں فتح مکہ کے چند دن بعد حنین کا معرکہ پیش آیا۔ اسلامی لشکر مکہ مکرمہ سے حنین روانہ ہُوا' تو متعدد خواتین بھی شریکِ جہاد ہونے کے لئے اس لشکر کے ساتھ ہو لیں۔ خادمِ رسول اللہؐ انسؓ بن مالک کی والدہ حضرت اُمِ سلیمؓ بھی لشکر میں شامل تھیں۔ بنوہوازن کے ماہر تیراندازوں نے لڑائی کی ابتدا میں اپنے مورچوں سے مسلمانوں پر اس شدت سے تیر برسائے کہ ان کی صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ اُس وقت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چند جاں نثاروںؓ کے ہمراہ میدانِ جنگ میں کوہِ استقامت بن کر کھڑے تھے اور زبان پر یہ رجز جاری تھا: انا النبیُ لا کذب - انا ابنُ عبدالمطلب [مَیں اللہ کا نبی ہوں' یہ ہرگز غلط نہیں۔ مَیں عبدالمطلب کا فرزند ہوں] بکھرے ہوئے تمام مجاہدین پلٹے اور حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد جمع ہو گئے۔ پھر سب نے جوش اور ولولے کے ساتھ کفار پر زبردست حملہ کیا۔ گھمسان کا رَن پڑ رہا تھا' حضرت اُمِ سلیمؓ ہاتھ میں خنجر لئے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کے لئے کھڑی تھیں۔ لڑائی کا زور کم ہُوا تو انؓ کے شوہر حضرت ابوطلحہؓ نے حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا کہ اُمِ سلیمؓ ہاتھ میں خنجر لئے کھڑی ہیں۔ اس پر حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُمِ سلیمؓ سے پوچھا! ''خنجر سے کیا کرو گی؟'' عرض کیا: ''یارسول اللہ! کوئی مشرک آپ کے قریب آیا تو اس کا پیٹ چاک کر دوں گی۔'' حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انؓ کا جواب سُن کر تبسّم فرمایا۔

(خواتین میدانِ جنگ میں: طالب الہاشمی)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ محترمہ حضرت آمنہؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ (اُس وقت یثرب) میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد مرحوم حضرت عبداللہ کی قبر کی زیارت کروا کر واپس آ رہی تھیں کہ راستے میں حضرت آمنہؓ کا انتقال ہو گیا۔ حضرت اُمِ ایمنؓ ہمراہ تھیں۔ انہوں نے ہی حضرت آمنہؓ کی تدفین کروائی اور بعد ازاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دیکھ بھال کی۔ حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بھی کسی معرکے میں جاتے'

حضرت اُمِ ایمنؓ خاصی معمر ہونے کے باوجود ساتھ ساتھ ہوتیں۔ کئی غزوات میں شریک ہوئیں' مجاہدین کو پانی پلاتی اور زخمیوں کی تیمارداری کرتیں' لیکن رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مسلسل نظر رکھتیں کہ آپؐ کو کوئی تکلیف تو نہیں پہنچ رہی۔ (خطباتِ بہاولپور: ڈاکٹر محمد حمید اللہ)

حضرت سمیہؓ بنت خیاط حضرت عمارؓ کی والدہ تھیں اور اپنے خاوند حضرت یاسرؓ کی طرح اسلام کی خاطر قسم قسم کی تکلیفیں اور مشقتیں صبر سے برداشت کرتیں۔ کفارِ مکہ ان کو گرمی کی عین دوپہر کنکریوں پر ڈال دیتے اور لوہے کی زرہ پہنا کر دھوپ میں کھڑا کر دیتے تاکہ دھوپ سے لوہا تپنے لگے اور اس کی گرمی سے تنگ آ کر راہِ اسلام ترک کر دیں۔ حضورِ اقدسؐ کا ادھر سے گزر ہوتا تو صبر کی تلقین اور دعا فرماتے۔ ایک مرتبہ حضرت سمیہؓ زرہ پہنے کڑی دھوپ میں کھڑی تھیں کہ ابوجہل کا گزر ہُوا۔ رسولِ اکرمؐ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے کہنے لگا اب بھی محمد کا راستہ ترک کر دو تو اس تکلیف سے بچ سکتی ہو۔ حضرت سمیہؓ نے کلمہ طیّبہ پڑھ کر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود و سلام بھیجتے ہوئے کہا جو ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا ہے' اللہ اُس کا خاتمہ کرے۔ اُسے مزید ذلیل کرنے کے لئے اللہ نے اُس کی رسی دراز کر رکھی ہے تو ہمیں آقاؐ کے متعلق اُس کی بدکلامی سننے سے ہمیشہ کیلئے محفوظ فرما دے۔ ابوجہل نے انہیں بُرا بھلا کہا اور برچھا دے مارا' جس سے وہ انتقال فرما گئیں۔ اسلام کی خاطر یہ سب سے پہلی شہادت تھی۔

(سیرتِ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: سیّد ابوالاعلیٰ مودودی)

ابوسُفیان کی بیوی ہندہ نے معرکۂ بدر میں اپنے باپ' چچا' بھائی اور بیٹے کے حضرت حمزہؓ کے ہاتھوں قتل کا بدلہ لینے کے لئے حربہ (نیزہ۔ جیولین) پھینکنے کے ماہر اپنے غلام وحشی بن حرب کو لالچ دے کر حضرت حمزہؓ کو شہید کرنے پر تیار کیا۔ اُحد میں گھمسان کا رن پڑا تو حضرت حمزہؓ نے دونوں ہاتھوں سے تلوار چلا کر کئی نامی گرامی کفار کو قتل کیا۔ جنگ کا نقشہ بدلنے پر کفار نے جوابی حملہ کر دیا' حضرت حمزہؓ کفار کے جوابی حملے کو روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ وحشی نے ایک پتھر کی اوٹ سے حضرت حمزہؓ پر حربہ پھینکا' حضرت حمزہؓ اُسے للکارتے ہوئے آگے بڑھے۔ زخم بہت مہلک تھا' زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے اپنے ربّ سے جا ملے۔ ہندہ نے حضرت حمزہؓ کی ناک' کان اور ہونٹ کاٹ کر گلے کا ہار بنایا۔ آپ کی شکل مبارک پہچاننا مشکل ہوگئی۔ حضرت حمزہؓ کی بہن حضرت صفیہؓ نے اُن کی میّت کا دیدار کرنا چاہا تو ایک خیال تھا کہ شاید برداشت نہ کر سکیں مگر حضرت صفیہؓ نے بھائی کی میّت پر کھڑے ہو کر انتہائی شکر گزاری اور کمال حوصلے کے ساتھ اپنے ربّ کی رضا پر سرِ تسلیم خم کیا۔

(رسولِ پاکؐ کے پہلے سپہ سالار: میجر امیر افضل خان)[ہلال' سیرت النبیؐ نمبر-1991]

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک یہودی اور بشر نامی ''مسلمان'' کے جھگڑے کا فیصلہ کرتے ہوئے یہودی کو حق بجانب پایا۔ بشر نے کہا: ''مجھے فیصلہ منظور نہیں' حضرت عمرؓ سے فیصلہ کراتے ہیں۔'' دونوں حضرت عمر فاروقؓ کے پاس پہنچے' یہودی نے ساری بات بتائی۔ بشر نے کہا میں آپ کے فیصلے کو ترجیح دوں گا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ ٹھہرو' ابھی فیصلہ کرتا ہوں۔ تلوار لا کر یہ کہتے ہوئے بشر کی گردن اُڑا دی کہ جو خود کو مسلمان کہتا ہے مگر اللہ کے رسولؐ کا فیصلہ نہیں مانتا' اُس کے لئے میرا فیصلہ یہ ہے۔ بشر کے ساتھیوں نے ہنگامہ کیا' مگر اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضرت عمرؓ کے فعل کی تائید فرما دی۔ اُسی دن سے آپؓ کا لقب فاروق ٹھہرا۔

(تاریخِ اسلام: مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی)

ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جاوید چودھری

وہ یہودی تھا اور اسلام پر پی ایچ ڈی کر رہا تھا' میری اس سے پیرس میں ملاقات ہوئی۔ پیرس میں دنیا کا بہت بڑا اسلامک سنٹر ہے جو علم کا خزانہ ہے۔ ماضی میں فرانسیسی بے شمار اسلامی ممالک کے حکمران رہے۔ وہ ان ممالک سے قلمی نسخے' قدیمی کتابیں اور قدیم مکتوبات جمع کرتے رہے' پیرس لاتے رہے اور پیرس میں اسلامک سنٹر بنا کر یہ خزانہ اس میں رکھ دیا۔ یہ عمارت دریائے سین کے کنارے واقع ہے جو سیج بھی ہے' خوبصورت بھی' جدید بھی اور دس منزلہ بھی۔ عمارت کی چھت پر چار شاندار کیفے اور ریستوران ہیں۔ آپ چھت پر بیٹھ کر کافی پی سکتے ہیں' کھانا بھی کھا سکتے ہیں اور پیرس شہر اور دریائے سین کا نظارہ بھی کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ کا زیادہ تر وقت اسی سنٹر میں گزرتا تھا' وہ سنٹر کے قریب رہتے تھے' ان کی مسجد بھی سنٹر سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔

یہودی ربی مجھے اس سنٹر کی چھت پر ملا' وہ اپنی نشست سے اٹھا' مجھے السلام علیکم کہا اور عربی میں گفتگو شروع کر دی۔ میں نے اس سے معذرت کی اور عرض کیا ''میں عربی نہیں جانتا''۔ اس نے پوچھا ''کیا آپ مسلمان ہیں؟'' میں نے جواب دیا ''الحمد اللہ''۔ اس نے حیرت سے پوچھا ''پھر آپ کو عربی کیوں نہیں آتی؟'' میں نے عرض کیا ''میں پاکستانی مسلمان ہوں اور پاکستان میں بچوں کو عربی کی بجائے انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے قہقہہ لگایا اور میں نے بھی۔ وہ مجھے مصری مسلمان سمجھ کر میرے پاس آیا تھا۔ یورپ اور امریکہ کے عیسائی اور یہودی مصریوں کو بہت پسند کرتے ہیں' مصری ہمارے مقابلے میں زیادہ پڑھے لکھے ہیں۔ یہ دین' سائنس اور ادب' تینوں شعبوں میں دیگر مسلم ممالک سے آگے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے دانشور انہیں پسند کرتے ہیں مگر میں پاکستانی نکلا اور مجھے عربی بھی نہیں آتی تھی لیکن اس کے باوجود کیونکہ وہ میرے پاس آ چکا تھا چنانچہ اس نے واپس جانا خلافِ تہذیب سمجھا اور میرے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا ''کیا آپ مسلمان ہیں؟'' اس نے مسکرا کر جواب دیا ''نہیں میں اردن کا یہودی ہوں' میں ربی ہوں اور پیرس میں اسلام پر پی ایچ ڈی کر رہا ہوں۔'' میں نے پوچھا ''اسلام کے کس پہلو پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں؟'' وہ شرما گیا اور تھوڑی دیر سوچ کر بولا ''میں مسلمانوں کی شدت پسندی پر ریسرچ کر رہا ہوں۔'' میں نے قہقہہ لگا کر اس سے پوچھا ''آپ کی ریسرچ کہاں تک پہنچی؟'' اس نے کافی لمبا سپ لیا اور بولا ''میری ریسرچ مکمل ہو چکی ہے اور میں اب پیپر لکھ رہا ہوں۔'' میں نے پوچھا ''ریسرچ کی فائنڈنگ کیا ہے؟'' یہودی ربی نے دائیں بائیں دیکھا' گردن ہلائی اور آہستہ آواز میں بولا ''میں پانچ سال کی مسلسل ریسرچ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مسلمان اسلام سے زیادہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتے ہیں' یہ اسلام پر ہر قسم کا حملہ برداشت کر جاتے ہیں لیکن نبیؐ کی ذات پر اٹھنے والی انگلی تک برداشت نہیں کرتے۔'' میرے لئے حیران کُن تھا یہ جواب' میں نے کافی کا مگ میز پر رکھا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ بولا ''میری ریسرچ کے مطابق مسلمان جب بھی لڑے' جب بھی اٹھے اور جب بھی لپکے اس کی وجہ نبی اکرمؐ کی ذات تھی۔ آپ خواہ ان کی مسجد پر قبضہ کر لیں' آپ ان

کی حکومتیں ختم کر دیں' آپ قرآن مجید کی اشاعت پر پابندی لگا دیں یا آپ ان کا پورا پورا خاندان مار دیں' یہ برداشت کر جائیں گے لیکن آپ جونہی ان کے رسولؐ کا نام غلط لہجے میں لیں گے' یہ تڑپ اٹھیں گے اور اس کے بعد آپ پہلوان ہوں یا فرعون' یہ آپ کے ساتھ ٹکرا جائیں گے۔''

میں حیرت سے دیکھتا رہا۔ یہودی ربی بولا: ''میری ریسرچ کی فائنڈنگ ہے کہ جس دن مسلمانوں کے دل میں رسولؐ کی محبت نہیں رہے گی' اس دن اسلام ختم ہو جائے گا۔ اگر کوئی اسلام کو ختم کرنا چاہے تو اس کو مسلمانوں کے دل سے ان کا رسول نکالنا ہوگا۔'' اس نے اس کے ساتھ ہی کافی کا مگ نیچے رکھا' اپنا کپڑے کا تھیلا اٹھایا' کندھے پر رکھا' سلام کیا اور اٹھ کر چلا گیا۔ میں اس یہودی ربی کو اپنا محسن سمجھتا ہوں کیونکہ میں اس ملاقات سے پہلے تک صرف ساجی مسلمان تھا' اس نے دو فقروں میں پورا اسلام سمجھا دیا۔ میں جان گیا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اسلام کی روح ہے اور یہ روح جب تک قائم ہے' اس وقت تک اسلام کا وجود بھی سلامت ہے۔ جس دن یہ روح ختم ہو جائے گی' اس دن ہم میں اور عیسائیوں یا یہودیوں میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔

ہم سب مسلمان جتنے بھی گناہگار' نام نہاد لبرل' ماڈرن اور برداشت کے چیمپئین ہو جائیں' ہم نبی اکرمؐ کی ذات پر کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے کیونکہ ہم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی حد تک حضرت اویس قرنیؓ ہے۔ حضرت اویس قرنیؓ ایک آدھ بار کے علاوہ کبھی یمن سے باہر نہیں نکلے' آپؓ کی والدہ علیل تھیں چنانچہ آپؓ والدہ کی خدمت کرتے رہے اور رسول اللہؐ کی ذات سے عشق۔ اللہ تعالیٰ کو یہ خدمت اور یہ عشق اس قدر بھایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اویس قرنیؓ کو نبی کریمؐ کے دیدار کے بغیر صحابی ڈکلیئر کر دیا۔ آپؓ رسولِ کریمؐ سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ جب آپؓ کو معلوم ہوا کہ جنگ اُحد میں رسول اللہؐ کا دانت مبارک شہید ہو گیا' تو آپؓ نے اپنے تمام دانت توڑ دیئے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں آپؓ نے خلیفہ کو کوئی مشورہ دینا تھا' آپؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کو مدینہ کی سرحد پر بلوایا' خود مدینہ کی حد سے باہر کھڑے رہے اور حضرت عمر فاروقؓ کو مدینہ کی حدود میں کھڑا کر کے بات کی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے آگے نہ آنے کی وجہ پوچھی تو آپؓ نے فرمایا ''عمر! میں اس زمین پر کیسے پاؤں رکھ سکتا ہوں جس میں نبی اکرمؐ آرام فرما ہیں۔''

ہم سب کے اندر بھی ایسا ہی جذبہ موجزن ہے۔ تیر لوہے کا ہو یا توہین کا' ہم اسے اپنی پشت اور سینے دونوں پر سہتے ہیں لیکن توہین یا زیادتی کا کوئی تیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کی طرف نہیں جانے دیتے۔ یورپ اور امریکہ کو اگر یقین نہ آئے تو یہ پاکستان سے لے کر طرابلس تک پھیلی آگ دیکھ لیں' یہ آگ ''انوسینس آف مسلمز'' نام کی اس فلم کے بعد بھڑکی جو پادری ٹیری جونز کی تحریک پر سام باسیل جیسے اسلام دشمن یہودی ڈائریکٹر نے بنائی اور اس کیلئے ایک سو یہودیوں نے 50 لاکھ ڈالر سرمایہ فراہم کیا۔ یہ فلم محض فلم نہیں' بلکہ توہین کا وہ گٹر ہے جس کا ڈھکنا متعصب یہودیوں اور عیسائیوں نے عالمِ اسلام کی قوتِ برداشت دیکھنے کے لئے کھولا۔ چنانچہ پوری دنیا میں امریکی اور یورپی سفارتکاروں کی زندگی داؤ پر لگ گئی۔ حد یہ کہ لیبیا کے مسلمانوں نے اُس بن غازی میں امریکی سفیر کو قتل کر دیا جس پر اس وقت امریکا کا قبضہ ہے۔ جبکہ لیبیا' مصر' تیونس' لبنان' اردن' انڈونیشیا' ملائشیا' نائیجیریا' مراکش' بنگلہ دیش اور پاکستان میں امریکی سفارت کار جان اور منہ چھپاتے پھرے۔ مغرب کو ان واقعات سے سیکھنا چاہئے' ٹیری جونز اور سام باسیل جیسے لوگوں کے خلاف قانون سازی کرنی چاہئے۔ فیصلہ کرنا چاہئے کہ یورپ اور امریکا کا کوئی شہری حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا کسی بھی پیغمبر کی توہین نہیں کرے گا' ورنہ دوسری صورت میں جو لوگ رسولِ پاکؐ کی محبت میں اپنے منہ کے سارے دانت توڑ سکتے ہیں' وہ گستاخوں کے دانتوں اور خود اُن کا کیا حشر کریں گے؟ اندازہ لگانا مشکل نہیں!

تابندہ باد

زمیں سے نُوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے

—— اقبالؒ

پاک سَر زمین شاد باد　　کِشوَرِ حَسِین شاد باد
تُو نشانِ عَزمِ عالیشان　　اَرضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد
پاک سَر زمین کا نظام　　قُوّتِ اُخوّتِ عوام
قوم، ملک، سلطنت　　پائندہ تابندہ باد
شاد باد منزلِ مُراد
پرچمِ ستارہ و ہلال　　رَہبرِ تّرقی و کمال
تَرجُمانِ ماضی، شانِ حال　　جانِ استقبال
سایۂ خُدائے ذُوالجلال

قیامِ پاکستان کے وقت پاکستان کا قومی ترانہ نہیں بنا تھا۔ نیا ملک تھا، ماشاءاللہ غیر ملکی زُعما کے دوروں کا دور دورہ تھا۔ پاکستان کی قومی تقریبات میں بھی غیر ملکی لوگوں کا آنا جانا جاری رہتا۔ قائدِاعظمؒ نے یکم اکتوبر 1947ء کو میجر جنرل محمد اکبر رنگروٹ سے کہا: ''آپ قومی ترانے کا انتظام کیوں نہیں کرتے؟ میں چاہتا ہوں کہ 10 اکتوبر کو ہونے والی پریڈ میں برطانوی دُھنوں کے بجائے پاکستانی دُھنیں پیش ہوں...'' وزیرِاعظم خان لیاقت علی خان کی بھی کوشش تھی کہ قائدِاعظمؒ کی خواہش کے مطابق ہمارا قومی ترانہ جلد از جلد ترتیب دیا جانا چاہئیے۔ ان کے کہنے پر حکومتِ پاکستان کی وزارتِ اطلاعات نے مختلف اخبارات میں ایک اشتہار شائع کرایا، جس میں اعلان کیا گیا کہ پاکستان کا ترانہ اور دُھن تیار کرنے والی شخصیت کو دس ہزار روپے انعام دیا جائے گا۔ اگر دو حضرات شاعری اور دُھن علیحدہ علیحدہ لائیں گے، تو دس ہزار کی رقم ان میں برابر تقسیم کی جائے گی۔ اشتہار سے چند ماہ پہلے وزیرِاعظم خان لیاقت علی خان راولپنڈی آئے تھے، جہاں جناب حفیظ جالندھری سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں شہیدِ ملّت نے جناب حفیظ جالندھری سے قومی ترانہ لکھنے اور بعد میں اس کی دُھن تیار کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ جناب حفیظ جالندھری نے دُھن تیار کرنے کے لیے آرکسٹرا وغیرہ کی ضروریات سے آگاہ کیا جس کی فراہمی کے لئے وزیرِاعظم نے ہامی بھر لی۔ اشتہار کی اشاعت کے بعد جب کسی شاعر نے ترانے کے متعلق رابطہ نہ کیا تو جناب حفیظ جالندھری نے ممبر فنانس کمیٹی جناب اے ڈی اظہر سے کہا کہ ترانے کے لیے کوئی ایسی کمیٹی بنائی جائے جو اس کام کو مناسب اہمیت اور وقت دے سکے۔ حکومتِ پاکستان نے 23 فروری 1949ء کو سردار عبدالرب نشتر کی سربراہی میں پیرزادہ عبدالستار، ایس ایم اکرام، پروفیسر چکرورتی، چوہدری نذیر احمد خاں، جناب زیڈ اے بخاری، جناب اے ڈے اظہر، جناب نسیم الدین اور جناب حفیظ جالندھری

پر مشتمل نورکنی کمیٹی تشکیل دی۔ کمیٹی کا پہلا اجلاس یکم مارچ 1949ء کو سردار عبدالرب نشتر کی صدارت میں ہُوا۔ دوسرے اجلاس میں طے پایا کہ ترانے کی شاعری اور دُھن کی ذمہ داری جناب حفیظ جالندھری کے سپرد کی جائے۔ جناب حفیظ جالندھری نے ہامی بھر لی اور اعلان کیا کہ وہ ترانے کے سلسلے میں کوئی معاوضہ نہیں لیں گے۔ انہوں نے چند سازندوں کی مدد سے بھرپور محنت سے دُھن تیار کرنے کا کام شروع کیا اور ساتھ ساتھ ترانے کے بول لکھنے کی کاوش بھی جاری رکھی۔ ملک کے ممتاز شاعروں اور موسیقاروں نے کمیٹی کو 723 ترانے اور دُھنیں ارسال کیں، جنہیں عبدالواحد خاں رُشدی جمع کرتے رہے۔ 1950ء میں شاہِ ایران پاکستان کا دورہ کرنے والے تھے، تو ترانہ کمیٹی پر زور دیا گیا کہ وہ اپنا کام جلد مکمل کرے تاکہ شاہِ ایران کا استقبال پاکستان کا قومی ترانہ بجا کر کیا جائے۔ کمیٹی نے کام تیز کر دیا اور اسی سال مارچ میں حکومت کو بہت سے ترانے اور دُھنیں موصول ہوگئیں۔ ان میں جناب احمد جی چھاگلہ کی دُھن کا انتخاب ہُوا۔ بعض ارکانِ کمیٹی نے تجویز دی کہ دوسرے لوگوں کو بھی مواقع فراہم کرنے چاہئیں، لیکن ترانہ کمیٹی کے صدر سردار عبدالرب نشتر نے یہ کام اُسی شام ختم کرنے کا حکم دیا اور شام تک جاری رہنے والے اجلاس میں یہ طے پا گیا کہ آئندہ اجلاس میں اب تک پیش کی گئی دُھنوں اور شاعری کو دوبارہ سنا جائے اور پھر فیصلہ کیا جائے۔ جناب زیڈ اے بخاری نے تجویز دی کہ جناب جوش ملیح آبادی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم اور جناب فیض احمد فیض سے بھی ترانے کے متعلق رابطہ کیا جائے۔ 23 اگست 1949ء کو کراچی میں ترانہ کمیٹی کا اجلاس ہُوا۔ صدارت پیرزادہ عبدالستار نے کی، کیونکہ ترانہ کمیٹی کے سابق صدر سردار عبدالرب نشتر کو پنجاب کا گورنر بنا دیا گیا تھا۔ اجلاس میں شاعری کے بجائے دُھن سُن کر ترانے کی منظوری کا فیصلہ کیا گیا۔ صدرِ کمیٹی نے فیصلہ دیا کہ دُھن تیار کرنے کے بعد مشہور شاعروں سے ترانے لکھوا کر اگلے اجلاس میں پیش کیے جائیں اور فائنل ترانے کا انتخاب بھی اسی اجلاس میں ہوگا۔ اگلے اجلاس میں کئی شاعروں نے اپنے ترانے پیش کیے۔ ان میں آرزو لکھنوی، حکیم احمد شجاع، زیڈ اے بخاری اور حفیظ جالندھری قابلِ ذکر تھے۔ اجلاس نے جناب حفیظ جالندھری کے ترانے کو پسند کر کے حتمی شکل دے دی۔ 21 اگست 1949ء کو حکومتِ پاکستان نے قومی ترانہ کمیٹی کے زیرِ اہتمام ریڈیو پاکستان اور احمد جی چھاگلہ کی بنائی ہوئی دُھن کو منظور کر لیا۔ یہ دُھن پاکستان نیوی کے بینڈ نے پی این ایس دلاور میں بنائی۔ وارنٹ آفیسر عبدالغفور اس کے بینڈ ماسٹر تھے۔ اس طرح پاکستان کی کلاسیکی موسیقی کا وجود عمل میں آیا۔ اس دُھن کو مدِّنظر رکھتے ہوئے جناب حفیظ جالندھری نے قومی ترانہ لکھا۔ اسے حکومتِ پاکستان نے جنوری 1954ء میں منظور کیا۔ 14 اگست 1954ء کو پاکستان کا قومی ترانہ پہلی بار جناب حفیظ جالندھری کی آواز میں ریڈیو پاکستان سے نشر کیا گیا۔ جناب حفیظ جالندھری نے قومی ترانہ لکھنے میں چھ ماہ لگائے، اس کے ایک ایک لفظ پر غور کیا۔ قومی ترانہ شاعری کی مخمّس شکل میں ہے۔ اس میں کُل پندرہ مصرعے ہیں۔ اسے ملک کے نامور گلوکاروں شمیم بانو، کوکب جہاں، رشیدہ بیگم، نجم آراء، نسیم شاہین، احمد رُشدی، زوار حسین، اختر عباس، غلام دستگیر، انور ظہیر اور اختر وصی علی کی آوازوں میں ریکارڈ کیا گیا۔ قومی ترانہ مرتّب کرنے میں 21 آلات اور 38 ساز استعمال کیے گئے۔ پورا قومی ترانہ بجنے میں ایک منٹ بیس سیکنڈ لگتے ہیں۔ پورے ترانے میں ''کا'' کے سِوا اُردو کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا گیا، باقی تمام الفاظ فارسی زبان کے ہیں۔ آج بھی برادر ملک ایران میں پاکستان کا قومی ترانہ بجایا جائے یا سُنائی دے، تو اہلِ ایران کی طمانیّت اور پاکستان سے وابستگی اور اپنائیت کا باعث بنتا ہے۔ 14 اگست 1955ء کو حکومتِ پاکستان نے جناب حفیظ جالندھری سے قومی ترانے کے حقوق خرید لئے۔ قومی ترانے کے آداب میں یہ امر شامل ہے کہ اگر کسی جگہ قومی ترانہ بج رہا ہو تو ہر پاکستانی شہری پر لازم ہے کہ وہ وہیں رُک جائے۔ سگریٹ پی رہا ہو تو سگریٹ پینا بند کر دے۔

خونِ شہیداں کا تقاضا

دنیا میں اگر کوئی قوم ایک نظریہ چھوڑ کر دوسرا نظریہ اپنا لیتی ہے، تو مسئلہ زیرِ بحث یہی رہ جائے گا کہ اس کا پہلا مسلک بہتر تھا یا دوسرا۔ یعنی نظریات کی تبدیلی کے ساتھ کسی ملک کی جغرافیائی حدود یا اس میں بسنے والوں کے قومی تشخص میں کوئی ردّوبدل نہیں ہوگا۔ مثلاً جن قوموں کی تشکیل میں تاریخی، نسلی، جغرافیائی اور لسانی عوامل کارفرما ہوتے ہیں، انہیں کوئی حادثہ اپنے قومی تشخص سے محروم نہیں کرسکتا۔ جرمن، انگریز، فرانسیسی، امریکی، روسی، چینی یا جاپانی کوئی سا نظامِ حیات قبول کریں یا اسے ترک کر دیں، وہ ہر صورت میں جرمن، انگریز، فرانسیسی، امریکی، روسی اور چینی و جاپانی ہی رہیں گے۔ اگر انہیں شکست کھا کر میدانِ جنگ سے پیچھے ہٹنا پڑے، تو ان کی پسپائی ان کی قومیت کی حد تک پہنچ کر ختم ہو جائے گی یعنی قومیت وہ مورچہ ہوگی جو اُن کے لئے آخری حصار کا کام دے گی۔ وہ اگر حکمران بن جائیں تو اُن کی قومیت نہیں بدلتی اور اگر غلام یا محکوم بن جائیں تو بھی اس امید پر زندہ رہتے ہیں کہ ان کا قومی تشخص انہیں دوبارہ متحد اور منظّم کر دے گا اور ان کی غلامی کی زنجیریں کٹ جائیں گی۔

پاکستان اس قسم کی قومی یا نسلی ریاستوں سے قطعاً مختلف ہے۔ یہاں کسی بنی بنائی قوم نے کوئی نیا نظریۂ حیات نہیں اپنایا بلکہ یہاں ایک نظریئے کے طفیل مُلک معرضِ وجود میں آیا اور اسی کی بدولت ہم ایک قوم ہیں۔ وہ نظریہ یہ ہے کہ مسلمان متحدہ ہندوستانی قومیت کا ایک حصہ نہیں، بلکہ اپنے دین، اپنی تہذیب و تمدن، اپنی اخلاقی اور روحانی قدروں کے لحاظ سے ایک علیحدہ قوم ہیں، اس لئے انہیں زندہ رہنے اور پنپنے کے لئے ایک علیحدہ وطن کی ضرورت ہے۔

نئی نسل کو شاید یہ بات عجیب محسوس ہو کہ پاکستان ہندوستان کے دو حصوں یعنی مشرقی بنگال اور شمال مغرب کے صوبوں میں قائم ہو رہا تھا، لیکن اس کے لئے زیادہ جوش و خروش اُن صوبوں کے مسلمانوں میں پایا جاتا تھا جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔ دوسرے لفظوں میں جنہیں بخوبی علم تھا کہ ان کے علاقے پاکستان میں شامل نہیں ہوسکیں گے، اسلام کی خاطر الگ وطن حاصل کرنے کے لئے کوئی بھی قربانی دینے کو تیار تھے۔ انہیں اپنے مستقبل سے کہیں زیادہ اسلام کا مستقبل عزیز تھا۔ ان کی نسلیں جُدا جُدا تھیں، ان کے رنگ مختلف تھے اور وہ ایک دوسرے کی بولیوں سے بھی ناواقف تھے۔ صرف اردو زبان ایک ذریعہ تھا جس کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں وہ ایک دوسرے سے ہم کلام ہو سکتے تھے۔ اس کے باوجود ان کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا: ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ!''۔ مسلمانوں کے اجتماعی ولولے کا یہ عالَم تھا کہ ایک عام آدمی جسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ پاکستان کا محلِ وقوع کیا ہے، پاکستان کے لئے اپنا گھر بار لُٹانے کے لئے تیار تھا۔ پاکستان کی ضرورت کا احساس اس اجتماعی ولولے کی بیداری تھی جو صدیوں سے ان کے سینوں میں سو رہا تھا۔ وہ خطرات سے بے پروا ہو گئے تھے۔ انہوں نے غلامی کی ذلت کے ادوار بھی دیکھے تھے لیکن جو خطرہ ان کے دین کو پیش آ رہا تھا، وہ بالکل نیا تھا۔

ہندو اکثریت کی غلامی کا مطلب ان کے نزدیک سماج کا وہ قابلِ نفرت حصہ بن جانا تھا جس میں ان کی حیثیت پرانے اچھوتوں سے بھی بدتر ہو جانا تھی۔

اگر ہم ایک فرض شناس اور سعادت مند قوم ہیں تو پاکستان کی نظریاتی اساس کو سمجھنا' قیامِ پاکستان کے لئے دی گئی قربانیوں کو یاد رکھنا اور اپنی موجودہ اور آئندہ نسلوں کو ان ذمہ داریوں سے آگاہ کرنا ہماری وہ اوّلیں ذمہ داری ہے جو ایک نظریاتی ریاست کے باشندوں پر عائد ہوتی ہے۔ نظریاتی ریاستیں اپنے جہد و عمل' اپنی ہمہ وقت بیداری' اپنے عمل اور حرکت کے باعث زندہ رہتی ہیں۔ اپنی نظریاتی اساس کے بارے میں ان کا روّیہ مدافعانہ نہیں ہوتا۔ وہ یا تو اپنے عمل و حرکت کی بدولت بڑھتی پھولتی ہیں یا اپنی بے راہ روی اور بے حسی کے باعث برباد ہو جاتی ہیں۔ قومی یا نسلی ریاستوں کے محافظ اگر کسی ایک محاذ سے پسپا ہو جائیں تو وہ کسی دوسرے محاذ پر فتح کی توقع رکھ سکتے ہیں لیکن نظریاتی ریاستوں کے لئے پسپائی کے بعد کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ ان کے دانشور' مفکر' شاعر اور ادیب جو پیغام دیتے ہیں' وہ قوم کی نظریاتی حدود سے باہر نہیں ہوتا۔ ان کے رہنماؤں کی پہلی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ قوم کی زندگی اور توانائی کے نظریاتی سرچشمے کو گرد آلود نہ ہونے دیں اور ناپختہ ذہنوں کو کسی بیرونی آئیڈیالوجی کی یلغار سے بچائیں۔

نظریاتی ریاست کی مثال ایک دریا کی سی ہے جو پہاڑوں کی بلندیوں سے نکلتا ہے اور راستے کی آبشاروں' ندّیوں' نالوں اور جھیلوں یہاں تک کہ جوہڑوں کا پانی سمیٹتا ہُوا چلا جاتا ہے۔ قدرت نے اس کے بہاؤ میں یہ خوبی رکھی ہے کہ غلاظت سمٹ کر اس کے کناروں پر جمع ہو جاتی ہے اور اس کا پانی پاک ہوتا رہتا ہے۔ جب نظریاتی ریاست میں حرکت و عمل کی قوتیں کمزور ہو جاتی ہیں اور عوام کی نگاہوں سے اجتماعی نصب العین اوجھل ہو جاتا ہے تو دریا کسی ریگستان میں پہنچ کر بدبودار دلدلوں' جھیلوں اور جوہڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

1947ء میں پاکستان کے قیام کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم اندرونی اور بیرونی خطرات سے محفوظ ہو گئے۔ بے شک ہمیں وطن مل گیا تھا' لیکن قوم کی تعمیر کا کام باقی تھا اور قوم کی صحیح تعمیر اس نظریاتی اساس پر ہو سکتی تھی جو پاکستان کے قیام کا باعث تھا۔ ایک ایسا نصابِ تعلیم ہماری اوّلیں ضرورت تھا جو قوم کے بچوں اور جوانوں کو اسلامی نظریات کے سانچے میں ڈھال سکتا۔ یہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہ تھا' اگر 1948ء میں ہی پہلی جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک کا نصابِ تعلیم ہماری ملّی ضرورت کے تابع ہوتا تو چند سال کے اندر اندر قوم کا ہر جوان اقبالؒ کا شاہین نظر آتا اور یہاں پاکستان کے مخالفین یا بیرونی نظریات کے تاجروں کی منڈیاں قائم نہ ہوتیں۔ ہم ایک بیدار و متحرک قافلہ ہوتے اور ہماری گزرگاہ پر ان عناصر کو اکھاڑے جمانے کا موقع نہ ملتا جن کے ضابطۂ اخلاق میں قوم اور وطن کا کوئی رشتہ مقدّس نہیں ہوتا۔ اپنے نظامِ تعلیم کو کسی تاخیر کے بغیر اپنے نظریۂ حیات کے سانچے میں ڈھالنا اس لئے ضروری تھا کہ ہمارے ہمسایہ ممالک میں اسلام اور پاکستان کے خلاف سیاسی' نظریاتی اور فوجی جارحیت کا سیلاب تیزی سے اُٹھ رہا تھا۔ بیرونی نظریات کے تاجروں کے ایجنٹ مختلف سمتوں سے پاکستان کے نظریاتی قلعے میں نقب لگا رہے تھے' لیکن ہمارا نظامِ تعلیم وہی رہا جو انگریز ہمارے لئے چھوڑ گیا تھا۔ اس غفلت کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہماری کئی درسگاہیں بیرونی نظریات کے ایجنٹوں کی پناہ گاہیں بن گئیں اور وہ نظریۂ حیات جس کا تحفظ ہمارے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا' آہستہ آہستہ متنازعہ بننے لگا۔

تحریکِ پاکستان کے فیصلہ کُن مرحلوں میں متحدہ قومیت کا عفریت پوری ہولناکیوں کے ساتھ نمودار ہو چکا تھا' تو اسلام ہماری مدد کو آیا۔ ہم ایک

ہو گئے اور پاکستان بن گیا۔ قیامِ پاکستان کے اٹھارہ سال بعد ستمبر 1965ء میں بھارت نے پوری تیاریوں کے ساتھ پاکستان کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی تو ایک بار پھر اسلام ہی ہماری مدد کو آیا اور پاکستان کی سرحدوں پر اصحابِ فیل کی شکست و ذلت کی داستان دُہرائی گئی۔ پاکستان کی افواج اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے خود سے کئی گُنا بڑے دشمن کے سامنے آہنی دیوار بن گئیں۔ چند گھنٹے بعد دشمن کئی محاذوں پر اپنے زخم چاٹ رہا تھا۔ ہم آگ اور خون کے طوفان سے سرفراز ہو کر نکلے تھے۔ اس کے بعد رب العالمین کی بارگاہ میں تشکر اور احسان مندی کا تقاضا یہ تھا کہ ہم اس عہد کی ایک بار پھر تجدید کرتے جو ہم نے 1940ء میں پاکستان کو اپنی منزلِ مقصود قرار دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے سامنے کیا تھا۔ ہم ان گناہوں سے توبہ کرتے جو ماضی میں ہم سے سرزد ہوئے تھے۔ ہم نظریۂ پاکستان کے ان مخالفین سے نجات حاصل کرتے جنہوں نے ہمارے تعلیمی اور ابلاغ کے اداروں کو اپنا مورچہ بنا لیا تھا۔ جو لوگ پاکستان کے بیرونی دشمنوں کے طریقِ کار سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے تھے، انہیں اس بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہونی چاہئے تھی کہ پاکستان کی بقا کی جنگ ختم ہو چکی یا ہم ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو چکے ہیں جو ایک نظریاتی مملکت کے محافظ اور پاسبان ہونے کی حیثیت سے ہم پر عائد ہیں۔ جنگِ ستمبر میں ہم نے بھارت اور اس کے بیرونی سرپرستوں کو یہ احساس دلایا تھا کہ جب مسلمان اسلام کے نام پر جمع ہوتے ہیں تو وہ گئی گزری حالت میں بھی ایک ناقابلِ تسخیر قوت بن جاتے ہیں۔ ہمیں یہ سمجھنے کے لئے بہت زیادہ عقل کی ضرورت نہ تھی کہ اسلام دشمن قوتیں نئے ہتھیاروں کے ساتھ ہم پر حملہ کریں گی۔ ان کا طریقِ کار بدل جائے گا لیکن عزائم میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ بھارت کے اشارے پر انہی عناصر نے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں پُرفریب نعرے لگا کر

دہشتوں کی ہر طرف چھائی گھٹا ہے یا خدا
پُورے پاکستاں میں اِک آفت بپا ہے یا خدا

دستگیری امتِ محبوبؐ کی فرمایئے
گُلشنِ اسلام نرغے میں گھِرا ہے یا خدا

المدد! اے خالق و مالک! مدد فرمایئے
وقتِ نازک آج ہم پر آ پڑا ہے یا خدا

''مُلکِ پاکستان پر برسیں خدا کی رحمتیں''
دنیا بھر کے ہر مسلماں کی دعا ہے یا خدا

نظریے کے دشمنوں کو پھر شکستِ فاش ہو
اہلِ پاکستان کی یہ التجا ہے یا خُدا!

سادہ لوح عوام کو ساتھ ملایا اور بھارت کے لئے مطلوبہ حالات پیدا کر دیئے۔ بھارت نے روس کی مدد سے وار کیا اور 1971ء میں پاکستان کے دو ٹکڑے کر ڈالے۔

وہ قوم جس نے 1940ء میں پاکستان کو اپنی منزلِ مقصود قرار دیا تھا، جس نے 1947ء میں اپنے خون سے دنیا کے نقشے پر پاکستان کی حدود کی لکیریں کھینچی تھیں، جس کے بنگالیوں، پٹھانوں، سندھیوں، بلوچیوں اور پنجابیوں نے اپنے عزم و یقین اور اتحاد کی بدولت 1965ء میں بھارت کے عزائم کو خاک میں ملا دیا تھا، وہی قوم اپنے نظریاتی حصار سے باہر نکلنے کے بعد ایک خطرناک ذہنی انتشار میں مبتلا ہو گئی۔ پاکستان کی نظریاتی سرحدیں ٹوٹ جانے کے بعد اس کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت نہیں کی جا سکتی!

خدانخواستہ پاکستان قائم نہ ہوتا، تو یہ تو ممکن تھا کہ مسلمان رفتہ رفتہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی زندگی میں اپنے لئے تحفظات حاصل کر لیتے، لیکن حقیقی

معنوں میں اسلامی نظام کے قیام کے لئے مسلمانوں کے سامنے کوئی امکان باقی نہ رہتا اور ساتھ ہی عزت و وقار اور آزادی کی وہ قوت حاصل نہ ہوتی جو پاکستان کے قیام کے بعد حاصل ہوتی چلی گئی۔ اپنے بے مثال نظریۂ حیات سے عملاً محرومی ہمارے حقیقی دکھوں کا علاج نہیں ہے۔ ہمارا اصل مقصد اپنے نظریۂ حیات کے پیشِ نظر ایک باعزت اور آزاد زندگی کے حصول کے لئے اجتماعی نظام کی ترتیب و تشکیل ہے۔ اقتصادی، فنی اور تکنیکی ترقیاں تو اس اعلیٰ مقصد کی راہ میں خود بخود، منزل بہ منزل حاصل ہوتی چلی جاتی ہیں۔

ملت کے نوجوانوں کے لئے یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ جب تاریکی حد سے بڑھ جاتی ہے اور کسی طرف سے روشنی کی کرن دکھائی نہیں دیتی، تو اللہ تعالیٰ کا دین اسلام، پاکستان اور اہلِ پاکستان کی مدد کرتا ہے۔ اگر آپ جنگل میں رستہ بھول جائیں تو منزل تلاش کرنے کا طریقہ یہ نہیں کہ کبھی آپ ایک طرف، کبھی دوسری طرف نکل جائیں بلکہ طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے قدموں کے نشان تلاش کرتے ہوئے اسی جگہ پہنچ جائیں جہاں سے آپ نے سفر شروع کیا تھا یعنی جنگل میں داخل ہوئے تھے اور وہاں سے اپنا صحیح راستہ متعین کریں۔ 1947ء کے اندھیروں کے دوران اسلام کی روشنی میں ہم نے اپنی سلامتی کا راستہ دیکھا تھا اور آج بھی اسلام ہی ہمیں سلامتی کا یہ راستہ دکھا سکتا ہے۔ موجودہ دور کے اندھیرے جس قدر زیادہ ہیں، اسی قدر ہمیں روشنی کی ضرورت ہے اور اس روشنی کی ضرورت ہے جس میں کوئی قوم اپنے رستے کے اونچ نیچ دیکھتی ہے، اپنے نیک و بد کو پہنچانتی ہے اور اپنے نظریاتی حصار میں نقب لگانے والے چوروں اور ڈاکوؤں پر نظر رکھتی ہے۔

وقت شاہراہِ حیات پر دوڑتے ہوئے قافلوں کا ساتھ دیتا ہے، اونگھنے اور سونے والوں کا انتظار نہیں کرتا۔ ہمارے دشمن اپنی جنگ اپنے ملک کی سرحدوں سے سینکڑوں اور ہزاروں میل دُور جا کر لڑتے ہیں۔ ان کے ابلاغ کے تمام وسائل اپنے نظریات پھیلانے میں مصروف ہیں۔ ان کے اپنے نظامِ تعلیم اور ادب میں ان کی ریاست کے بنیادی ڈھانچے کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا جا سکتا۔ حالانکہ کوئی آئیڈیالوجی ان کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں۔ بدقسمتی سے ہم ان کے کئی کارندوں کو اپنے ان تمام اداروں کے اندر لے آئے ہیں جو قومی سرمائے سے چلتے ہیں۔ ہمارے بہت سے دانشور قوم کے وہ پہرے دار نہیں، جو ڈاکوؤں کو گھر کی چار دیواری سے باہر روکتے ہوں بلکہ یہ لوگ نظریاتی ڈاکوؤں کے لئے دروازے کھول کر انہیں دعوت دیتے ہیں کہ آؤ! اطمینان سے بیٹھو اور چوری کرنے یا چوری نہ کرنے کے متعلق ہمارے ساتھ معاملہ کرو۔ پاکستان کے بگڑتے ہوئے دانشوروں کو ایک نظریاتی ریاست کی ضرورت کا احساس دلانا ہمارے لئے پسند یا ناپسند کا مسئلہ نہیں، یہ ہمارے لئے موت و حیات کا مسئلہ ہے۔ یہ وہ اخلاقی ذمہ داری ہے جس سے فرار کا ہر راستہ ہلاکت اور تباہی کی طرف جاتا ہے۔ یہاں دانشور بھارتی سرمائے سے اور اکثر پاکستانی وسائل سے پاکستان کے عالی شان ہوٹلوں میں سیمینار کراتے ہیں جن میں دوقومی نظریئے کے متعلق بدزبانی کی جاتی ہے، پاکستان اور بھارت کے درمیان سرحدوں کو ختم کر دینے اور پاکستان کو بھارت میں مِلا دینے کی سفارش کی جاتی ہے۔ اپنی آزادی کے لئے بھارت سے مصروفِ پیکار مجاہدینِ کشمیر کو دہشت گرد قرار دیا جاتا ہے۔ پاکستان کے دفاع پر اٹھنے والے ناگزیر اخراجات کو موضوعِ بحث بنا کر دفاعی نظام کے خلاف غیرت شکن تقریریں ہوتی ہیں۔ ایٹمی پروگرام کے خلاف جلوس نکالے جاتے اور علامتی قبریں بنائی جاتی ہیں۔ دفاعی اداروں کے خلاف بے لگام مہم اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ مشرقی پاکستان میں بھی یہی تو ہُوا تھا— جس کا نتیجہ ہم نے دیکھ لیا!

قیامِ پاکستان ضروری تھا

سیّد حسنین کاظمی

ہادیٔ برحق حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلی اور مثالی مملکت کے قیام کے لئے مدینے کے یہودیوں سے ایک معاہدہ کیا تھا۔ اس معاہدے کی رُو سے یہودیوں کو تمام مراعات اور مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی لیکن جو اجتماعی نظام قائم ہُوا' اس کی سربراہی حضرت محمد مصطفیٰ ؐ فرما رہے تھے اور تعداد میں کمی کے باوجود اس مملکت میں اسلامی اصولوں کے مطابق نظامِ حکومت قائم کرنے کے لئے مسلمانوں کو غلبہ حاصل تھا۔

برِصغیر میں بھی اگر ایسی ہی کوئی صورت پیدا ہوجاتی اور اس کی اکثریت اسلام کے عدلِ اجتماعی کا قیام قبول کرلیتی' تو اس صورت میں پاکستان کے قیام کی کوئی ضرورت باقی نہ رہتی' یہاں ایسا ہونا کسی صورت میں بھی ممکن نظر نہیں آرہا تھا' اس لئے مسلمانوں کو من حیثُ القوم اپنے لئے ایک الگ اور آزاد مملکت کے قیام کا مطالبہ کرنا پڑا۔ انگریزوں کے دَورِ حکومت میں ہندوستان کی دوسری اور تعداد میں بڑی ہندو قوم کی نسل در نسل جس انداز پر تربیت کی گئی تھی' اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تعصب کا بڑا تلخ مظاہرہ کانگریس کی آزادی سے قبل کی قیادت کے مختصر دورِ حکومت میں سامنے آیا تھا۔ اس کے پیشِ نظر ہندوؤں کی قیادت سے کسی کُشادہ دلی اور وسیع النظری کی توقع لاحاصل تھی۔ ہندو اگر اپنی ذہنیت سے تعصب دُور کر لیتے تو بھی زیادہ سے زیادہ یہ ہوجاتا کہ مسلمانوں کی حق تلفیوں کے اندیشے کم ہوجاتے۔ برِصغیر میں اسلامی نظامِ حکومت کے قیام کی کوششیں متحدہ ہندوستان میں بہرحال ممکن نہیں تھیں۔

قیامِ پاکستان کا مقصد بلاشبہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ تھا اور سیاسی' اقتصادی' سماجی اور عقائد کے حقوق کا تحفظ بھی' لیکن ان حقوق کا تحفظ قیامِ پاکستان کا مقصدِ آخر نہیں تھا۔ قائدِاعظمؒ نے 8 مارچ 44ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے اس سوال کا مختصر لیکن مکمل جواب دیا تھا۔ جو آج اس گفتگو کا موضوع ہے یعنی یہ کہ پاکستان بنانا کیوں ضروری تھا۔ قائدِاعظمؒ نے کہا تھا:

> آپ نے غور فرمایا کہ قیامِ پاکستان کے مطالبے کا جذبۂ محرکہ کیا تھا۔ مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کی وجۂ جواز کیا تھی؟ تقسیمِ ہند کے مطالبے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی اصل وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے' نہ انگریزوں کی چال۔ درحقیقت برِصغیر میں مسلمانوں کی ایک آزاد مملکت کا قیام خود اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے...

جب بھی ہمارے ذہنوں میں یہ سوال آئے کہ پاکستان بنانا کیوں ضروری تھا؟ تو ہمیں واضح طور پر' بالکل غیر مبہم طور پر اس کا صرف یہی اور اتنا جواب دینا ہے کہ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے۔ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ اس لئے ہے کہ اسلام دنیا میں فکر و نظر کے کسی بھی انداز کے مقابلے میں کبھی بھی ثانوی یا ذیلی حیثیت اختیار کر ہی نہیں سکتا۔ آزاد فضا میں اپنے

نظریۂ حیات کے مطابق ایک نظامِ عدلِ اجتماعی کے بغیر ہمارے ایمان کے تقاضے ہی پورے نہیں ہوتے تو پھر یہ بھلا کیسے ممکن تھا کہ ایک آزاد خطۂ ارض کے قیام کا امکان ہمیں نظر آ جاتا اور پھر بھی ہم مصلحت کے تحت اس سے کم تر کسی مقصد کے حصول پر مطمئن ہو جاتے؟

اسلام ایک زندہ، متحرک اور توانا نظریۂ زندگی ہے۔ اسلام انسانوں کی سماجی زندگی کی لئے قوانینِ قدرت کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو اجتماعی امن، فلاح اور شخصی حریّت اور استحکام کا ضامن ہے۔ اسلام محض ایک نظریہ نہیں، ایک عملی حقیقت بھی ہے۔ گزشتہ چودہ سو سال میں انسان کی فکری، علمی اور تہذیبی تاریخ کو اسلام سے زیادہ فعال اور مثبت انداز میں کسی بھی دوسرے نظریۂ زندگی نے متاثر نہیں کیا۔ یہ سرچشمہ ابھی خشک نہیں ہُوا بلکہ ایک رواں ندی کی طرح انسان کے تمام تعمیری اور مثبت رجحانات اور افکار کو اب بھی سیراب کر رہا ہے۔

اسلام کی تاریخ اور مسلمانوں کی تاریخ کے درمیان ایک فرق ہے۔ گزشتہ چودہ سو برس میں انسانیت نے جتنا بھی فروغ پایا ہے، قانون کو انسانی معاشرے میں جتنی بالادستی حاصل ہوئی ہے اور انسانیت کی فلاح، اتحاد اور باہمی رواداری کی راہیں جتنی بھی کشادہ ہوئی ہیں، ان کی تاریخ ہی حقیقت میں اسلام کی تاریخ ہے۔ مایوسی، انتشار، کمزوری اور زوال مسلمانوں کی تاریخ میں آیا ہے، اسلام کی تاریخ میں نہیں آیا۔ جہاں تک زوال کا تعلق ہے، تو اس کی بڑی وجہ ہماری بے علمی اور بے عملی، اپنی سماجی زندگی میں اسلامی اصولوں کی غیر مؤثر اور غیر تخلیقی انداز کی تعبیرات اور ان کے اطلاق کی کوششیں ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے ہماری صدیوں کی تاریخ ہمارے لئے رہنمائی کے بجائے ذہنی اور عملی انتشار کا سبب بن گئی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ دنیا کی دوسری قوموں اور ہمارے درمیان ایک بنیادی فرق اس کسوٹی اور اس معیار کا ہے، جس پر قومیں اپنی ترقی یا زوال و انحطاط کو پرکھتی ہیں۔ دوسری قوموں اور ہمارے درمیان معیار کا یہ فرق اس وجہ سے ہے کہ ہمارے سامنے جو ایک تاریخی اور حقیقی نمونۂ عمل ہے، وہی ہمارا آئیڈیل بھی ہے۔ رسالت و خلافت کا دور تاریخ کے ایک خاص زمانے کا واقعہ بھی ہے اور اسی کے ساتھ ہر دور میں انسانوں کے لئے معاشرتی زندگی کی فلاحی تشکیل کا معیار بھی۔ دنیا کی دوسری قوموں کو اپنی تاریخ میں کوئی ایسا آئیڈیل میّسر نہیں لہٰذا فکری، علمی، فنی اور تکنیکی ترقی کی راہ میں اُٹھنے والا اُن کا ہر قدم اُن کے لئے ترقی کی علامت ہے مگر ہمارے ساتھ معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اگر ہماری علمی اور فنی خامیاں دُور ہو جائیں اور ہم ترقی یافتہ قوموں کے نزدیک بھی پہنچ جائیں تو اپنے معیار اور اپنی ترقی کی پرکھ کے لئے ہمارا معیار اور ہماری کسوٹی دوسروں سے مختلف ہوگی۔ ہم جب بھی اپنی ترقی کو اپنے آئیڈیل کے مقابلے پر لائیں گے، ہمیں اپنے اندر کمی محسوس ہوگی۔

قیامِ پاکستان کی حقیقت کو اس پس منظر میں دیکھا جائے تو اُس موضوع پر اظہارِ خیال میں آسانی ہو جائے گی جو اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے یعنی ''پاکستان بنانا کیوں ضروری تھا؟''

یہ سوال اس لئے بھی ذہنوں میں اُبھرتا ہے کہ ہم ان مقاصد سے قریب تر نہیں ہوئے ہیں جو حقیقی معنوں میں قیامِ پاکستان کے مطالبے میں کارفرما تھے۔ ہم نے اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام کے لئے پاکستان بنایا تھا، لیکن اُس وقت دنیا میں اس کی کوئی عملی مثال ہمارے سامنے نہیں تھی۔ معاملہ مشکل تر اس لئے بنا کہ ہم نے جو مقصد اپنے سامنے رکھا تھا، دورِ حاضر میں اس کی عملی مثال بھی ہمیں پیش کرنا تھی۔

علامہ اقبالؒ نے روحِ مسلماں میں جس اضطراب کی جانب اشارہ کیا تھا، اس کا عالمگیر اظہار قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی شروع ہو گیا۔ پاکستان میں ہم اپنی بے عملی اور بداعمالیوں کی وجہ سے اپنے حقیقی مقاصد سے کتنے ہی

دُور کیوں نہ چلے گئے ہوں‘ قیامِ پاکستان سے ساری دنیا کے مسلمانوں میں بیداری کی لہر پیدا ہوگئی۔ قیامِ پاکستان کے وقت دنیا میں حقیقی معنوں میں مسلمانوں کی آزاد مملکتوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ دنیا کے مختلف علاقوں کے مسلمان انگریزوں‘ فرانسیسیوں اور ولندیزیوں کے زیرِ اثر زندگی بسر کر رہے تھے۔ جو مسلمان مملکتیں آزاد کہی جاتی تھیں‘ وہاں بادشاہتیں قائم تھیں۔ مغرب کے تصورِ قومیّت نے بھی مسلمانوں میں رشتۂ اخوت کو بہت حد تک غیر مؤثر بنا دیا تھا۔ خلافت جو مسلمانوں کی وحدت کی علامت تھی‘ خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں ختم ہو چکی تھی اور وہ قوتیں جنہوں نے اپنے وجود کا مقصد ہی اسلام دشمنی قرار دے لیا‘ بہت مطمئن تھیں کہ مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا ہونے کے آثار دُور دُور تک نظر نہیں آ رہے۔

عالمِ اسلام کی عبرت ناک کسمپرسی کے دور میں برِصغیر کے مسلمانوں نے اپنی جداگانہ قومیت کی بنیاد پر اپنے لئے ایک آزاد مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ مطالبہ پوری سنجیدگی اختیار کر گیا۔ اس وقت برِصغیر میں مسلمانوں کی تعداد نو دس کروڑ تھی۔ اتنی بڑی تعداد کے سنجیدہ مطالبے کو نظر انداز کرنا نہ انگریزوں کے لئے ممکن رہا‘ نہ ہندو کے لئے۔ انگریزوں نے بہرحال آخری وقت تک یہ کوشش کی کہ پاکستان قائم نہ ہو‘ یا اُن بنیادوں پر قائم نہ ہو جن پر قائم کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا تھا یعنی اسلام کے نام پر۔ اسلام کا نام انگریز کی بین الاقوامی حکمتِ عملی کے لئے شدید مخالفانہ ردِعمل کا باعث ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی شکست اور زخم خوردگی اس کے لئے باعثِ مسرت ہوتی ہے۔ اس کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ پہلی جنگِ عظیم میں سلطنتِ عثمانیہ کی شکست کے بعد جب انگریز جنرل ایلن بی کے لئے بیت المقدس کی فتح پر انعام کی تجویز کی گئی تو خود برطانوی وزیرِاعظم لائڈ جارج نے اس فتح کو آخری صلیبی جنگ اور سب

> برِصغیر کے مسلمانوں نے عالمِ اسلام کی حیاتِ نَو میں کیا کردار ادا کیا؟ اس کا تھوڑا سا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے جو مولانا محمد علی جوہرؒ نے ایک تقریر میں بتائی تھی۔ انہوں نے کہا: ''رؤف بے‘ جو صلح لوزاں کے وقت ترکیہ کے وزیرِاعظم تھے‘ نے مسلمانانِ برِصغیر کے وفد کے ایک رُکن ڈاکٹر انصاری سے کہا کہ اس صلح نامے پر دستخط سے پہلے ہمیں کئی بار مایوسیوں کے ایسے مرحلوں سے گزرنا پڑا کہ جی چاہتا تھا کہ مغربی طاقتیں جو شرائط بھی رکھیں‘ ہم اُن کو مان لیں‘ لیکن پھر ہمیں خیال آتا تھا کہ ہم ہندوستان کے مسلمانوں کو کیا منہ دکھائیں گے جنہوں نے ہماری خاطر کتنی بڑی مصیبتیں برداشت کی ہیں...
>
> —— مسلمانانِ برِّصغیر: ڈاکٹر منیرالدین چغتائی

سے زیادہ فاتحانہ جنگ قرار دیا۔ لہٰذا ہم میں سے کسی کا بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہونا یا دوسروں کو مبتلا کرنا کہ پاکستان انگریزوں نے مسلمانوں کو تحفے کے طور پر پیش کر دیا‘ بہت بڑی بے عقلی کی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریز سیاست دانوں کو قیامِ پاکستان سے چند خطرات لاحق تھے‘ اسی لئے وہ اُن بنیادوں پر اس کا قیام قبول کرنا نہیں چاہتے تھے جن بنیادوں پر اس کے قیام کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ انگریزوں کو ہندوستان کی جغرافیائی وحدت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کے سیاسی اور اقتصادی مفادات کا تقاضا ہوتا تو وہ ہندوستان کے ایک نہیں‘ دس ٹکڑے کر دیتے لیکن انہیں اسلام کے نام اور مسلمانوں کے اتحاد کے تصور سے مستقل دشمنی ہے۔ سلطنتِ عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد اسرائیلی حکومت کے قیام سے ان کے ان منصوبوں کو تقویت پہنچتی تھی۔ پاکستان کا قیام ان کے اس عالمی منصوبے سے مطابقت نہیں رکھتا تھا‘ بلکہ اس کے برعکس تھا۔

انتخابات کے ذریعے برِصغیر کے مسلمانوں کے سب سے واضح اور غیر مبہم فیصلے کے باوجود 1947ء میں ماؤنٹ بیٹن جب برِصغیر کا آخری وائسرائے

بن کر آیا تو حکومتِ برطانیہ نے اُسے جو سرکاری حکم نامہ دیا تھا' اس میں صاف طور پر تحریر تھا کہ برِصغیر کی وحدت برقرار رکھی جائے۔ پھر جب انگریز اہلِ سیاست کو یقین ہو گیا کہ قیامِ پاکستان کی راہ نہیں روکی جا سکتی تو انہوں نے ایک جانب دستوری حد تک تو یہ بات تسلیم کر لی کہ پاکستان بن جائے لیکن دوسری جانب عملاً کوئی ایسی دشواری نہ چھوڑی جس کا قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی مسلمانوں کو سامنا نہ کرنا پڑے۔ ایک نئی مملکت کو عدم سے وجود میں لانے کے لئے صرف 76 دنوں کی مہلت دی گئی۔ پھر باؤنڈری کمیشن کے فیصلے میں ماؤنٹ بیٹن نے دخل اندازی کی' لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے پاکستان قائم ہونا تھا اور قائم ہو گیا۔

قیامِ پاکستان سے آج تک عالَمِ اسلام علمی اور عملی' دونوں میدانوں میں بڑی اہم تبدیلیوں سے دوچار ہُوا ہے۔ دنیا میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً 150 کروڑ ہے۔ ان کے 58 آزاد ممالک ہیں۔ رُوئے زمین کی ساری معدنی دولتیں مسلمانوں کو میسّر ہیں' ان کے پاس بے مثال افرادی صلاحیت ہے۔ ان سب سے بڑھ کر ان کے ایمان میں جو بے پناہ امکانی قوت اتحاد موجود ہے' اس سے وہ تمام طاقتیں خائف ہیں جو اسلام کو اپنے توسیع پسندانہ مقاصد میں حائل اور اپنے نظریات کا حریف سمجھتی ہیں۔

بلاشبہ اس وقت یہ طاقتیں مسلمانوں سے کہیں زیادہ قوت اور علمی' فنی اور تکنیکی برتری کی حامل ہیں اور مسلمان مختلف وجوہ کی بناء پر ان ہی طاقتوں کے آگے دستِ سوال دراز کرتے رہتے ہیں' لیکن یہی وہ دور بھی ہے جس میں خود مسلمان ملکوں میں نہایت تیز رَو' غیر متوقع' حیرت انگیز اور نتیجہ خیز تبدیلیاں بھی یکے بعد دیگرے سامنے آتی چلی جا رہی ہیں۔ بادشاہوں کا دور ختم ہو رہا ہے۔ سرمایہ پرستی اپنے خوفناک اور عبرت انگیز نتائج کے ساتھ اپنے انجام کو پہنچ رہی ہے۔ فکری آزادی کی لہریں بڑی تیزی سے پورے عالَمِ اسلام میں پھیلتی چلی جا رہی ہیں۔ بڑے بڑے جابر' مضبوط تخت والوں کو زمین پر پٹخ کر نشانِ عبرت بنا دیا گیا' مسلمان اہلِ علم پر یہ حقیقت ایک بار پھر واضح ہو رہی ہے کہ اسلام کا نظام' جمود یا روایت پرستی کے برعکس کائنات کا زندہ اور متحرک تصور پیش کرتا ہے اور یہ کہ اجتماعی عدل اور احسان اسلامی نظام کی بنیادیں ہیں اور اس عدل میں معاشرت' معیشت اور سیاست سب شامل ہے۔ علامہ اقبالؒ نے طلوعِ اسلام میں کہا:

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

مغرب سے اٹھنے والے طوفان اور زندگی کے بنیادی تقاضۂ انقلاب' دونوں کی وجہ سے عالَمِ اسلام اس وقت اسی کرب سے گزر رہا ہے جو قوموں کو خود شناسی کی دولت سے مالا مال کر کے حیاتِ نو کی برکتوں سے آگاہ کرتا ہے۔ عالَمِ اسلام کی اس طوفان خیز کیفیت میں' جو ساری انسانیّت کی تعمیر اور تہذیب کی پیامبر بن سکتی ہے' برِصغیر کے مسلمانوں کا کردار بڑا کلیدی رہا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے 65 سال قبل اپنی فکر وعمل کی کرامت نما تمثیل سے ساری دنیا کے مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور دنیا کو احساس دلا دیا تھا کہ مسلمان عمل پر راغب ہو جائے تو کیا کچھ کر سکتا ہے۔

پاکستان کی موجودہ حالت نے پوری قوم کو اور ان تمام افراد کو جو اس قوم کی قیادت کے منصب کا دعویٰ کرتے یا اس کے اُمیدوار ہیں' ایک بڑے قابلِ قبول چیلنج کے مقابل کر دیا ہے۔ جو بھی اس چیلنج کا مقابلہ کر کے قوم کو ''ایمان' اتحاد' تنظیم'' کا سبق یاد دلا کر خود کو ایمانداری' فرض شناسی اور عزت ووقار کی تصویر بنا کر راہِ عمل پر لگا دے گا' اس کا شمار پاکستان ہی کے نہیں' عالَمِ اسلام اور عالَمِ انسانیت کے محسنوں میں ہوگا کیونکہ دورِ حاضر کے انسانی مسائل کا حل اسلام کے علاوہ کسی نظریۂ زندگی میں موجود نہیں۔ ہمیں بھی دنیا پر یہ ثابت کرنا ہے کہ ہمارا خطۂ ارض اس نظام کے لئے سازگار ہے اور اسی لئے پاکستان بنانا ضروری تھا۔

سایۂ خدائے ذُوالجلال

محمّد صادق لالۂ صحرائی

ہر دور میں ایسی ہیبت ناک سیاسی وعسکری قوتوں کا غلبہ ودبدبہ خطہ ہائے زمین پر قائم رہا ہے، جنہیں آج سُپر پاورز سے موسوم کیا جاتا ہے۔ان طاقتوں کی مرضی اوراعانت کے بغیر مشکل ہی سے دنیا کے سیاسی احوال میں کبھی کوئی تبدیلی آتی ہے۔ اسلام کی سیاسی قوت وشوکت کا مظہر- پاکستان - جب وجود میں آیا، تو اس وقت بھی دنیا میں سُپر پاورز موجود تھیں، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ پاکستان کی صورت میں عالمی جغرافیہ میں ایک بالکل نئے ملک کے وجود میں آجانے کی عظیم الشان سیاسی تحریک وتبدیلی میں دنیا کی کسی سُپر پاور نے کوئی اخلاقی، مادی یا سیاسی اعانت وتائید بہم نہ پہنچائی بلکہ اُلٹا قیامِ پاکستان کی راہ طرح طرح سے روکی۔

دوسری طرف خود برِصغیر میں بھی مسلمانانِ ہند کے سروں پر اُس وقت دوسُپر پاورز مسلّط تھیں۔ایک انگریز جس کے پاس حکمرانی کی قوت تھی اور بے انداز وسائل بھی۔ دوسری سُپر پاور ہندوقوم تھی جو اپنی افرادی قوت، تعلیم اورسرمایہ کے لحاظ سے مسلمانوں پر غلبہ اورفوقیت رکھتی تھی۔یہ دونوں سُپر پاورز قیامِ پاکستان کی کُھلی مخالف تھیں۔انگریز نے چونکہ ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی، لہٰذا اس کا مجرم ضمیر جذبۂ انتقام سے بھراہُوا تھااوروہ مختلف سیاسی داؤ پیچ لڑا کرتحریکِ پاکستان کوروکنے کی کوشش کررہا تھا۔ادھر ہندو جوانگریزوں کے بعد خود کو برصغیر کی اصل طاقت سمجھ رہے تھے اور مسلمانوں پر اپنی برتری کے نشے میں سرشار تھے، ایک لحظہ کے لئے بھی ہندوستان کی تقسیم کے لئے تیار نہ تھے۔

ان کے سب سے بڑے لیڈر گاندھی جی کا کہنا تھا: ''پاکستان کا قیام میری لاش ہی پر ممکن ہے۔جب تک مَیں زندہ ہُوں، نہ مَیں خود تقسیمِ ہند پر راضی ہوں گا، نہ کانگریس کو اسے قبول کرنے کی اجازت دوں گا۔''

گویا خارجی اور داخلی دونوں سمتوں کی تمام سُپر پاورز نہ تو قیامِ پاکستان کے حق میں تھیں، اورنہ اس کی حامی یا مددگار۔دنیا بھر کی سُپر پاورز کی تائید اوراعانت سے محرومی بلکہ ایک اعتبار سے ان کی زبردست مخالفت اورخود مسلمانانِ ہند کی مادی ساز وسامان سے مکمل محرومی کے باوجود محض سات سالہ جِدوجُہد کے نتیجے میں پاکستان وجود میں آ گیا۔

اِدھر اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی کے تحت مملکتِ پاکستان کو وجود ملا، اُدھر دشمنوں کے سینوں پر انگارے لَوٹنے لگے۔ان انگاروں کو عیّاری اور خودفریبی کے پانی سے اس طرح بجھانے کی کوشش کی گئی کہ انگریزوں نے مسلمانوں کو کٹا پھٹا پاکستان دیا اور ہندوؤں نے انگریزوں کی اس یقین دہانی پر یہ خودفریبی اختیار کی کہ یہ کٹا پھٹا پاکستان زیادہ دیر تک بھارت سے الگ نہیں رہ سکے گا۔ چنانچہ تقسیمِ ہند کے فوراً بعد گاندھی جی نے اپنی ایک پرارتھنا سبھا (مجلسِ عبادت) میں کہا: ''مسلم لیگ جلد ہی بھارت میں واپس آنے کے لئے کہے گی۔'' مولانا آزادؒ کے بقول سردار پٹیل نے اس یقین کا اظہار کیا: ''پاکستان زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکے گا، اور مسلم لیگ کو پاکستان کو سنبھالتے وقت ایسا سبق ملے گا جو وہ کبھی نہیں بھُلا سکے گی۔'' وی۔پی مینن نے قیامِ پاکستان

کے فوراً بعد بڑے وثوق سے کہا: ''ہمارا ملک دراصل متّحد ہونے کے لئے تقسیم ہُوا ہے۔''

انہی انتقامی عزائم کو دیکھتے ہوئے قائدِاعظمؒ نے یکم نومبر 1947ء کو انگریزوں کے نمائندہ گورنر ماؤنٹ بیٹن سے واشگاف انداز میں کہا تھا کہ ''مجھے بالکل صاف نظر آ رہا ہے کہ بھارت پاکستان کی پیدائش ہی پر اس کا گلا دبا کر اسے موت کی نیند سُلا دینا چاہتا ہے''۔ قائدِاعظمؒ کا یہ ارشاد مبنی برحقیقت تھا۔ انگریزوں نے اس موقع پر پاکستان کو نہ تو اس کے حصے کا اسلحہ دیا' نہ روپیہ اور نہ کوئی اور اثاثہ یا ساز وسامان۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے بعد انگریز نے پاکستان سے الحاق کرنے اور الحاق کا حق رکھنے والے علاقوں یعنی کشمیر' جُونا گڑھ اور مناور پر غاصبانہ قبضہ جمانے کے لئے بھارت کی پوری پوری امداد کی۔ پھر پاکستان کے حصے میں آنے والے نہری پانی کو بھی انگریزوں نے بھارت کے قبضے میں دے دیا۔ ہندوؤں نے سکھوں کو بھڑکا کر مسلمانوں کو وسیع پیمانے پر قتل وغارت کا نشانہ بنایا اور لاکھوں مسلمانوں کو ان کے صدیوں پرانے جمے جمائے گھروں سے جبراً کھدیڑ کر پاکستان کی نئی مگر بے سروساماں مملکت میں دھکیل دیا۔ اس طرح پاکستان کو دنیا میں آنکھیں کھولتے ہی سخت ترین آزمائش سے دوچار کر دیا گیا۔

پاکستان کے دشمن اسے اس روح فرسا آزمائش میں مبتلا دیکھ کر مسرت سے سرشار ہو گئے اور پاکستان کے جلد خاتمے کی جو اُمیدیں انہوں نے دل میں قائم کر رکھی تھیں' وہ مزید روشن اور زیادہ واضح ہو گئیں۔ تاہم یہاں بھی قادرِ مطلق ہی کا اصل منصوبہ سامنے آیا' اہلِ پاکستان کے دلوں میں باہمی محبت' قربانی اور ایثار کا جذبہ اور ایسے اسباب وعوامل پیدا فرما دیئے کہ اس آزمائش کی مشکلات میں رفتہ رفتہ آسانی پیدا ہونے لگی۔

تقسیمِ ہند کے پلان کو بادلِ نخواستہ تسلیم کرتے ہوئے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی قرارداد میں کہا گیا تھا: ''ہمیں امید ہے کہ جب موجودہ جذبات سرد پڑ جائیں گے' تو ہندوستان میں دو قوموں کی موجودگی کا نظریہ خود بخود باطل اور غیر معتبر قرار دے دیا جائے گا۔''

خُدا کرے مِرے پیارے نبیؐ کے صَدقے میں
مِرے وطن کا یہ پرچم سَدا بلند رہے
کبھی نہ اس کے تقدّس پہ کوئی آنچ آئے
ہر ایک شخص حمیّت پہ کاربند رہے

خُدا کرے کہ بفیضِ حضورِ سرورؐ دیں
ہر ایک فَرد وفا کا شِعار بن کے رہے
ڈھلے کچھ ایسے وہ فِکر وعمل کے سانچے میں
بطرزِ خاص وطن کا وقار بن کے رہے

خُدا کرے مِری ارضِ وطن کا ہر ذرّہ
مثالِ مِہرِ جہاں تاب جگمگاتا رہے
خُدا کرے مِرے کوہ و دمن کا ہر منظر
اِسی ادائے تحمّل سے مُسکراتا رہے

مِرے عظیم وطن کے حَسین گُلشن میں
خُدا کرے کہ خزاں کا کبھی گُزر ہی نہ ہو
کچھ اس ادا سے بڑھے قافلہ بہاروں کا
کہ دُشمنانِ سرِراہ کو خبر ہی نہ ہو

ہر ایک غنچۂ شاداب لہلہائے سدا
اس آرزو سے مزّین صدا نکلتی ہے
کبھی زوال کی صورت نہ کوئی پَیدا ہو
بصدقِ دِل یہی ہر دَم دُعا نکلتی ہے

ـــــ یوسف شیدائی

اگر چہ پاکستان بفضلِ باری تعالیٰ اپنی زندگی کے ابتدائی کٹھن دور سے نکل گیا' تاہم پاکستان کو ختم کرنے کے جذبے نے بھارت کو آنے والے برسوں میں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ بھارت نے 6 ستمبر 1965ء کو پاکستان پر شب خون مارا اور اسے بھرپور اور مکمل جارحانہ جنگ کا نشانہ بنا ڈالا۔ پاکستان اپنی زندگی کی اس دوسری مگر سخت تر آزمائش سے دوچار ہُوا' تو رحمتِ خداوندی کی گھٹا ایک مرتبہ پھر اس سرزمین پر گھر کر آ گئی۔ پاکستان کے نظریاتی در و بام پر اس گھٹا نے موتی برسائے' ایثار و قربانی کے جذبوں نے وطنِ عزیز کے باسیوں کے دلوں میں باہمی محبت کا گُداز بھرا' غازیوں کے متوّر نعروں سے یہاں کی فضا چکا چوند ہوگئی۔ مجاہدین نے اس پاک خطے کی سرحدوں پر شہادت کے تروتازہ پھول کِھلائے۔ پاکستان سے دس گُنا زیادہ اسلحی طاقت رکھنے والے دشمن کو تین ہفتوں میں شکست سے دوچار کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ سُنت تازہ کر دی کہ وہ بعض اوقات ایک بڑے گروہ کو ایک مختصر گروہ سے شکست دلوا دیتا ہے۔ نیز اس حقیقت کو بھی ایک مرتبہ پھر سورج کی طرح زمانے کے سامنے عیاں کر دیا کہ:

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بُجھایا نہ جائے گا

پاکستان کو اس کی زندگی کی تیسری بڑی آزمائش 1971ء میں پیش آئی' جب اس کے دشمنوں نے ایک نئے منصوبے کے تحت خود اس کے اندر سے اس پر حملہ کیا۔ یعنی پہلے اندرونی حملہ آوروں کی کھیپ تیار کی' پھر اس کھیپ کو بھرپور انداز میں استعمال کر کے اس ملک کے دو ٹکڑے کر ڈالے یہ حادثہ بظاہر پاکستان کو نیم مُردہ کرنے کے لئے کافی تھا' لیکن اس شر سے بھی آخر کار خیر ہی پھوٹا' یعنی اس برِصغیر میں بنگلہ دیش کے رُوپ میں ایک اور پاکستان وجود میں آ گیا۔ بھارت کے لئے یک نہ شُد دو شُد والا مفہوم پیدا ہوگیا۔ اب اُسے دو پاکستانوں سے مقابلہ درپیش ہو گیا۔ یہ اِک عجب واقعہ ہُوا کہ اس خطے میں پہلا پاکستان ہندوؤں کی شدید مخالفت کے عالَم میں قائم ہوا' جب کہ دوسرا پاکستان عین اُن کی امداد کے ساتھ وجود میں آیا۔ بھارت نے پاکستان کا ایک بازو اس خیال کے ساتھ کاٹا تھا کہ اب پاکستان لُنجا ہو کر رہ جائے گا اور کٹا ہُوا بازو بھی خود ہی ایک روز گل سڑ جائے گا' لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھئے کہ اِدھر پاکستان کے کٹے ہوئے شانے پر ایٹم بم کا نیا بازو اُبھر آیا اور اُدھر اُس کا کٹا ہُوا بازو اپنی جگہ پنپ کر پھر اُمتِ مُسلمہ کے جسم کا حصہ بن گیا۔

جب دو عالمی جنگوں کے بالواسطہ اثرات سے دنیا بھر کے مسلمانوں کے دلوں اور دماغوں میں افسردگی اور مایوسی کے گہرے سائے چھا گئے اور ان کی قوتِ فکر اور قوتِ عمل' دونوں ہی کمزور ہوگئیں جس پر حکیم الامت علامہ اقبالؒ تک نے کہہ دیا:

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں' راکھ کا ڈھیر ہے

تو اسی آگ کو پھر فروزاں کرنے کی خاطر اللہ تعالیٰ نے مملکتِ پاکستان کی تشکیل فرمائی۔ پاکستان نے وجود میں آ کر ملکوں ملکوں پھیلے ہوئے مسلمانوں میں اعتماد کی لہر دوڑائی۔

بیرونی دشمنوں کے علاوہ پاکستان کے اندرونی دشمنوں کی ہر چال پاکستان کو زک پہنچانے کے لیے بظاہر طوفان کی طرح چلائی جاتی ہے' لیکن جلد ہی جھاگ کی مانند بیٹھ جاتی ہے۔

ان احوال و واقعات کی روشنی میں ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان عطیۂ باری تعالیٰ ہے۔ ہم جو بھی ہیں' جہاں بھی ہیں' جو کچھ بھی ہیں' اس نعمتِ خداوندی کا تحفظ' اور دیانتدارانہ خدمت ہمارا دینی فرض ہے۔

صُبحِ آزادی نے یارو! کیا ہمیں بخشا نہیں
اِس وطن کا کون سا تُحفہ ہے جو اپنا نہیں؟

برگ وگُل، سرو وسمن، دشت و دمن، گلزار و باغ
کہکشاں در کہکشاں، انجم بہ انجم یہ چراغ
یہ شرابِ نُور سے لبریز کِرنوں کے ایاغ

جس کے ہاتھوں میں چھلکتے ہیں محبت کے سبُو
جس کی مٹّی میں مہکتا ہے شہیدوں کا لہُو
جس کی خاموشی بھی کرتی ہے مسلسل گفتگو

ہاں سنو! یہ کہہ رہے ہیں دلبرانِ آرزُو
صَرفِ برگ وگُل ہُوا ہے لاکھ زخموں کا لہُو
دل ہُوئے ٹکڑے ہزاروں، تب ڈھلے ہیں یہ سبُو

جبر کی ارزانیاں تھیں، ظُلم کی بُہتات تھی
آگ کے بادل گھِرے تھے، خون کی بَرسات تھی
صُبحِ آزادی سے پہلے، سَو بَرَس کی رات تھی

صدقۂ خونِ شہیداں ہے یہ خاکِ اَرجُمند
گُھٹ گئے تھے دم، تھی پھینکی جب ستاروں پر کمند
سَر کٹائے ہیں ہزاروں تو ہوئے ہیں سَر بلند

حاصلِ زہرِ غلامی ہے مُسّرت کا سُرُور
ظلمتوں میں خونِ دل سے اس کا ہوتا ہے ظہُور
مُفت میں ملتا نہیں ہے صُبحِ آزادی کا نُور

قدرِ آزادی کریں، ورنہ رفیقانِ بہار
گر، یہ آزادی کسی سے رُوٹھ جائے ایک بار
کرنا پڑتا ہے اُسے پھر صدیوں اِس کا انتظار

صُبحِ آزادی کا سورج جسم وجاں کا قرض ہے
اِس کی کرنوں کی حفاظت اب ہمارا فرض ہے

—— صہبا اختر

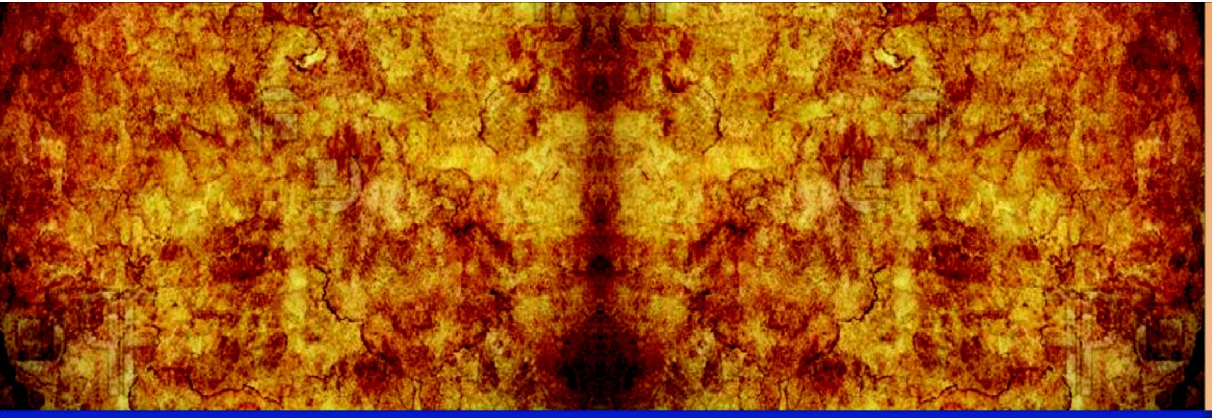

رُخِ آفتاب

زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
اِن ہی کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری

—— اقبالؒ

قائدِ اعظمؒ

پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں گیارہ اگست 1947ء کی تقریر کی روشنی میں

سیکولرازم (دہریت' لادینیت) اور تھیوکریسی (پاپائیت) خالصتاً مغربی اصطلاحیں ہیں۔ مغربی دنیا میں مذہب کو ایک پرائیویٹ اور ذاتی معاملہ سمجھا جاتا ہے۔ یہودیت اور نصرانیت کے پیروکاروں نے مذہب کو تھیوکریسی قرار دے کر اس کے خلاف یکے بعد دیگرے بغاوتیں کیں۔ اس دوران بادشاہ اپنا خود ساختہ آسمانی حق (Divine Right of King) سمجھ کر رعایا کا خون نچوڑتے اور عیش کرتے تھے۔ کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ اس کے ردِعمل میں جدید دنیا نے مذہب کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھ کر اپنے معاملات سیکولرزم اور لادینیت کی بنیاد پر طے کرنے شروع کر دیئے۔ یہ انقلابی سوچ تھی۔ فرانسیسی مفکرین والٹیئر اور روسو نے اس کو کامیاب بنانے میں مدد دی۔ انگلستان کی تحریکِ اصلاح (Reformation) اور اس سے پہلے یورپ میں نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) نے سائنس دانوں اور مفکروں میں تحقیق پسندی' عقل پرستی اور سائنسی انداز کی تخلیق کر کے مذہب کی من مانی روایات کو چیلنج کیا۔ ان تمام عوامل نے انقلابِ فرانس پر گہرے اثرات ڈالے۔ بادشاہوں کے حقِ آسمانی کو عقل وفکر کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا۔ خدا' وحی' الہام وغیرہ کو تھیوکریسی کی تخلیق قرار دے کر انہیں غیر ضروری سمجھا گیا۔ اجتماعی زندگی کی تشکیل اور زندگی کے دیگر سارے معاملات مذہب کی رہنمائی سے بادشاہ کا حقِ آسمانی چھین لینے' پوپ کا ریاستی اُمور میں عمل دخل بند کر دینے اور چرچ کو سیاست سے علیحدہ کر دینے کے بعد سیکولر سٹیٹ وجود میں آئی۔ اسلام دین اور دنیا میں وہ امتیاز قبول نہیں کرتا جو نصرانیت اور یہودیت مذہب اور دنیاویت میں کرتی ہے۔ کیونکہ اسلام میں دین اور دنیا محض ایک دوسرے سے وابستہ ہی نہیں بلکہ لازم وملزوم ہیں۔ مسلمان پر دنیا میں رہ کر دینی اقدار کا تحفظ اور ان پر عمل ضروری ہے۔ اسلامی ہدایات (قرآن مجید واحادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) محفوظ' کامل اور ابدی ہیں۔ اسلام کے اصول ہر دور کے حالات اور تقاضوں پر لاگو ہوتے ہیں۔ وحی کا سلسلہ بند اور اسلام کے کامل ہو جانے کی بنا پر مسلمان کو اب دائیں بائیں دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اسلامی ریاست میں مذہب' ماسوائے چند عبادات کے' پرائیویٹ معاملہ نہیں بلکہ ریاست کا دستور' معیشت' معاشرت' سیاست' عدل وانصاف اور زندگی کے تمام معاملات دینِ اسلام کے تابع ہیں۔ تھیوکریسی کے برعکس اسلام نے اُمتِ مسلمہ کو تین اہم اختیارات دیئے ہیں: اختیارِ وسائلِ معاش' اختیارِ تعبیرِ قانونِ شریعت اور اختیارِ حکمرانی۔ اسلامی ریاست میں مذہبی اجارہ داری نہیں ہوتی۔ اس میں ہر مذہبی اقلیت کو مذہبی' سیاسی اور معاشرتی آزادی حاصل ہوتی ہے [لَا اِکراہ فی الدّین - دین میں کوئی جبر نہیں] بشرطیکہ اقلیت ریاست کی وفادار رہے اور اسلام دشمن کارروائیوں میں حصہ نہ لے۔ تھیوکریٹک سٹیٹ میں مذہبی اجارہ داری ہوتی ہے۔ مذہبی اقلیتوں سے امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ سیکولر ریاست کے دو اصول ہوتے ہیں: اول' حکومتِ وقت غیر مذہبی بنیادوں پر قائم سیاسی پارٹیوں ہی کی اجازت دیتی ہے' مذہبی پارٹیوں پر پابندی ہوتی ہے۔ دوئم' سیکولر ریاست جداگانہ انتخابات کی اجازت نہیں دیتی۔ اس میں اقلیتوں کا تصوّر نہیں ہوتا۔ ان معروضات کے حوالے سے آیئے 11 اگست 1947ء کو آئین ساز اسمبلی میں قائدِ اعظمؒ کی تقریر کے ایک جملے کا سہارا لے کر وطنِ عزیز میں سیکولرازم' سیکولرازم کا راگ الاپے جانے کی واردات کا جائزہ لیں۔

مسلمانوں کے بارے میں ایک عام روایت یہ ہے کہ یہ قابلِ قدر لوگوں کی زندگی میں ان کی قدر نہیں کرتے' مرنے کے بعد انہیں یاد کرتے ہیں۔ قائدِ اعظمؒ کا معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ ان کی اہمیت اور سربلندی ان کی زندگی میں اپنی پوری تابندگی کے ساتھ نمایاں ہوئی اور کسی کے لئے یہ ممکن ہی نہیں رہا کہ اس سے انکار تو الگ بات' اسے نظرانداز بھی کر سکے۔ ایک محدود سا طبقہ قائدِ اعظمؒ کو سیکولرازم کا حامی بنا کر پیش کرنے لگا' اس طرح ارادی یا غیر ارادی طور پر وہ قائدِ اعظمؒ پر قول و عمل کے تضاد کا الزام عائد کر دیتے ہیں جو کسی اعتبار اور انداز سے درست نہیں ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ قائدِ اعظمؒ مغربی لباس پہنتے اور اکثر انگریزی زبان بولتے۔ وہ فقہی اختلافات سے بے تعلق رہے۔ ان کی زندگی میں روایت پسندی کی جھلکیاں بھی بہت کم ملتی ہیں۔ یہ ساری باتیں مسلمانوں میں موجود اُس چھوٹے لیکن اثر پذیری کے اعتبار سے اہم طبقے کی خواہشات کے مطابق نظر آتی ہیں جو خود کو سیکولر رجحانات کا حامل قرار دیتا اور اس پر فخر کرتا ہے۔

بات اختلافِ رائے یا دینی موضوعات پر عملی اور فکری انداز میں بحث کی نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کیا دیگر مذاہب کے موجودہ ماننے والوں کے اعلانات کے پیشِ نظر مسلمان کو بھی مذہب کو صرف افراد کا شخصی اور انفرادی مسئلہ سمجھ کر محض عبادات اور بعض دیگر رسومات تک محدود سمجھنا چاہئے یا ایک اصل' محفوظ اور آخری الوہی ہدایت ہونے کی بناء پر اسلام اپنا دائرہ اثر صرف فرد کی زندگی تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اسے پوری مملکت کی تمام سمتوں تک وسیع کر دیتا ہے۔ کیا اسلام پر ایمان لانے کے بعد بھی مسلمان زندگی کی ہمہ جہت کامیابیوں کے لئے دیگر افکار و نظریات سے ہدایت کا محتاج رہتا ہے یا فرد اور قوم دونوں کے لئے اسلام ہر سطح اور ہر سمت میں ہدایت اور رہنمائی کے لئے کافی ہے؟ یہ سوال اہم ہے اور اس کے جواب پر ہی ایمان کی وسعتوں کا انحصار ہے۔ قرآن کریم اور سیرتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں اس سوال کا جواب بالکل واضح اور روشن ہے۔ جواب یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے قرآنِ کریم کی تعلیمات و ہدایات اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ اقدس کی رہنمائی کافی ہے اور ہمیں صرف اتنا کرنا ہے کہ زمان و مکان کے تقاضوں کے پیشِ نظر ان کے اطلاق کے طریقوں پر غور کریں۔ 1940ء کے بعد سے اپنی وفات تک قائدِ اعظمؒ نے اپنی مختلف تقریروں میں بار بار اس حقیقت کا اظہار کیا کہ پاکستان میں اسلام کا نظامِ عدل اجتماعی نافذ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ 1940ء کے بعد سے اس لئے کہ اسی سال قراردادِ لاہور کے ذریعے برِصغیر کے مسلمانوں نے حصولِ پاکستان کو اپنا نصب العین قرار دیا تھا۔ بے شمار ایسی تقاریر ہیں جن میں اسی عہد کو دہرایا۔ نمونے کے لئے صرف دو تقاریر کے اقتباسات:

25 جنوری 1945ء کو کراچی بار ایسوسی ایشن سے اپنے خطاب میں قائدِ اعظمؒ نے کہا: ''میں ان لوگوں کی بات نہیں سمجھ سکتا جو دیدہ دانستہ اور شرارت سے یہ پراپیگنڈہ کرتے ہیں کہ پاکستان کا دستور شریعت کی بنیاد پر نہیں بنایا جائے گا۔ اسلام کے اصول عام زندگی میں آج بھی اسی طرح قابلِ عمل ہیں جس طرح تیرہ سو برس پہلے تھے۔ میں ایسے لوگوں کو جو بدقسمتی سے گمراہ ہو چکے ہیں' صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ یہاں غیر مسلموں کو بھی کوئی ڈر اور خوف نہیں ہونا چاہیے۔''

اسلامی نظام سے گہری وابستگی کی گواہی ان کی اس تقریر میں بھی موجود ہے

جوانہوں نے یکم جنوری 1948ء کو سٹیٹ بینک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب کے موقع پر کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا: ''مغربی دنیا صنعتی قابلیت اور مشینوں کی دولت کے زبردست فوائد رکھنے کے باوجود انسانی تاریخ کے بدترین باطنی بحران میں مبتلا ہے۔ اگر ہم نے مغرب کا معاشی نظریہ اور نظام اختیار کیا تو عوام کی خوش حالی حاصل کرنے کے لئے اپنے نصب العین میں ہمیں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔ اپنی تقدیر ہمیں اپنے منفرد انداز میں بنانی پڑے گی اور ہمیں دنیا کے سامنے ایک مثالی معاشی نظام پیش کرنا ہے جو انسانی مساوات اور معاشرتی انصاف کے سچے اسلامی اصولوں پر قائم ہو۔ ایسا نظام قائم کر کے گویا ہم بحیثیت مسلمان اپنا فرض ادا کریں گے۔''

قائدِ اعظمؒ کی دو تقاریر کے یہ مختصر مختصر سے اقتباسات بالکل واضح، نمایاں اور غیر مبہم ہیں۔ کچھ لوگ قائدِ اعظمؒ کی گیارہ اگست 1947ء کی تقریر کے ایک جملے کی بنیاد پر، جس میں انہوں نے مذہب کو ذاتی مسئلہ قرار دے کر کہا تھا کہ اس کا مملکت کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں، یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قائدِ اعظمؒ پاکستان میں سیکولر نظام کے قیام کے حامی تھے۔ آگے چلنے سے پہلے قائدِ اعظمؒ کی گیارہ اگست 1947ء کی تقریر کے زیرِ بحث جملوں کا تذکرہ: ... ''وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندو ہندو نہ رہے گا اور مسلمان مسلمان نہیں رہے گا۔ مذہبی مفہوم میں نہیں، کیونکہ وہ ہر شخص کا ذاتی مسئلہ ہے، بلکہ سیاسی مفہوم میں، اس مملکت کے شہری کی حیثیت سے ...''

سوال یہ ہے کہ یہ نکتہ بیں حضرات قائدِ اعظمؒ کی اس سے پہلے اور اس کے بعد والی تقریروں کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ قائدِ اعظمؒ کی متعدد تقاریر ہیں جن کو پڑھنے سے اسلام سے وابستگی اور پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ و ترویج سے دلچسپی میں کوئی شک نہیں رہتا۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ اقتباسات گیارہ اگست 1947ء والی تقریر کے بعد کی تقریروں سے لئے گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا صرف گیارہ اگست 1947ء کو قائدِ اعظمؒ سیکولر نظام کے حامی بنے اور اس سے قبل اور اس کے بعد بھی وہ پاکستان میں اسلام کے عادلانہ سماجی نظام کے حامی بنے رہے؟ کیا وہ تبدیلی صرف ایک دن کے لئے تھی؟ ظاہر ہے ایسا نہیں، تو کیا وہ لوگ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قائدِ اعظمؒ کے قول و فعل میں تضاد تھا اور سیکولرازم کے حامی ہونے کے باوجود وہ اسلامی نظام کے قیام کی حمایت بھی کرتے رہے؟

جہاں تک قائدِ اعظمؒ کی شخصیت اور کردار کا تعلق ہے، وہ آئینے کی طرح صاف اور روشن ہے۔ ان کے شدید ترین مخالفین بھی ان پر دورنگی کا الزام عائد نہیں کر سکتے۔ قائدِ اعظمؒ نے زندگی کا بہت طویل عرصہ سیاست میں گزارا اور کبھی دروغ گوئی اور مصلحت پسندی سے کام نہیں لیا۔ قائدِ اعظمؒ فکری اور ذہنی اعتبار سے اسلام کی حقانیت کے علمبردار ہونے پر فخر کرتے تھے۔ وہ اسلام کے سماجی اصولوں پر عمل پیرا ہونے پر فخر کرتے تھے اور آرزومند تھے کہ برِصغیر کے مسلمانوں کو اجتماعی طور پر ان اصولوں کے

> 1939ء میں شملہ آمد پر جلوس کے دوران قائدِ اعظمؒ رکشہ میں سوار تھے جسے لوگ رسے سے باندھ کر عقیدت کے طور پر کھینچ رہے تھے۔ قائدِ اعظمؒ نے اپنا ہیٹ گھٹنوں پر رکھا ہُوا تھا۔ کسی نے ان سے درخواست کی کہ انگریزوں کی اس علامت کو مسلمان پسند نہیں کرتے، اس لئے وہ ہیٹ گھٹنوں سے اُٹھا کر پاؤں میں رکھ لیں، اس طرح مسلمان خوش ہو جائیں گے۔ قائدِ اعظمؒ نے گھٹنوں پر رکھا ہیٹ سر پر رکھتے ہوئے فرمایا: ''مَیں آج نہیں، برسوں سے ہیٹ پہنتا ہوں، مَیں منافقت اختیار نہیں کروں گا۔''
>
> ـــــ آتش فشاں، قائدِ اعظمؒ نمبر: منیر احمد منیر

مطابق معاشرتی نظام مرتب کرنے کے لئے سازگار فضا میسر آجائے۔

بہت سے ذہنوں میں قائدِاعظمؒ کی گیارہ اگست 1947ء والی تقریر میں موجود ان الفاظ کے بارے میں تجسّس پیدا ہوتا ہے اور وہ لوگ یہ بات معلوم کرنے کے خواہشمند ضرور رہتے ہیں کہ قائدِاعظمؒ نے وہ الفاظ کس پس منظر میں ادا کئے تھے۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لئے بھی قائدِاعظمؒ ہی کے ایک بیان کا حوالہ ضروری ہے جو انہوں نے گیارہ نومبر 1947ء کو دیا تھا۔

اس بیان کا بہت اہم پس منظر تھا اور وہ اس صورتِ حال سے بہت مماثلت رکھتا تھا جو قیامِ پاکستان کے اعلان کے بعد سے مسلم کُش فسادات کی صورت میں مسلمانوں کے اقلیتی صوبوں اور مشرقی پنجاب میں بطور خاص بہت المناک طور پر نمایاں ہوئی۔ 20 اکتوبر سے 10 نومبر 1946ء تقریباً انیس دنوں تک صوبہ بہار میں شدید مسلم کُش فسادات ہوئے۔ مسلم لیگ کی متعلقہ تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ان فسادات میں تقریباً پچاس ہزار مسلمان شہید ہوئے اور بے شمار زخمی۔ مالی نقصان کتنا ہوا' وہ بے اندازہ تھا۔ ظاہر ہے وہ بہت المناک اور ساتھ ہی ساتھ نہایت اشتعال انگیز صورتِ حال تھی۔ اس کے باوجود قائدِاعظمؒ نے گیارہ نومبر 1946ء کو اپنے بیان میں کہا: ''اگر آپ حقیقت میں پاکستان چاہتے ہیں تو میں اللہ کریم سے دُعا کرتا ہوں کہ مسلمان کے دامن پر وہ بدنما داغ نہ لگنے دے جس کا مظاہرہ مجبور اور نہتے مسلمانوں پر انسانیت سوز مظالم کی صورت میں صوبہ بہار میں کیا گیا ہے۔ ہمیں تہذیب و شرافت کو کبھی ہاتھوں سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ مسلمانوں پر جو ظلم ہو رہے ہیں' ان سے ہمارا کلیجہ چھلنی ہو رہا ہے۔ لیکن ہم مسلم اکثریت والے صوبوں میں بے گناہوں کو مار کر اپنا دل ٹھنڈا نہیں کریں گے۔ ہمیں دوسروں کو بتا دینا چاہیے کہ ہم اپنے دشمنوں کو معاف کرنے والے بہادر' ایماندار اور سچے مسلمان ہیں۔ پاکستان میں غیر مسلم اپنی جان و مال اور عزت کی حفاظت مسلمانوں سے بڑھ کر پائیں گے...''

اور بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کے بعد قائدِاعظمؒ نے اپنے اسی بیان میں یہ بھی کہا: اگر مسلمانوں نے دامنِ صبر ہاتھوں سے چھوڑ دیا اور اپنا توازن کھو دیا اور اسلام نے جو عدیم المثال سبق سکھایا ہے' اسے بُھلا دیا تو سمجھ لیجئے کہ آپ نہ صرف اپنے مطالبۂ پاکستان کو کھو دیں گے بلکہ ہندوستان میں وہ کشت و خون ہوگا جس سے ہماری آزادی کے دن دور ہو جائیں گے اور ہم اپنی غلامی کی بیڑیاں اپنے ہی ہاتھوں سے مضبوط کریں گے۔''

اکتوبر' نومبر 1946ء میں بہار میں مسلمانوں کے قتلِ عام پر کرب و الم کی بھرپور شدت کے احساس کے ساتھ قائدِاعظمؒ کا یہ بیان ان کے ایمان کی پختگی اور ہادیٔ برحق رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ پاک سے حسبِ مقدور روشنی حاصل کرنے کے عزم کو ظاہر کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی گیارہ اگست 1947ء کی دستور ساز اسمبلی کی تقریر میں اسی بات کو دوہرایا تھا جو انہوں نے گیارہ نومبر 1946ء کے بیان میں کہی تھی۔ اس وقت اس بات کا دوہرانا بہت ضروری تھا۔ اپنی اس تقریر کے ذریعے قائدِاعظمؒ مسلمانوں کے اس عالمگیر ملّی تشخص کی نفی نہیں کر رہے تھے جو برّصغیر میں دوقومی نظریئے کی صورت میں نمایاں اور مطالبۂ پاکستان کی بنیاد بنا۔ وہ ہمیں اسلام کی انسانیت نواز تعلیم کی روشنی دکھا رہے تھے تاریخِ عالم میں جس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی اور مسلم دشمنی کا جہاں تک تعلق ہے اور مسلمانوں کے خون بہانے کا جہاں تک معاملہ ہے وہ بات صرف موجودہ بھارت تک ہی محدود نہیں بلکہ موجودہ دور میں تو اس کسوٹی پر اقوامِ مغرب کا کھوٹا پن بھی پوری طرح نمایاں ہو گیا ہے جو انسانی حقوق کی بہ بانگِ دُہل

مسلسل دعویداری کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے خون کی ارزانی کے تماشے جس بے حسی سے دیکھتی رہتی ہیں، وہ مسلمانوں سے ان کے گہرے بغض اور اسلام کی امکانی توانائی سے ان کی خوفزدگی کا کھلم کھلا اظہار کرتی ہیں۔

اس سلسلے میں قائدِ اعظمؒ پاکستان میں سیکولر نہیں، بلکہ اسلام کی تعلیمات اور احکامات پر مبنی دستور کے حامی تھے۔ ایک واضح ثبوت آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس سے مل جاتا ہے جو 24 دسمبر سے 26 دسمبر 1943ء تک کراچی میں منعقد ہوا۔ 26 دسمبر کو نواب بہادر یار جنگ نے خطاب کیا تھا۔ یہ بہادر یار جنگ کی بھی آخری تقریر تھی کیونکہ چھ ماہ بعد وہ 25 جولائی 1944ء کو حیدر آباد میں یکا یک انتقال کر گئے۔ اس تقریر کے دوران نواب بہادر یار جنگ نے بالکل واضح اور دوٹوک الفاظ میں کہا تھا:

''حضرات! پاکستان کو پاکستان بنانا اور قائم رکھنا مشکل ہے۔ آپ کے قائد نے ایک سے زائد مرتبہ اس کا اعادہ فرمایا ہے کہ مسلمان اپنی حکومتوں میں کسی دستور اور قانون کو خود مرتب کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ ان کا دستور مرتب اور متعین حالت میں ان کے ہاتھوں میں موجود ہے اور وہ ہے قرآن پاک... اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہم پاکستان صرف اس لئے نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسی جگہ حاصل کر لیں جہاں وہ شیطان کے آلہ کار بن کر ان ہی دساتیر کا فرانہ پر عمل کریں، جن پر آج ساری دنیا کاربند ہے۔ اگر پاکستان اس لئے چاہتے ہیں کہ وہاں قرآنی نظامِ حکومت قائم ہو، یہ ایک انقلاب ہوگا، یہ ایک نشاۃِ ثانیہ ہوگی۔ یہ ایک حیاتِ نو ہوگی جس میں خوابیدہ تصوراتِ اسلامی ایک مرتبہ پھر جاگیں گے اور حیاتِ اسلامی ایک مرتبہ پھر کروٹ لے گی... سن لیجئے اور آگاہ ہو جایئے کہ جس سیاست کی بنیاد کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نہیں ہے، وہ شیطانی سیاست ہے اور ہم ایسی سیاست سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔''

> پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کے دوران وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا: ''مجھے اُمید ہے کہ پاکستان میں اقلیتوں سے ویسا سلوک کیا جائے گا جس طرح اکبر بادشاہ نے غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور حُسنِ سلوک کا مظاہرہ کیا تھا...''
> قائدِ اعظمؒ نے اپنے خطاب میں وائسرائے کے ان جملوں کا جواب دیتے ہوئے کہا: ''اکبر بادشاہ نے غیر مسلموں سے رواداری اور حُسنِ سلوک کا جو مظاہرہ کیا، وہ کوئی نئی چیز نہیں۔ اس کا تعلق بہت پیچھے ہٹ کر تیرہ سو سال پہلے سے ہے جب پیغمبرِ اسلام نے نہ صرف اپنے الفاظ سے بلکہ اپنے عمل سے یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ بہترین سلوک کیا اور اس وقت کیا جبکہ وہ (عیسائی اور یہودی) مغلوب اور مفتوح ہو چکے تھے۔ پیغمبرِ اسلام نے اُن کے ایمان اور عقیدے کا نہ صرف خیال رکھا، بلکہ احترام کیا۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ، جہاں کہیں بھی انہوں نے حکومت کی، اسی طرح کے انسانی اور عظیم اصولوں سے بھری پڑی ہے جن کی تقلید کرنی چاہئے اور جن کو عملی جامہ پہنانا چاہئے۔
> ـــــ ارشاداتِ قائدِ اعظمؒ: تدوین و ترجمہ قائدِ اعظمؒ پیپرز ونگ، حکومتِ پاکستان

اس پر قائدِ اعظمؒ نے زور سے اور بڑے جوش سے میز پر مُکا مار کر فرمایا:

''تم بالکل درست کہتے ہو!''

بہادر یار جنگ نے برجستہ کہا: ''لیجئے قائدِ اعظمؒ نے میرے اس قول پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی۔''

یہ تمام تاریخی حقائق ہیں۔ ان سے اس بات کی پوری طرح وضاحت ہو جاتی ہے کہ قائدِ اعظمؒ پاکستان میں سیکولر نظام کے حامی تھے یا اس نظام کے جس کی بنیاد قرآن وسنت پر ہو۔ پاکستان میں یقیناً ایک مؤثر طبقہ ایسا ہے جو قرآن وسنت کی ان تعبیرات سے جو علمائے کرام کرتے ہیں، متفق نہیں ہے لیکن تعبیر اور تشریح سے اختلاف الگ بات ہے اور اصول سے انحراف الگ مسئلہ ہے۔ جو لوگ پاکستان میں سیکولر نظام کے حامی ہیں، ان کا یہ حق تو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ وہ علمائے کرام کی رائے سے اختلاف

کریں لیکن اس کے نتیجے میں مملکتِ پاکستان کی بنیادوں کو تبدیل کرنے کی کوشش کرنا؟ یہ کسی کا حق نہیں ہے نہ ہی کسی کو اس کی اجازت دی جاسکتی ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ نہ ہی کوئی مائی کا لعل ایسی جرأت کر سکے گا۔ سیدھی اور سچی بات تو یہ ہے کہ ایسی کوشش کی حمایت سیکولر نظام کے حامی لوگوں کی اسلام سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ وہ انکار کر رہے ہیں اس بات سے جس کا احاطہ نہیں کیا۔ قرآن اپنی تعلیمات کے مخالفین سے دلیل طلب کرتا ہے۔

بات صرف اتنی ہے کہ سیکولر نظام کے حامی عملی طور پر انسان کے معاشرتی نظام کے معاملات و مسائل کو اللہ کے قانون اور اللہ کے انعامات اور اللہ کی گرفت کے دائرے سے باہر سمجھتے ہیں ان کا یہ خیال قطعاً درست نہیں ہے۔ انسان ارادے اور اختیار کی صفت رکھتا ہے لیکن اس کا یہ اختیار صرف عمل کی راہ قبول کرنے یا نہ کرنے تک محدود ہے۔ انسان عمل پر ایک خاص دائرے میں اختیار رکھتا ہے لیکن اعمال کے نتیجوں پر انسان کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اعمال کے نتیجے خواہ اچھے ہوں یا برے اللہ تعالیٰ کے متعین کردہ قوانین کے مطابق مرتب ہوتے ہیں اور انسان نہ ان پر اثر انداز ہوسکتا ہے نہ ان کو تبدیل کرسکتا ہے۔

پاکستان کا قیام دورِ حاضر میں مملکتی سطح پر اسلامی نظام کے لئے تجربہ گاہ کے طور پر عمل میں آیا ہے۔ ہم اس مقصد سے صرف اس صورت میں انحراف کر سکتے ہیں جبکہ پاکستان کے وجود کو بھی خطرے سے دوچار کرنے کے لئے ہم تیار ہوں۔ دنیا کے دیگر ممالک کی طرح پاکستان بھی ایک ملک ہے لیکن اس ملک کے استقلال اور استحکام کے سلسلے میں یہ بات دُہراتے رہنا ناگزیر ہے کہ پاکستان کے وجود کی بنیاد دنیا کے دوسرے ملکوں سے مختلف ہے۔ پاکستان کو پاکستان کی حیثیت سے باقی رکھنے کے لئے اس کے نظامِ اجتماعی اور اس کے دستور کا رشتہ اسلام سے یعنی قرآن و سنت سے برقرار رکھنا لازمی ہے۔ اس بات سے اختلاف بجائے خود درست نہیں چہ جائیکہ اس اختلاف کو قائدِ اعظمؒ کے نام کا سہارا لے کر معتبر اور موثر بنانے کی کوشش کی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ قائدِ اعظمؒ جیسے رہنما قوموں کے لئے فطرت اور قدرت کا عطیہ ہوتے ہیں جو قومی زندگی کے شدید صبر آزما حالات کے چیلنج کے جواب میں سامنے آتے ہیں اور جن کے کردار کی مثالی بلندی ان کی کامیابی کی ضمانت بھی ہوتی ہے، سبب بھی اور دلیل بھی۔ ہمیں اپنی آزادی کے حصول میں قائدِ اعظمؒ کی رہنمائی میں جو کامیابی میسر آئی، وہ نہ اتفاقی تھی نہ حالات کے جبر کا نتیجہ۔ دس سال تک قوم ایک ایک قدم اس منزل کی جانب بڑھی تھی۔ اس وقت منزل بھی تھی، ایک متعین راستہ بھی، قومی وحدت بھی تھی اور قائد کی دیانت اور صلاحیت بھی۔ حقیقی کامیابی ان ہی اجزاء کی یکجائی کا نام ہے۔ برّصغیر میں ایک آزاد اسلامی ریاست کا قیام کوئی حادثہ نہیں، صدیوں کے تاریخی تقاضوں کا منطقی نتیجہ ہے اور اگر کوئی ایک فرد اس عظیم المثال کامیابی کی علامت ہے تو اس کا نام محمد علی جناحؒ ہے جسے بصد فخر ہم نے اپنا قائدِ اعظمؒ کہا۔

ظاہری وضع قطع کے خود ساختہ اصولوں کو اسلام کی بنیاد قرار دے کر ہم جو چاہیں سوچیں اور جو چاہیں کہیں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ قائدِ اعظمؒ کے افکار و عمل مجموعی طور پر ان اصولوں کی خوشبو میں رچے بسے تھے جنہیں اسلام نے انسانیت کی فلاح کے لئے لازمی قرار دیا ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے بیسویں صدی میں نہایت بلند رتبہ سیاست دان ہوتے ہوئے بلند کرداری اور صداقت و دیانت کا دامن ہاتھوں سے کبھی نہیں چھوڑا اور اس طرح انہوں نے ثابت کر دیا کہ دھوکے اور فریب کے بغیر بھی سیاست میں بڑی بھرپور کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے یہ عمل بجائے خود ایک جہاد ہے جو اسلام کے بنیادی اصولوں پر پختہ ایمان کے بغیر ممکن نہیں۔

پیامبرِ اُمیّد

اُستاذِ گرامی پروفیسر محمد منوّر سے ایک روز پوچھا کہ وہ کیا چیز ہے جو علامہ اقبالؒ کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے' کون سا ہنر اور وصف اللہ تعالیٰ نے انہیں بخشا کہ جاوداں اور دائم ہو گئے؟ ان کی بھیگی رہنے والی آنکھ؟ ان کا بے پناہ درد اور بے کراں علم؟ حیرت انگیز حافظہ یا پوری تاریخ کے پسِ منظر میں غور اور فکر کا خداداد انداز؟ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے کنار عشق اور ان کی امت سے بے پناہ محبت تھی۔ اہلِ علم کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم سے ان کے شغف نے ان میں ایسی وسعت اور اس قدر گہرائی گھول دی کہ آسمان سے زمین پر رینگتی زندگی کو دیکھنے لگے۔ ''قدم بر فلک و حکم بر ستارہ کنم''!

اُستاذِ محترم نے فرمایا: ''یہ سب نکات درست' مگر اس فقیر کا احساس یہ ہے کہ ایک اور سبب ہے جس سے علامہ اقبالؒ بے حساب ہوئے۔ مسلم اُمت کی سب دشواریوں اور دردناکیوں کے باوجود' جن سے انہیں گزرنا پڑا' اوّل روز سے ان کے ہاتھ میں اُمید کی مشعل تھی۔ کسی بھی دوسری چیز کو انہوں نے ترک یا اختیار کیا ہو گا' یاد رکھا یا بُھلایا ہو گا مگر امّید کی مشعل دونوں ہاتھوں سے' پورے استقلال کے ساتھ تھامے رکھنا کسی بھی حالت میں ترک نہیں کیا۔ اِسی امید سے عزم پُھوٹا۔ اسی سے انہیں ہمیشہ جاگتے رہنے والا درد نصیب ہُوا۔ اسی لئے حکیم الامت کے اعزاز کا حق دار ٹھہرے اور ایک محروم' مایوس' مفلس' منقسم اور دل شکستہ قوم کے لئے نئے اور آزاد وطن کا خواب دیکھ پائے۔''

اب جب کہ علامہ اقبالؒ کے خواب کی تعبیر — پاکستان — کی نسلِ نَو کو اندرونی و بیرونی مسائل نے شدید اضطراب سے دوچار کر رکھا ہے' علامہ اقبالؒ بہت شدت سے یاد آتے ہیں کہ ان کا کلام لمحۂ موجود میں شمعِ اُمید اور صبحِ تابناک کی نوید ہے۔ ہر ذی شعور جانتا ہے کہ کلامِ اقبالؒ قرآن مجید کی تفسیر اور احادیثِ نبویؐ کی تعبیر ہے۔ کلامِ اقبال کے یہ منتخب اشعار نوجوانوں خصوصاً' طالب علموں کے زخمی احساسات اور لہولہو سوچوں کے لئے بطورِ مرہم پیشِ خدمت ہیں۔ پہلے ''طلوعِ اسلام'' سے چند شعر:

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تُنک تابی
اُفق سے آفتاب اُبھرا' گیا دورِ گراں خوابی

عروقِ مُردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

یعنی بیداری کی صبح کا سورج طلوع ہو چکا ہے۔ ملّت میں زندگی پھر لَوٹ آئی ہے۔ یہ وہ راز ہے جس کو فلسفہ اور حکمت کے دنیاوی راز داں سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اقبالؒ زور دے کر کہتے ہیں:

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جُستجو کر دے

نظم کے دوسرے بند میں اقبالؒ آنے والے دَور کی تصویریں دکھاتے ہیں:

سرشکِ چشمِ مُسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیلؑ اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گُہر پیدا

کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمیؐ کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

یعنی مَیں وہ آنسو دیکھ رہا ہُوں جو چشمِ مُسلم میں ڈبڈبا رہا ہے اور گر کر بارش کے قطرے کی طرح موتی بن جائے گا۔ ملّتِ ابراہیمیؑ جو اس وقت بکھری ہوئی ہے ایک بار پھر اکٹھی ہو جائے گی۔ شاخِ ہاشمیؐ جو خشک ہو چکی تھی اس میں اب کونپلیں پھوٹتی دکھائی دے رہی ہیں یہ پیش خیمہ ہے اس حقیقت کا کہ یہ ٹہنی ایک مرتبہ پھر ہرے بھرے پتوں اور پھلوں سے لد جائے گی۔

مایوسی اقبالؒ کے پاس سے ہو کر نہیں گزری۔ مسلم دشمن طاقتوں اور ان کے مسلمان ایجنٹوں کی سازشوں کے سبب خلافتِ عثمانیہ کی جو تباہی ہوئی تھی اُس مایوس کُن سانحہ کو بھی علامہ اقبالؒ نے مُثبت انداز میں پیش کیا:

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹُوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اس شعر میں اقبالؒ نے ایک قانونِ قدرت جامع الفاظ میں واضح کیا ہے کہ ہر صبح جو ہماری نظروں کے سامنے نمودار ہوتی ہے وہ لاکھوں ستاروں کے فنا ہونے کے بعد ظہور میں آتی ہے۔ اس خیال کو اقبالؒ نے اپنی ایک اور نظم ''ستارہ'' میں اس طرح بیان کیا:

اجل ہے لاکھ ستاروں کی اِک ولادتِ مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے

طلوعِ اسلام کے سلسلے کا اگلا شعر ہے:

جہاں بانی سے ہے دشوارتر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

یعنی اس جہان میں حکمرانی کرنا اتنا مشکل کام نہیں جتنا دنیا کو سمجھنا ہے۔ دوسرے الفاظ میں حکومت مشکل کام نہیں حکمت مشکل ہے۔ حکمت کو دل کی نظر چاہیے اور دل میں بینائی اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب جگر خون خون ہو جائے۔

اس کے بعد اقبالؒ کا وہ مشہور و معروف شعر آتا ہے جو گزشتہ پوری صدی سے زباں زدِ خاص و عام ہے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نُوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس نظم میں اشعار کا جو سلسلہ اب شروع ہوتا ہے وہ ایک تلاطم ہے جہاں نغمے موج در موج اُٹھ کر نسلِ نَو کے اُداس اور مایوسی کے شکار دلوں کو کامرانی کی خوشخبری اور اُمید کی قوت سے بھر دیتے ہیں:

نَوا پَیرا ہو اے بُلبل کہ ہو تیرے ترنّم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے
مُسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے

اقبالؒ نے اپنی شہرۂ آفاق تخلیق ''شکوہ'' میں کہا:

ایک بُلبل ہے کہ ہے محوِ ترنّم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطُم اب تک

جس طرح مندرجہ بالا شعر میں اقبالؒ اپنے آپ سے مخاطب ہیں اسی طرح طلوعِ اسلام میں 'نوا پَیرا ہو اے بُلبُل' سے مراد خود اُن کی ذات سے خطاب ہے کہ اے بُلبُل تُو اپنے ترنّم سے کبوتر کے نازک جسم میں شاہیں کا جگر پیدا کر دے۔

اقبالؒ اپنے ایک فارسی شعر میں اللہ تعالیٰ کے حضور اُس کے جلال کی قَسم اس درد سے کھاتے ہیں کہ سننے والے کا دل کانپ اُٹھتا ہے:

بجلالِ تو کہ در دِل دگر آرزو ندارَم
بجز اِیں دعا کہ بخشی بہ کبوتراں عقابی!

ترجمہ: ربّ العالمین! مجھے تیرے جلال کی قسم کہ میرے دل میں سِوائے اس کے قطعاً کوئی آرزو نہیں کہ تُو ملت کے نوجوانوں کو عقابی شان عطا فرما دے۔

کچھ ایسے ہی جذبات کا عالَم یہاں بھی ہے۔ اقبالؒ تمہید کے طور پر پہلے خود اپنے آپ سے مخاطب ہوتے ہیں:

ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی' کہہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے

اور پھر رُوئے سُخن مسلم نوجوان اور طالب علم کی طرف ہوتا ہے:

خدائے لَم یزل کا دستِ قدرت تُو' زباں تُو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گُماں تُو ہے

اقبالؒ تلقین کر رہے ہیں کہ تیرے مسائل کا حل پختہ یقین میں پوشیدہ ہے۔ تیرا عمل اُسی وقت پھل پُھول لائے گا جب تُو بے یقینی کے بھنور سے نکل کر اپنے اندر ایمان اور یقین کی قوت پیدا کر لے گا۔ پھر تیرا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہوگا' تیری زبان ترجمانِ قدرت ہو جائے گی اور باری تعالیٰ نے جب تجھے یہ مرتبہ عطا کر دیا' تیری منزل نیلے آسماں اور ستاروں سے کہیں آگے ہوگی:

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مُسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں' وہ کارواں تُو ہے

اور یہ بات معراجِ مصطفیٰؐ کے بعد تو کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ

عالَمِ بشریّت کی زد میں ہے گردُوں

> تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
> جہاں میں جس تمدّن کی بِنا سرمایہ داری ہے
>
> یعنی جس حکومت اور معاشرے کی بنیاد ہی سرمایہ دارانہ نظام پر استوار ہو' اس میں استحکام پیدا نہیں ہو سکتا' خواہ اس کے قوانین کتنی ہی دیدہ ریزی اور علمی غور و فکر کے بعد بنائے جائیں۔ حکیم الامتؒ نے جس طرح کمیونزم کے بارے میں کہا تھا کہ یہ 70 برس سے آگے نہیں چل سکے گا' مغرب میں برپا ''آکوپائی وال سٹریٹ'' مہم اور لرزتا' لڑکھڑاتا ہُوا سرمایہ دارانہ نظام بھی علامہ اقبالؒ کی پیش گوئی کا عکس ہی تو ہے۔ BBC کے نمائندہ کے مطابق امریکہ میں 17 ستمبر 2011ء کے دھرنے میں ''مسلم اقتصادی نظام کو آزمایا جائے'' کے بینر بھی نظر آئے

یعنی انسان کی رسائی کائناتِ معلوم سے آگے کہاں ہے' یہ بتانا تو ممکن نہیں' لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ایسے مقامات بھی اس کی زد میں ہیں' جہاں سے آگے اگر جبرائیل علیہ السلام بھی جائیں تو اُن کے پر جلنے لگتے ہیں۔ وہ مقام بھی ہے جہاں شہداؑ قیامِ قیامت تک مقیم رہیں گے۔ شہداؑ وہ ہستی ہیں جن کے متعلق قرآنِ پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے' انہیں مُردہ مت کہو' بلکہ اللہ کے نزدیک وہ زندہ ہیں اور اُن کو رزق مل رہا ہے۔ (سورۃ آل عمران- آیت:169)

رسولِ پاکؐ کی ذات میں انسانیّت کی مکمل تصویر ہمارے سامنے ہے' معجزۂ معراج حقیقتاً انسانیّت کی معراج ہے۔ اقبالؒ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسلم نوجوان کا جذبہ بلند کر رہے ہیں:

جہانِ آب و گِل سے عالَمِ جاوید کی خاطر
نبوّت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تُو ہے

انسان کو ایسا بے مثال خراجِ عقیدت آج تک کسی نے پیش نہیں کیا جیسا اقبالؒ ان اشعار میں کر گئے۔ یعنی جب شبِ معراج اس دنیا سے بارگاہِ باری تعالیٰ میں نبی کریمؐ کو شرفِ باریابی ملا تو اپنے میزبان کے لیے جو خوبصورت تحفہ آپؐ ساتھ لے گئے تھے اے مسلمان وہ تُو ہی تھا اور پھر فرماتے ہیں:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اس شعر میں پورے ایک مضمون کو سمیٹا گیا ہے۔ ساتھ ہی دوسرے عنوان کی ابتدا میں اقبالؒ کہتے ہیں کہ اے مسلم نوجوان! اپنے اندر اسلام کے بتائے ہوئے اوصافِ حمیدہ پیدا کر اور اعلیٰ علم و ہنر سے اپنی ذات کو مالا مال کر، تاکہ تجھے دنیا کی قیادت سونپی جائے، کیونکہ:

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی

اللہ تعالیٰ نے مسلمان کو پیدا کر کے یہ راز بتا دیا ہے کہ اس کی ڈکشنری عین مقصودِ فطرت ہے۔ مسلمان محبتوں کا سرچشمہ ہے۔ ساری دنیا میں انسانی رشتوں کا قیام، فروغ اور بھائی چارہ اس کے دم سے برپا ہُوا، اور یہ اب بھی ممکن ہے۔ رَبِّ ذُوالجلال نے ایسے اوصاف اس کی فطرت میں رکھے ہیں جن کو بروئے کار لا کر وہ ہر زمانے میں اپنا مقام پیدا کر سکتا ہے، لہٰذا اے نوجوان تجھے چاہیئے کہ:

بُتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملّت میں گُم ہو جا
نہ تُورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

آگے چل کر فرماتے ہیں:

گمان آباد ہستی میں یقیں مردِ مُسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

یعنی دنیا گمان آباد ہے۔ یہاں لوگ تذبذب اور اندیشوں کے شکار ہیں، لیکن مردِ مومن کا یقینِ کامل بیاباں میں رات کی تاریکیوں کے لیے ایک چراغ کی مانند ہے۔ اسی نے دنیا میں اخوت کی شمعیں جلائیں اور جہالت کی تاریکیوں کو روشنی اور شعور میں بدل کر رکھ دیا:

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدرؓ، فقرِ بُوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ

مسلمانوں کی شجاعت، فقر، صدق، یقینِ محکم، عدل اور انسان دوستی ہی تھی کہ دنیا میں قیصر و کسریٰ جیسی بڑی طاقتوں کے محلّات میں ان کے نام سے زلزلہ آ جاتا تھا۔ پھر فرماتے ہیں:

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ رُوحُ الامیںؑ پیدا

یعنی انسان کے اندر یقین اور ایمان کے اوصاف اُجاگر ہوتے ہیں تو یہ پیکرِ خاکی پرواز میں جبرائیل علیہ السلام کا ہمرکاب ہو جاتا ہے۔ یہ اہمیت اور اعزاز یاد دلانے کے بعد فرماتے ہیں:

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں، نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا، تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

انسان کے اندر بے پناہ صلاحیتیں موجود ہیں جن کو بروئے کار لانے کے لیے دل میں ایمان، یقین اور لگن پیدا کر لے، تو اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق غیبی امداد اس کے شاملِ حال ہو گی، غلامی (ذہنی ہو یا روحانی و جسمانی) کی زنجیریں خود بخود کٹتی چلی جائیں گی اور انسان مردِ مومن کہلانے کا مستحق ہو گا جس کی تعریف علامہ اقبالؒ اس طرح کرتے ہیں:

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

مومن کی فراست اور اُس کے بازو کی قوت کا احاطہ انسان کی عقل نہیں کر سکتی۔ قلعہ خیبر کا دروازہ جس کو ایک فوج ظفر موج نہ ہلا سکتی تھی' صرف ایک انسان—حضرت علیؓ— نے اپنے گوشت پوست کے ہاتھوں سے اُکھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ کیا انسانی ذہن اس مردِ مومن کی قوّتِ بازو کا اندازہ کر سکتا ہے؟ تاریخ شاہد ہے کہ ایسے ہی لوگوں نے قوموں کی تقدیریں بدل ڈالی ہیں۔

ولائت' پادشاہی' علمِ اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اِک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

اگر دل میں ایمان ہے اور یقین کی دولت میّسر ہے' تو ایسا انسان ولی ہو سکتا ہے' حاکم بن سکتا ہے' فلاسفر' سائنسدان اور مُوجِد بھی۔ دنیا کے تمام عُلوم' فنون' ہنر اور مابعد الطبیعیات و الٰہیات کا درجۂ کمال صرف ایک نکتے میں پوشیدہ ہے اور وہ ہے انسان کا ایمانِ کامل جو ملّتِ ابراہیمؑ کا طُرّہ امتیاز ہے۔ اقبالؒ بتاتے ہیں کہ اس کے تقاضے کیا ہیں:

براہیمیؑ نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہَوَس چُھپ چُھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

مشکل یہ ہے کہ اس دنیا میں قدم قدم پر ایمان کو متزلزل کرنے والے بُت موجود ہیں' جو کبھی نظروں کے سامنے ہوتے ہیں اور کبھی دلوں میں گھر بنائے ہوئے۔ اقبالؒ بتاتے ہیں کہ فساد کے پس منظر میں اکثر یہی بُت کارفرما ہوتے ہیں۔ چھوٹے اور بڑے کا فرق فسادِ انسانیت ہے۔ اسلام نے آقا اور غلام کے امتیاز کو سختی کے ساتھ مٹایا ہے۔ اس کی زندہ مثال روحِ نماز ہے' جہاں آقا اور غلام ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ جہاں بادشاہ محمود اور اس کے ملازم ایاز کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔

مندرجہ بالا اشعار کے آخری مصرع میں اہلِ ثروَت' حکمران طبقہ اور صاحبانِ اختیار کو خبردار کیا گیا ہے کہ کمزور پر ظلم نہ کرو اور ان کی حق تلفی نہ کرو ورنہ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ بڑی سخت ہے اور یہ بھی یاد رکھو کہ:

حقیقت ایک ہے ہر شَے کی' خاکی ہو کہ نُوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے' اگر ذرّے کا دل چیریں

انسان ہو یا فرشتہ' دنیا کی کوئی بھی شے ہو یا کائنات کا کوئی عنصر' حقیقت سب کی ایک ہے۔ اگر انسان غور کرے تو آسمان کے سورج اور زمین کے ایک ادنیٰ ذرّے میں ربط پا لے گا۔ اس شعر میں ایٹمی طاقت کی پیش گوئی موجود ہے۔ یہ شعر اُس وقت کہا گیا تھا جب ذرّے کا دل چیر کر ایٹم کا

طائرانِ چمن سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہو رہی ہے' جس نے بدر و حنین کے غازیوںؓ اور شہیدوںؓ کی یاد دلوں میں تازہ کر دی ہے۔ یہ انہی غازیوںؓ اور شہداؓء کا تصرّف ہے کہ چمنِ خلیلؑ کی خشک شاخیں ہمارے شہیدوں کے خون سے سیراب ہو کر پھوٹنے لگی ہیں اور بالآخر بازارِ محبت میں ہمارا کھرا سکّہ ہی کام آیا ہے۔ آج علامہ اقبالؒ کے خواب کی تعبیر- پاکستان- کی سرحدوں کے محافظ بھی اُن مجاہدوںؓ کے راستے پر رواں' شجاعت کی نئی تاریخ لکھتے ہوئے خون اور جانوں کا نذرانہ پیش کر کے' غازی اور شہید بن کر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے عزائم خاک میں مِلا رہے ہیں۔ علامہ اقبالؒ ان سارے شہیدوں کی قبروں پر اپنے اشعار کی صورت میں عقیدت کے پھولوں کی پتّیاں نچھاور کرتے ہیں کہ شہدا اور غازیوں کے خون ہی نے ملّتِ اسلامیہ کے شجر کی آبیاری کی ہے:

سرِ خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش بانہالِ مِلّتِ ما سازگار آمد

دھا کہ کرنے کا تصور بھی نہیں تھا۔ علامہ اقبالؒ کی اس پیش گوئی اور دُور بینی کی تصدیق بیس سال بعد ہوئی۔ اس کے بعد علامہ اقبالؒ پھر زیرِ بحث مضمون یعنی پیغامِ اُمید کی طرف پلٹتے ہیں:

یقیں مُحکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالَم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مَردوں کی شمشیریں

یعنی زندگی تقاضا کرتی ہے مسلسل جدِ وجُہد کا، اس کے بغیر انسان کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ پختہ یقین کے ساتھ مسلسل جدِ وجُہد کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔ یہی کامیاب زندگی کے ہتھیار ہیں۔ البتہ محبت ان ہتھیاروں کو دُہری قوت بخشتی اور آب وتاب دیتی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ دل صرف اور صرف محبت کے ذریعے ہی جیتے جاسکتے ہیں۔

اقبالؒ پر جب وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے، تو جذبات کے اظہار کے لیے فارسی زبان استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ اس بند کا آخری شعر اسی رَو میں فارسی زبان میں کہہ گئے ہیں:

چہ باید مرد را طبعِ بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

ترجمہ: ایک انسان کو (مکمل انسان بننے کے لیے) ضرورت ہے اعلیٰ ظرف اور خالص عقیدے کی (اُس کے سینے میں سوزِ عشق سے) تپتا ہُوا دل ہو، اس کی نظر پاک اور روح مُضطرب و بے چین ہو۔

اقبالؒ ایک سچے مسلمان بلکہ ایک مثالی مسلمان کے اجزائے ترکیبی بتا گئے ہیں۔ کہتے ہیں ایک مکمل مسلمان کے لیے جو اوصاف انتہائی ضروری ہیں، وہ ہیں کہ وہ بلند ہمت اور اعلیٰ خیالات کا حامل ہو۔ اُس کا عقیدہ اتنا پختہ اور خالص ہو کہ سِوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کے آگے نہ جھکے اور اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات میں کسی کی شرکت اس کے وہم وگمان میں نہ آئے۔ اس کا دل عشق کی حرارت سے گرم ہو۔ ایمان ایسا پختہ ہو کہ اس کی نظر ہمیشہ پاک شَے کی متلاشی ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے اندر پارے جیسی تڑپ اور بے قراری ہو، تاکہ وہ عالَمِ رنگ وبُو کا ہو کر ہی نہ رہ جائے، بلکہ سیدھے راستے پر آگے بڑھنے کے لئے جائز ذرائع سے کوشش کرتا رہے۔

اگلے دو بندوں میں اقبالؒ ایسے ہی انسانوں کی مثالیں دے کر ان کی صفوں میں شامل ہونے کے طریقے بتاتے ہیں:

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو، بے بال و پَر نکلے
ستارے، شام کے خونِ شَفَق میں ڈوب کر نکلے

ہوئے مدفونِ دریا، زیرِ دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو، بَن کر گُہر نکلے

غبارِ رہگذر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو، اکسیر گر نکلے

آج کے نوجوان اور طالب علم کو حوصلہ بخشنے کے لئے دَورِ اوّل کے مسلمانوں کی شان بیان کرتے ہوئے اقبالؒ کہتے ہیں کہ وہ بے بال پر تھے، لیکن شاہینوں کی طرح جھپٹتے تھے۔ وہ تاریکیوں کو روشن کر دینے والے ایسے ستاروں کی مانند تھے جو سُرخ شفق میں ڈوب کر شام کے وقت نکلتے اور آسمان کی تاریکیوں میں نُور بکھیر دیتے ہیں۔ دولت کے سمندر میں تیرنے والوں کی مثال ایسی ہے جیسے زیرِ آب رہنے والی مچھلیاں اور آبی جاندار، جو وہیں گم نامی کی موت مر کر فنا ہو جاتے ہیں۔ صدف کا حال ان سے مختلف ہے۔ وہ اُس وقت تک طوفانی موجوں کے تھپیڑے کھاتی ہے جب تک سیپی میں موتی بنانے والی موسمِ بہار کی بارش کے قطرے سے اپنی تڑپ کی تسکین نہیں کر لیتی اور پھر موتی اُگلتی ہے۔ وہ لوگ جو اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو کر اپنی پیشانیاں خاک پر رکھتے تھے، اور ان کے سینوں میں

عشق کی تڑپ ہوتی تھی، دونوں جہان کی کامیابیاں اُن کے قدم چومتی تھیں:

ہمارا نَرم رَو قاصد پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں، وہ بے خبر نکلے

زمیں سے نُوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے

ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کو زندگی کا پیغام دیا۔ دنیا داروں میں دولت و زر کی کمی نہ تھی، لیکن وہ زندگی کی حقیقی مسرتوں سے محروم تھے۔ مسلمانوں کی شان یہ تھی کہ آسمان پر فرشتے بھی اُن کی زندگی سے بھرپور رَوِش پر اَش اَش کر اُٹھتے تھے۔ اقبالؒ کہتے ہیں:

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

دنیا میں بنی نوعِ انسان ایک اکائی تھی، لیکن اس کو لالچ اور ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ ہمیں چاہیے کہ ہوسِ زر اور ہوسِ اقتدار کو چھوڑ کر محبت اور بھائی چارے کی فضا قائم کریں تاکہ ہمارا تعلق نہ کسی خاص طبقے سے رہے، نہ کسی نسب، نہ کسی برادری اور نہ کسی فرقے سے۔

اس شعر میں مُرغِ حرم سے اقبالؒ کی مراد مردِ مومن یا ''شاہیں'' ہے جس کے پَر رنگ و نسب کے غبار سے بوجھل ہو گئے ہیں۔ اقبالؒ کہتے ہیں کہ تُو اپنے پروں سے رنگ و نسل کی اس گرد کو جھاڑ دے، تو تُو سُبک خرام ہو جائے گا اور پہلے کی طرح بلندیوں کی طرف پرواز کرنا تیرے لئے آسان ہو جائے گا۔ پھر یہ عظیم مقصد حاصل کرنے کا گُر بتاتے ہیں:

خودی میں ڈُوب جا غافل! یہ سِرِّ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوِداں ہو جا

علامہ اقبالؒ کی دلی خواہش ہے کہ نوجوان خصوصاً طالب علم ہر قسم کے پریشان کُن حالات کے باوجود مایوسی کو چھوڑ کر سائنس اور ٹیکنالوجی سمیت سارے علوم میں مہارت حاصل کریں، ہر میدان میں خود انحصاری کا سامان کریں اور قوم و ملت کو بدحالی کے گڑھوں سے نکال کر ترقی و خوشحالی کے آسمان تک لے جائیں۔ دشمن کی سازشوں اور چالوں کے باوجود پریشان نہ ہوں، ان شا اللہ تعالےٰ دشمنوں کے شر کے اندر سے ہی ہمارے لئے خیر و خوبی کا سامان پیدا ہونے کو ہے:

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

یعنی جس طرح خوفناک طوفان سیپ کو سطحِ آب پر لا کر قطرۂ نیساں سے فیض یاب ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے، جس کے نتیجے میں موتی وجود میں آتا ہے، اسی طرح مغرب کا طوفانِ فرعونیت، مسلم اُمہ اور نوجوانوں میں احساسِ بیداری پیدا کرنے کا باعث بنے گا۔ مومن کی کھوئی ہوئی عظمت، شوکت، سرمایۂ علم و حکمت، جوہرِ دلیری اور غیرت مندی بہت جلد بارگاہِ ربِ کریم سے مسلم نوجوانوں اور طلبہ کو عطا ہونے والا ہے۔ شرط یہ ہے کہ پوری دیانتداری سے، بھرپور محنت کے بعد اللہ تعالیٰ پر پورا بھروسہ رہے اور مایوسی و ناامیدی کو قریب نہ پھٹکنے دیا جائے کہ:

نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے!

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پَرنیاں ہو جا

پہلے شعر میں اقبالؒ مسلمان نوجوان کو ایک بار پھر تلقین کرتے ہیں کہ تُو اپنی

خودی کو پہچان لے کہ بس یہی زندگی کا راز ہے۔ اگر سمجھے تو تیری ذات کی نہ صبح ہے، نہ شام۔ موت تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، البتہ اس دنیا میں جینے کا چلن سیکھ۔ زندگی کے مسائل سے نمٹنے کے لئے فولاد کی طرح سخت کوش ہو۔ چمنِ محبت میں قدم رکھے تو ریشم کی طرح ملائم اور نرم خُو ہو جا اور

گُزر جا بَن کے سَیلِ تُند رو کوہ و بیاباں سے
گُلستاں راہ میں آئے تو جُوئے نغمہ خواں ہو جا

یعنی راستے میں پہاڑ اور بیاباں آئیں، تو طوفان کی طرح ان میں سے گزرتا چلا جا، راستے میں گلستاں آ جائے تو لہراتی بل کھاتی ندّی اور نغمے گنگناتی نہر بن کر خراماں خراماں چل تا کہ تیرے وجود سے گلستاں میں بہار آئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ

تیرے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نَوا کوئی

ابھی تک آدمی صیدِ زبُونِ شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

اقبالؒ کہتے ہیں کہ گویا اس ترقی یافتہ دور میں بھی انسان ہی انسان کا حق ہڑپ کر رہا ہے۔ آج نام نہاد ترّقی یافتہ قومیں دن رات حقوقِ انسانی کا راگ الاپتی اور انسان دوستی و جمہوریت کی علمبرداری کا دعویٰ کرتی ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ جس طرح گذشتہ دَور کے بادشاہ عام انسانوں کا خون چوس کر اپنی مملکت کو مستحکم کرتے تھے، یہ بالکل اسی طرح آج پسماندہ قوموں کو مختلف حیلے بہانوں سے اپنا محکوم اور ماتحت بنا کر رکھنا چاہتی ہیں۔ یہ جمہوریت نہیں، بلکہ جمہوریت کے رُوپ میں وسیع تر منظّم بادشاہت ہے، لیکن ان کو خبر نہیں کہ

نظر کو خِیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جُھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

مغرب کی چمک دمک، جس سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں، کی مثال ایسی ہے جیسے عام شیشے کو ہیرے کی طرح تراش کر اور پالش کر کے اس میں ہیرے جیسی چمک دمک پیدا کر دی جائے، لیکن یہ ناپائیدار اور مصنوعی خوبصورتی ہو گی۔ اہلِ مغرب کا علم، سائنس اور ٹیکنالوجی انسانیّت کی بے لوث بھلائی کے بجائے ان کی ہوسِ اقتدار کے ہتھیار بن چکے ہیں جن کے ذریعے کمزور اقوام کا حق مار کر ان کو اپنا غلام بنایا جا رہا ہے۔

اقبالؒ بڑے سادہ الفاظ میں انتہائی خوبصورتی کے ساتھ نوجوانوں کو درس دے رہے ہیں کہ:

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی، جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نُوری ہے، نہ ناری ہے

خروش آموزِ بُلبُل ہو، گرہ غنچے کی وا کر دے
کہ تُو اس گلستاں کے واسطے بادِ بہاری ہے

''خروش آموزِ بُلبُل'' کہہ کر نوجوانوں کو تلقین ہو رہی ہے کہ گو تیرے رب نے تجھے گلستانِ عالَم کے لیے بادِ بہاری بنا کر بھیجا ہے، لیکن وقت کا تقاضا ہے کہ تُو مرغانِ چمن کو زمانے کی تلخ حقیقتوں سے روشناس کر دے تا کہ ان کی آواز میں وہ اثر پیدا ہو کہ گلشن کی ہر کلی کِھل جائے اور ایک مرتبہ پھر اس چمن میں بہار آ جائے۔

اگلے اشعار میں علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ ایک مدت کے بعد ''پھر اُٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی۔'' یعنی خزاں کے خاتمے اور بہار کی آمد آمد ہے، ملّت کی ترقی کی راہیں کُھلنے کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ صحرا میں ابرِ بہاری نے خیمہ لگا لیا ہے، پہاڑوں سے ترقی و خوشحالی کی آبشاروں کے نغمے پھوٹ رہے ہیں۔ پاکستان، زندہ باد!

سُلطان المجاہدینؒ

ٹیپو سُلطان شہید کا ذکرِ معطّر پروفیسر فتح محمد ملک کے قلم سے

دو صدی پہلے چار مئی کے ایک تاریک دن ہماری کمان کا آخری تیر فرنگی فوج کے سینے میں پیوست ہُوا تھا۔ بقول علامہ اقبالؒ

درمیانِ کارزارِ کُفر و دیں
تَرکشِ ما را خدنگِ آخریں

4 مئی 1799ء کو ٹیپو سلطانؒ نے دادِ شجاعت دیتے ہوئے اپنے اس مقولے پر عمل کر کے کہ ''شیر کی ایک دن کی زندگی' گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے'' شہادت پائی تھی۔ ٹیپو سلطانؒ کی شہادت کی خبر کے ساتھ ہی صرف سرنگا پٹم کے میدان پر ہی نہیں بلکہ بلادِ اسلامیہ ہند کے نام سے موسوم پورے برِصغیر پر موت کا سا سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ انتہائی سراسیمگی کے عالَم میں برِصغیر کے جعفر از بنگال' صادق از دکن اور اُن کی نسلی اور معنوی اولاد نے گیدڑ کی زندگی کے اوصاف کو اوصافِ حمیدہ قرار دے کر اپنا لیا تھا۔ جب سے لے کر اب تک ایک طبقہ عامتہ المسلمین کے دلوں سے شیر کی زندگی بسر کرنے کی تمنّا کو مٹا ڈالنے میں کوشاں ہے' مگر یہ تمنّا ہے کہ مٹائے نہیں مٹتی! یہ کس قدر المناک حقیقت ہے کہ ٹیپو سلطانؒ کی یاد سے ہم بدستور ڈر رہے ہیں۔ سیاسی اور تہذیبی مناظر پر آج بھی وہی موت کا سا سکوت طاری ہے' وہی اُلّو سناٹا مسلط ہے جو آج سے دو سو تیرہ سال پہلے سرنگا پٹم کے میدان پر ٹیپوؒ کی شہادت کی خبر سُن کر مسلط ہُوا تھا۔ وہ میدان جو دو تیرہ سال پہلے کُفر و دیں کا کارزار بنا تھا' آج وہاں بھارت کے لڑکے بالے کرکٹ کھیل رہے ہیں اور جس جگہ ہمارے ترکش کا آخری تیر ٹوٹ کر گرا تھا' وہاں یہ شوقیہ کھلاڑی اپنے جوتے رکھتے ہیں۔

ایسا کیوں ہے کہ ٹیپو سلطانؒ کی شہادت کی دو صد سالہ یادگار منانے کے لیے نہ تو کوئی بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا گیا تھا اور نہ کسی قومی سمپوزیم کا اہتمام ہُوا! شاید اس لیے کہ گیدڑ کبھی شیر کی یاد نہیں مناتا' وہ تو اس یاد سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے۔ شیر کی یاد اس پر موت کی کپکپی بن کر طاری ہو جاتی ہے۔ ساری کی ساری ترجیحات گیدڑ کی زندگی سے مستعار ہیں۔ بقول علامہ اقبالؒ:

فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
اور رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ جَفّاش

یعنی اللہ تعالیٰ نے تو ہمیں شاہیں کی آنکھ دی تھی' مگر مغرب کی غلامی نے شاہیں کی آنکھ میں چمگادڑ کی نظر رکھ دی ہے۔ چنانچہ جب ہم چمگادڑ کی نظر سے دیکھتے ہیں تو ہمیں ٹیپو سلطانؒ سے خوف آنے لگتا ہے کہ یہ شخص ہمیں ذلت کی زندگی چھوڑ کر عزت کی موت کی جانب بلاتا ہے۔ ٹیپوؒ سلطان سے خوف دراصل زندگی کے اُن معیار و اقدار سے خوف ہے جو اسلام سے پھوٹے ہوئے ہیں اور جن پر ٹیپو سلطانؒ نے عمل کر کے دائمی زندگی پائی۔

جب علامہ اقبالؒ کے ایک پرستار نے ایک فوجی سکول قائم کیا اور اس سکول کو علامہ اقبالؒ کے نام سے منسوب کرنا چاہا' تو علامہ اقبالؒ نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اس سکول کو ''ٹیپو فوجی سکول'' کا نام دیں۔ علامہ اقبالؒ کا استدلال یہ تھا کہ

''ایک معمولی شاعر کے نام سے فوجی سکول کو موسوم کرنا کچھ زیادہ موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ آپ اس سکول کا نام ''ٹیپو فوجی سکول'' رکھیں۔ ٹیپو سلطانؒ ہندوستان کا آخری مسلمان سپاہی تھا جس کو ہندوستان کے مسلمانوں نے جلد فراموش کر دینے میں ناانصافی سے کام لیا ہے۔ اس عالی مرتبت سپاہی کی قبر زندگی رکھتی ہے بہ نسبت ہم جیسے لوگوں کے جو نمائشی زندہ ہیں اور اپنے آپ کو حقیقی زندہ ظاہر کر کے لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔'' (خط بنام میجر محمد سعید خان)

علامہ اقبالؒ اپنی عظیم ترین تخلیق ''جاوید نامہ'' میں ٹیپو سلطانؒ سے زندگی، موت اور شہادت کے اسرار و رموز سیکھتے نظر آتے ہیں اور انہیں عقیدت پیش کرتے وقت ''وارثِ جذبِ حُسینؓ'' قرار دیتے ہیں:

آں شہیدانِ محبت را اِمام
آبروئے ہند و چین و رُوم و شام

نامش از خورشید و مہ تابندہ تر
خاکِ قبرش از من و تو زندہ تر

عشق رازے بود بر صحرا نہاد
تو ندانی جاں چہ مشّاقانہ داد

از نگاہِ خواجۂ بدر و حُنینؓ
فقرِ سلطاں، وارثِ جذبِ حُسینؓ!

ہماری قومی تاریخ میں ٹیپو سلطانؒ وہ عہد آفریں شخصیت ہیں، جنہیں سب سے پہلے یہ احساس ہُوا کہ جو مغربی سامراج ہندوستان کے ساحلوں پر اُترنے کو بے تاب ہے، وہ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ پورے مشرق کو غلام بنانے کا پروگرام لے کر آ رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایران، وسط ایشیا اور ترکی سمیت پوری دنیائے اسلام کو اس خطرے کے پیشِ نظر متحد اور مستعد کرنے کی کوشش کی۔ مشرق اس خطرے کا جیتا جاگتا احساس نہ رکھتا تھا اور انگلستان کو ان ہی مسلمان ممالک کے حکمرانوں میں سے چند لوگ ٹیپو سلطانؒ کی مجوزہ تدابیر سے پیشگی آگاہ کر دیتے تھے، اس لیے وہ مسلمان ملکوں کو متحد اور سرگرمِ عمل کرنے میں ناکام رہا۔

ٹیپو سلطانؒ کے عہد میں ہندوستان صنعتی طور پر انگلستان سے بہت آگے تھا۔ ہندوستان کی مصنوعات کی انگلستان میں درآمد پر ہی پابندی نہ تھی بلکہ ہندوستانی کپڑا خریدنا اور پہننا بھی قابلِ دست اندازیٔ پولیس جرم تھا۔ ہندوستان میں مشین نہیں تھی، چنانچہ ٹیپو سلطانؒ برطانوی استعمار کی رقیب فرانسیسی استعماری قوت سے مشین درآمد کرنے کے جتن کرتا رہا۔ وہ اسی رقابت سے فائدہ اٹھا کر اپنی بحری قوت کی ترقی میں بھی کوشاں تھا مگر ''دوستوں'' کے کرم سے ٹیپو سلطانؒ کی یہ سب حکمت عملی ناکام رہی۔ اگر ٹیپو سلطانؒ مشین درآمد کرنے اور اپنے ہاں مشینی دور کا آغاز کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو پورے مشرق کی گزشتہ دو سو برس کی اور آئندہ ہزاروں برس کی تاریخ مختلف ہوتی۔ اگر ہندوستان میں بروقت مشین آ جاتی تو ہمارے دستکار انگریزوں سے پہلے صنعت کار بن جاتے اور لنکا شائر سے پہلے ہماری ٹیکسٹائل منصوعات اطرافِ عالم میں پھیل جاتیں۔ انگریزوں نے واٹرلو کے میدان میں فرانسیسی فوج کو جو شکست دی تھی، اُس کا راز جنگی قوت کی برتری میں پوشیدہ ہے جو انگریزوں کو ٹیپو سلطانؒ کے اسلحہ خانہ سے لُوٹے ہوئے اسلحہ نے بخشی تھی۔

ٹیپو سلطانؒ کی جانبازی اور سرفروشی کے ساتھ ساتھ اُن کا یہ نیا شعور اُن کی شہادت کے بعد سے لے کر اب تک ان تمام قوتوں کے لیے خطرہ بنا ہُوا

ہے جو اسلامی مشرق کو اپنی دائمی غلامی– سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ تہذیبی غلامی– میں رکھنے میں سرگرمِ عمل ہیں۔ ہم کہ ابھی تک مغرب سے درآمد ہونے والی کلچرل افیون کے نشے میں مست ہیں' اپنی تاریخ اور اپنے ہیروز کو مغرب کی آنکھوں سے دیکھتے چلے آتے ہیں اور آج بھی ٹیپو سلطانؒ کی یاد کو اپنے دل و دماغ کے قریب تک نہیں پھٹکنے دیتے۔ علامہ اقبالؒ ہمارے اور ہماری ملّت کے اس طرح کے امراض کے علاج کی فکر میں سرگرداں رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی نظم ''ٹیپو سلطانؒ کی وصیّت'' میں ہمیں اور آنے والی نسلوں کی ان اصول و اطوار اور ان معیار و اقدام کی جانب متوجہ کیا ہے جن سے سلطانؒ کی شخصیت عبارت تھی۔ یہ ایمان افروز نظم پیشِ خدمت:

تُو رہ نوردِ شوق ہے؟ منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جُوئے آب! بڑھ کے ہو دریائے تُند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز! گرمیٔ محفل نہ کر قبول

صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرائیلؑ نے
جو عقل کا غلام ہو' وہ دل نہ کر قبول

باطل دُوئی پسند ہے' حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

علامہ اقبالؒ نے کسی ایک شخصیت کے بارے میں اتنے اشعار نہیں کہے' جتنے ٹیپو سلطانؒ کے بارے میں۔ اس مد میں آغا شورش کاشمیریؒ' مولانا ظفر علی خانؒ' جناب ماہر القادریؒ کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ملاحظہ ہو آغا شورش کاشمیریؒ کی ایک دردانگیز نظم بعنوان ''ٹیپو سلطان کے مزار پر'':

اے رہ نوردِ شوق کہاں ہے کدھر ہے تُو
کہتا ہے دیکھ کتبۂ لوحِ مزار کیا

سُن گوشِ حق نیوش سے آوازِ انقلاب
او بے خبر شکایتِ لیل و نہار کیا

مر کے بھی اس زمیں پہ کیے ثبت نقشِ پا
دیکھا نہیں لکھا ہے سرِ رہ گذار کیا

شہ رگ کا خوں ہے عقدہ کشائے حیات و موت
اس شاہ راہ پہ زندگی مستعار کیا

شمشیرِ زرنگار سے ہے نظمِ کائنات
اس کے بغیر دغدغۂ روزگار کیا

4 مئی 1799ء کو سلطان کا قلعہ ہر طرف سے محاصرے میں آ چکا تھا۔ حسبِ معمول سلطان نے نمازِ فجر باجماعت ادا کی۔ سلطان کے پرائیویٹ سیکرٹری حبیب اللہ نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ جانِ عزیز پر رحم کھائیں اور شہزادوں کی یتیمی اور اسیری کا تصور کریں۔ سلطان نے جلالی انداز میں جواب دیا ''انسان کو موت صرف ایک بار آتی ہے' اس سے ڈرنا لاحاصل ہے۔ میں اپنی ذات اور اپنی اولاد کو اللہ تعالیٰ اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین پر نثار کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ مجھے موت سے نہ ڈرایئے۔''

—— آج 4 مئی ہے: سعود ساحر' اُمت' کراچی' 4 مئی 2012ء

بے کار و بے سبب ہیں نواہائے دل گداز
ان شاخچوں پہ نغمۂ شوقِ ہزار کیا

خونِ جگر سے موجِ صبا ہے غزل سرا
خونِ جگر نہ ہو تو خزاں کیا' بہار کیا

غیرت کی موت افضل و برتر ہے لاکلام
بکھرا پڑا ہے دیکھ یمین و یسار کیا

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تاریخِ روزگار کے نقش و نگار کیا

ہمّت بغیر سلطنتِ بحر و بّر حرام
غیرت بغیر تاجِ شہی کا وقار کیا
جن کونپلوں کو بادِ خزاں نے کِیا خراب
اب بھی ہے باغباں پہ انہیں اعتبار کیا
کُھلتے رہیں گے گردشِ دوراں کے پیچ وخم
بے معرکہ جئے تو خزاں کیا' بہار کیا

حضرت ماہرالقادریؒ کے چند اشعار:

آخری ہچکی نے دی اللہ اکبر کی صدا
نزع کے لمحات میں بھی تُو نے کی باطل سے جنگ

تُو نے کی تجدیدِ پیمانِ شہیدِ کربلاؑ
تُو نے بتلایا حفاظت جان کی ہے عُذرِ لنگ

جان دی اور کس قدر مسرور ہو کر جان دی
موت تھی تیرے لیے گویا نگارِ شوخ و شنگ

تیغ کی جھنکار پہ کرتی تھی تیری روح وجد
تیرے گوش و قلب تھے نا آشنائے عود و چنگ

وہ تو یہ کہیے کہ اپنے ہی پرائے ہو گئے
مٹ گیا تھا ورنہ سطحِ ہند سے نقشِ فرنگ

مولانا ظفر علی خانؒ نے سرنگا پٹم کی زیارت کے بعد جو دل گداز نظم کہی' اس میں بھی ٹیپو سلطانؒ کے قول کی بازگشت نظر آتی ہے۔ چند اشعار:

آخری قول یہ اس کا نہ ہمیں بُھولے گا
جس سے قائم ہوئیں آئینِ حمیّت کی حدود

شیر اچھا ہے جسے مہلتِ یک روزہ ملی
یا وہ گیدڑ جسے بخشا گیا صد سالہ خُلود

کِشورِ ہند کا رنگ اور ہی ہوتا کچھ آج
مکر کا دام بچھاتا نہ اگر چرخِ کبُود

سو رہا ہے ترے پہلو میں وہ میسور کا شیر[1]
مایۂ ناز تھا ملت کے لیے جس کا وجود

قوتِ بازوئے اسلام تھی اس کی صولت
اس کی دولت کے دعا گوؤں میں شامل تھے ہنُود

کہیں سوتے میں نہ کروٹ یہ مجاہد بدلے
اب بھی اس خوف سے ہیں لرزہ براندام حسُود

اس کے اُٹھتے ہی مسلمان کا گھر بیٹھ گیا
تھا قیامت کا قیام اور قیامت کا قعود

1۔ ٹیپو سلطانؒ کے والد حیدر علیؒ

امریکی مؤرخ کا خراجِ عقیدت

سلطان ٹیپو کی شہادت کے چوبیس سال بعد امریکی مؤرخ برڈز اور ڈکلف نے سلطان کے مزار کے قریب بیٹھ کر انگریزی زبان میں ایک نوحہ لکھا۔ اس کا اُردو ترجمہ روزنامہ ''انقلاب'' کے سالنامے میں شائع ہوا' اسے باری علیگ نے اپنی کتاب ''کمپنی کی حکومت'' میں شامل کیا جو طیّب پبلشرز لاہور نے 2001 میں شائع کی۔

''خون کی اس عمیق رات میں اے اسلام کی
شمعِ روشن! تیرا شعلہ بجھا دیا گیا
اور اقتدارِ شاہانہ کا عصا تیری قوم کے ہاتھ سے
چھن گیا!
تیری مسندِ جلال کے گرد
جھرمٹ تھا بے شمار سچے اور جگر دار غازیوں کا
آفتاب کی شعاعیں
جب پہاڑ کی چوٹیوں سے جھانکنے لگیں
تو آج ان غازیوں میں صرف وہی رہ گئے
جو تیرا ماتم کر رہے ہیں
اللہ اللہ!
اس حال میں کہ ہنگامۂ کارزار کے خونیں بادل
ہمارے سروں پر جھکے ہوں
موت بہتر ہے ایسی رُسوا کُن زندگی سے
جو سرمایہ دار ہو سالہا سال کے اندر وہ انفعال کی
اے آسمانِ جہاد کے ستارے! تُو غروب ہو گیا
لیکن ان ذلیل انسانوں کی طرح نہیں جنہیں
نامودی نے طوفانِ پیکار کی برہم و آشفتہ لہروں میں
غرقِ فراموش کر دیا
جو مغرور اور سربلند دشمنوں کے سامنے
خاکِ مذلّت پر سربسجود ہو گئے
معافی اور جان بخشی کے لئے
نہیں! تُو خاک و خون کے بستر پر سو گیا
فروزاں و سنوزاں آفتاب کی طرح
جس کی غضب ناک شعاعیں اُس وقت نمودار ہوں
جب اس کا دور ختم ہونے والا ہو
جس مقام پر
سطوت کے جاں سوز شعلوں کی لپک
اور خون آشام تلواروں کی زہرہ گداز جھنکار
فضا میں لبریز ہو رہی تھی اور مرنے والے
جلد جلد دم توڑ رہے تھے
آخری دم!
تُو شہنشاہ کی زندگی ٹھکرا کر میدان میں کودا
اور ایک سپاہی کی طرح شہید ہو گیا
تیرا بہادر اور قوی باپ
جنت میں اپنے تخت پر بیٹھا
تجھے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا
اس نے دیکھا کہ
تجھ میں اس کی روحِ جہاد تڑپ رہی ہے
یہ دیکھ کر اس کے جنّتی لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی
اس نے دیکھا کہ تُو دشمن پر آخری وار کر رہا ہے
اور تیری تلوار دشمن کے لئے سرخرو ہو رہی ہے
اس نے دیکھا کہ
تُو بہادروں کی نیند سو رہا ہے
اور تیرے گل رنگ زخم
سب کے سب سینے پر ہیں
اہلِ جنت نے نخلِ طُوبیٰ کے نیچے
اپنی زمردیں خلوتوں میں
شہید کے لئے
سدا بہار پھولوں کا ایک شاندار ہار گوندھا
اور فردوس کی جادو چشم حوروں نے
گوہریں رومال ہلا ہلا کر
خُلدِ بریں کی شفاف فضاؤں میں
مجاہدین کے سلطانِ اعظم کا خیر مقدم کیا''

یار لوگ ان ساری باتوں کو فراموش کر دینے میں ہی اپنی نجات کا سامان تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں صبحِ ازل ابلیس نے یہ پٹی پڑھائی تھی کہ خبردار! حق و باطل میں تفریق ہرگز نہ کرنا' ورنہ مارے جاؤ گے۔ موت کا خوف ان پر اس درجہ مسلّط ہے کہ وہ ٹیپو سلطانؒ سے یہ سبق نہیں سیکھنا چاہتے کہ موت بھی زندگی کے مقامات میں سے ایک مقام ہے - ایک ایسا خوبصورت مقام جو دوست کی جانب ہجرت کا دروازہ کھول دیتا ہے- تو وہ لوگ ٹیپو سلطانؒ سے ڈریں گے نہیں تو اور کیا کریں گے؟

راجہ تری دیورائے

پاکستان سے غیر مشروط وابستگی کی خاطر راج گھاٹ چھوڑ دینے والے مردِ با اصول کا تذکرہ

حسّان خالد

''بیٹا میں تمہیں واپس بنگلہ دیش لے جانے کے لئے آئی ہوں۔'' ماں نے نم ناک لہجے میں مجھے فون پر بتایا۔ اگلے دن نیویارک میں اپنے ہوٹل میں اپنی ماں سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ مجھے کافی پریشان نظر آئیں۔ ایک سال پہلے جب میری اُن سے آخری ملاقات ہوئی تھی، اس کی نسبت وہ مجھے اب کافی بوڑھی نظر آ رہی تھیں، لیکن ان کی آواز پہلے کی طرح مستحکم تھی۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد انہوں نے کافی مشکل حالات کا سامنا کیا، لیکن یہ انہیں توڑ نہ سکے تھے۔ شیخ مجیب اور ان کے وزیرِ خارجہ نے میری ماں کو اس لیے بھیجا تھا کہ وہ مجھے واپس بنگلہ دیش لا سکیں۔ شیخ مجیب کے رویّے میں یہ تبدیلی بھارت کے کہنے پر آئی تھی۔ ورنہ اس سے قبل جب میری ماں نے شیخ مجیب سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی اور اس سلسلے میں پیغام بھجوایا تھا، تو اُس کا جواب تھا: ''اُسے کہہ دو کہ وہ مغربی پاکستان چلی جائے۔'' اب اس کے بالکل برعکس رویّہ اپناتے ہوئے میری ماں سے شیخ مجیب نے کہا تھا: ''ہاں آپ کے بیٹے کو مشکلات کا سامنا ہے۔ مغربی پاکستان میں اسے دھمکا کر روکا گیا ہے۔ اسے واپسی پر آمادہ کرو، ہم ایک ہیرو کی طرح اس کا استقبال کریں گے۔''

1972ء میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کا ستائیسواں اجلاس منعقد ہو رہا تھا۔ 1971ء کی پاک بھارت جنگ کے نتیجے میں سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد یہ اقوامِ متحدہ کا پہلا اجلاس تھا۔ اس میں اقوامِ متحدہ میں بنگلہ دیش کی رُکنیت کی درخواست زیرِ بحث آنا تھی۔ پاکستان اصولی طور پر بنگلہ دیش کی اقوامِ متحدہ میں رکنیت کے خلاف نہیں تھا، لیکن اس کا موقف تھا کہ پہلے اسے رکنیت کے لیے ضروری ضابطے پورے کرنے چاہئیں۔ ذوالفقار علی بھٹو نے، جو اس وقت صدرِ پاکستان تھے، پاکستان کا مقدمہ لڑنے کے لیے راجا تری دیورائے کا انتخاب کیا اور انہیں اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے وفد کا سربراہ بنا کر بھیجا۔ راجا تری دیورائے نے 1970ء میں قومی اسمبلی کا الیکشن مشرقی پاکستان سے آزاد حیثیت میں جیتا تھا۔ مشرقی پاکستان کی 162 نشستوں میں سے 160 نشستوں پر شیخ مجیب کی عوامی لیگ نے کامیابی حاصل کی۔ راجا تری دیورائے اور جناب نورالامین (جو بعد ازاں پاکستان کے نائب صدر بنے اور اب رحلت کے بعد مزارِ قائدِ اعظمؒ کے کمپلیکس میں آسودۂ خاک ہیں) ایسے دو ارکانِ قومی اسمبلی تھے، جو عوامی لیگ کے ممبر نہیں تھے۔

اُدھر شیخ مجیب نے راجا تری دیورائے کی والدہ محترمہ کو اپنے وفد میں شامل کر کے نیویارک بھیجا تا کہ وہ اپنے بیٹے کو قائل کر سکیں کہ وہ واپس بنگلہ دیش آ جائیں۔ اس تحریر کے پہلے پیرے کی سطور راجا تری دیورائے کی خودنوشت (The Departed Melody) سے لی گئی ہیں، انہی میں راجہ تری دیورائے کا اپنی والدہ محترمہ سے ملاقات کا ذکر ہے۔

اپنی والدہ محترمہ کے اصرار کے باوجود راجا تری دیورائے اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ پاکستانی وفد اقوامِ متحدہ پہنچا تو سو ممالک بنگلہ دیش کی

اقوامِ متحدہ میں شمولیت کے لیے بظاہر رضا مند تھے لیکن پاکستانی وفد اوراس کے قائد 39 سالہ راجہ تری دیورائے کی انتھک اور کامیاب لابنگ نے کئی ممالک کو اپنے موقف کا ہمنوا بنایا۔ چین' ایران اور ترکی نے پاکستانی موقف کو منوانے میں اہم کردار ادا کیا۔ پاکستانی موقف کو کامیابی حاصل ہوئی اور بنگلہ دیش کی اقوامِ متحدہ میں رُکنیت کو ملتوی کر دیا گیا۔

اس زبردست کامیابی پر صدرِ پاکستان نے فون کر کے راجا تری دیورائے کو مبارکباد دی۔ جب پاکستان کا وفد چکلالہ ائیر پورٹ راولپنڈی پہنچا تو صدر ذوالفقار علی بھٹو اپنی پوری کابینہ اور دوسرے حکومتی عہدے داروں کے ساتھ استقبال کے لیے موجود تھے۔ اس موقع پر انہوں نے بڑی جذباتی تقریر میں کہا: ''راجا تری دیورائے نے بنگلہ دیش اور بھارتی حکومتوں کی بھرپور مزاحمت اور راجا تری دیورائے کو ہموار کرنے کی پوری کوشش کے باوجود پاکستان کا مقدمہ بہت موثر انداز میں لڑا۔ چٹاگانگ میں ان کا خودمختار علاقہ قائم کرنے تک کی پیشکشوں کو ٹھکرا دیا جو انہیں پاکستانی وفد کو چھوڑ کر بنگلہ دیش واپس آنے کے لیے کی گئی تھیں۔ انہوں نے حب الوطنی کے عظیم الشان جذبے کا مظاہرہ کیا ہے جس کے لیے ساری پاکستانی قوم ان کی شکر گزار ہے۔ راجا صاحب جب تک چاہیں' اپنے وطن پاکستان میں جہاں چاہیں رہیں۔ جس دن آپ نے مشرقی پاکستان واپس جانے کا فیصلہ کیا' ہم پورے احترام اور اعزاز کے ساتھ آپ کو الوداع کریں گے اور آپ کے بارے میں ہمارے دل میں کوئی غلط فہمی نہیں ہوگی۔''

راجا تری دیورائے کو ذہنی طور پر اس طرح سے استقبال کی توقع نہیں تھی۔ انہوں نے جوابی تقریر میں صدرِ پاکستان سے کہا: ''یہ آپ کی مہربانی' مگر مَیں نے ایک پاکستانی کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کیا۔ پاکستان میرا ملک اور میری پہچان ہے' میرا رہنا' جینا' مرنا یہیں ہے۔ آپ نے بہت بڑا اہتمام کر ڈالا میری عزت افزائی کے لئے۔''

صدرِ پاکستان کا جواب تھا: ''یہ ضروری تھا۔ ملک کے لیے جس نے اتنی منفرد قربانی اور بھرپور خدمات انجام دی ہیں' اس کے کارناموں کو تاریخ کا حصہ بنانا چاہیئے۔''

راجا تری دیورائے 14 مئی 1933ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے میں بسنے والے چکما قبیلے سے تھا۔ چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں کی اپنی ایک الگ تاریخ رہی ہے۔ یہاں مختلف اقوام' قبائل اور مذاہب کے لوگ بستے ہیں۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے یہ خودمختار علاقے تھے جن کا انتظام مقامی روایات کے مطابق راجا چلاتے تھے۔

انگریزوں نے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور قیامِ پاکستان کے بعد جب بنگال کی حد بندی ہوئی تو انہیں مشرقی پاکستان کا حصہ قرار دیا گیا۔ وہاں کے مقامی رہنماؤں کا مطالبہ تھا کہ ہماری جداگانہ حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے ہمیں آزاد علاقہ قرار دیا جائے' جہاں ہم اپنے رسم و رواج کے مطابق گزر بسر کر سکیں۔ 1948ء میں قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ نے چٹاگانگ کا دورہ کیا تو چکما قبائل کے سرداروں نے یہی مطالبہ ان کے سامنے دوہرایا۔ قائدِ اعظمؒ نے یقین دلایا کہ انہیں پاکستان کے آئین کے اندر رہتے ہُوئے مکمل آزادی دی جائے گی۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد وہاں خانہ جنگی زور پکڑ گئی اور بالآخر 1997ء میں بنگلہ دیش حکومت کو ان کے ساتھ امن معاہدہ کرنا پڑا۔

1953ء میں اپنے والد کی وفات کے بعد انہیں چکما راجا بنایا گیا۔ وہ پچاسویں چکما راجا تھے۔ وہ دو دفعہ مشرقی پاکستان کی صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اپنے قبائل اور علاقے کے لیے ''سپیشل سٹیٹس'' کے پُرزور

حامی تھے‘انہوں نے یہ مطالبہ جاری رکھا۔1970ء کے الیکشن سے پہلے شیخ مجیب نے انہیں عوامی لیگ میں شمولیت کی دعوت دی تو انہوں نے پہاڑی علاقوں پر مشتمل حصے کے لیے خودمختاری کا مطالبہ کر دیا جس کے لیے مجیب تیار نہیں تھا۔الیکشن جیتنے کے بعد وہ 9 نومبر 1971ء کو مغربی پاکستان آئے۔اس کے فوراً بعد سقوطِ مشرقی پاکستان کا سانحہ پیش آ گیا۔ انہیں پاکستان کا اقلیتی امور کا وزیر بنا دیا گیا۔سیاحت کے محکمے کا اضافی چارج بھی دیا گیا۔طویل عرصہ مختلف ممالک میں سفیر کی حیثیت سے انہوں نے پاکستان کے لیے بے لوث خدمات سرانجام دیں۔یہاں اس امر کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ سفارتی ذمہ داریوں کے دوران انہوں نے بنگلہ دیش کے سفارت خانوں میں ہونے والی کسی بھی تقریب میں کبھی بھی شرکت نہ کی۔راجا تری دیورائے کا مذہب بدھ مت تھا اور وہ بدھ مت سوسائٹی کے چیئرمین بھی تھے۔ایسے ممالک جہاں بدھ مت مذہب کے پیروکار رہتے ہیں‘انہیں خصوصی عزت اور احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ انہوں نے برما میں مسلمانوں کا قتلِ عام کرنے کے ذمہ داروں کی کُھل کر مذمت کی۔2003ء میں وزیرِاعظم پاکستان میر ظفراللہ خان جمالی نے ان سے درخواست کی کہ وہ تاحیات وفاقی وزیر کا عہدہ قبول کریں جسے انہوں نے بخوشی قبول کیا۔

ایک کامیاب قبائلی سردار (راجا)‘ سیاستدان اور سفارت کار ہونے کے ساتھ ساتھ‘ راجا تری دیورائے ادیب کی حیثیت سے بھی ممتاز مقام کے حامل تھے۔انگریزی میں ان کے افسانوں کے دو مجموعے "The Windswept Bahini" اور "They Simply Belong" کے ناموں سے شائع ہوئے۔ایک کتاب کا پیش لفظ فیض احمد فیض نے لکھا۔ "The Windswept Bahini" میں شامل ایک پُر تاثیر کہانی The Jewel of a Girl انٹرمیڈیٹ کی سطح پر نصاب کا حصہ رہی۔ ان کے منتخب افسانوں کا اردو ترجمہ ’’انسان خطا کا پتلا ہے‘‘ کے نام سے نیشنل بک فاؤنڈیشن نے چھاپا۔ان کا کہنا تھا کہ ان کی کہانیوں کے بعض کردار اُن کے اپنے لوگ ہیں‘ جن کے ساتھ انہوں نے وقت گزارا اور کچھ ایسے مقامات کا ذکر ہے جہاں ان کی زندگی کا کچھ حصہ بسر ہُوا۔

جنوبی امریکی ممالک ارجنٹینا‘ چلی‘ ایکواڈور‘ میکسیکو اور پیراگوئے میں انہوں نے طویل عرصہ تک پاکستانی سفیر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ان ممالک میں ان کی مصروفیات کے حوالے سے ان کی کتاب "South American Diaries" کو خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ ان کی یادداشتوں پر مبنی کتاب "The Departed Melody" میں انہوں نے چکما راجاؤں کی تاریخ اور اپنے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی اور اپنے قبیلے اور علاقے کے لوگوں کا مقدمہ بڑے احسن طریقہ سے پیش کیا ہے۔انہوں نے علامہ اقبالؒ کے مشہور مصرعہ ’’سَرُ ودِرفتہ باز آید کہ ناید‘‘ کا ترجمہ "The Departed Melody" کر کے اپنی خودنوشت کا نام دیا۔

راجا تری دیورائے قائدِاعظمؒ اور علامہ اقبالؒ سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔تقریر‘ تحریر و گفتگو میں قائدِاعظمؒ کی تقاریر اور علامہ اقبالؒ کے اشعار کا حوالہ دیتے۔آخری دنوں میں پاکستان کے احوال سے دل گرفتہ رہتے تھے۔راجا تری دیورائے 17 ستمبر 2012ء کو اسلام آباد میں انتقال کر گئے!بے شک وہ ایک پکّے سچے اور کھرے پاکستانی تھے۔ستائش کی تمنّا‘ نہ صلے کی پروا کی عملی تفسیر اور منتظر نقوی کے اس شعر کی اُجلی تصویر:

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ
سُن رکھو تم ‘ فسانہ ہیں ہم لوگ!

رَشکِ چمن

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جستجو کر دے!

— اقبالؒ

خودانحصاری

سید یوسف حُسین شیرازی

عالمی معیشت غیر مربوط ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی آبادی ایک ارب اور اُن کی آمدن عالمی مجموعی آمدن کا اسّی فیصد ہے۔ ترقی پذیر ممالک کی آبادی پانچ ارب اور اُن کی آمدن عالمی مجموعی آمدنی کا بیس فیصد ہے۔ امریکی معیشت زوال پذیر ہے' اس کی کریڈٹ ریٹنگ کم ہوگئی ہے۔ یورپ کے سیاسی' معاشی اور سماجی حالات بھی خراب ہیں۔ مزید برآں واشنگٹن کنسنسس (Washington consensus) کی حالیہ ناپائیداری کی وجہ سے اب ترقی پذیر ممالک کو اپنی ضروریات پورا کرنے کے لئے اپنے ہی وسائل پر انحصار کرنا ہوگا یعنی گلوبلائیزیشن نہیں' گلوکولائیزیشن۔

یہ امر پاکستان پر بھی لاگو ہوگا' لیکن پاکستان کے پاس اتنے وسائل ہیں کہ ان پر انحصار کر کے سیاسی اور اقتصادی خودمختاری حاصل کی جاسکتی ہے۔ ورلڈ بنک اور ایف بی آر کی ایک ریسرچ رپورٹ کے مطابق ملک کی 56 فیصد معیشت پر پورا ٹیکس ادا نہیں کیا جاتا۔ اگر صحیح ٹیکس ادا کیا جاتا تو سال 2010-11ء میں 1.973 ارب روپے اضافی آمدنی ہوسکتی تھی جس سے کُل آمدنی بڑھ کر موجودہ 3.523 ارب روپے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتی۔ فیڈرل بورڈ آف ریونیو (ایف بی آر) کے چیئرمین کا تو کہنا ہے کہ ٹیکس نہ ادا کیا جانے والی معیشت مجموعی آمدنی کا 79 فیصد ہے جس سے 5.831 ارب روپے حاصل ہو سکتے ہیں اور مجموعی آمدنی 7.381 ارب روپے ہوسکتی ہے۔ اگر یہ رقم ہی وصول کر لی جائے تو پاکستان کو کسی امداد یا قرضے کی ضرورت نہیں جس کے لئے ہمیں اپنی سیاسی' سماجی اور اقتصادی خودمختاری کو داؤ پر لگانا پڑتا ہے۔

لمحۂ فکریہ ہے کہ ہم ترقی یافتہ ممالک کی تقلید کرتے ہیں جو لبرلائیزیشن' ڈی ریگولیشن اور پرائیوٹائیزیشن کا دعویٰ تو کرتے ہیں' لیکن خود اس پر عمل نہیں کرتے۔ پاکستان کو اس گلوبلائزیشن کے نظریے سے بچنا چاہیے۔ آئی ایم ایف کے سابق مینجنگ ڈائریکٹر (ڈومینیق سٹراس کاہن) بھی ان الفاظ میں اس کی مذمت کرتے ہیں:

''گلوبلائیزیشن کی وجہ سے بے روزگاری' سماجی ناپائیداری اور سیاسی عدم استحکام پیدا ہُوا۔ اس مہلک امتزاج سے معاشی توازن بُری طرح متاثر ہُوا۔''

عالمی بنک کے سابق صدر (وولفنسن) نے ان الفاظ میں توثیق کی:

''گلوبلائیزیشن کے عمل سے لوگوں کی امیدیں مدھم پڑ گئیں۔ ان کی مایوسی اور ناامیدی کے مناظر تکلیف دہ ہیں' لہٰذا مقامی ملکیت اور مقامی شراکت کی ضرورت ہے۔ وہ دن گئے جب ترقی کے منصوبے واشنگٹن یا مغربی دارالحکومتوں میں یا کہیں اور بند دروازوں کے پیچھے بنتے تھے' اب معاملہ اور ہے یعنی گلوکولائیزیشن''!

گلوبلائیزیشن کی تقلید میں پاکستان سراسر خسارے میں رہا ہے۔ پاکستان کی صنعت کو کم پیداوار' بے روزگاری اور قلیل بچت جیسے مسائل کا سامنا رہا۔ مثلاً یہاں دس فیصد غریب ترین طبقہ قومی آمدنی کا صرف چار فیصد حاصل کر پاتا ہے' جبکہ دس فیصد امیر ترین طبقہ اس کا ستائیس فیصد۔ پس ہمیں

اپنی توجہ گلوبلائیزیشن کی بجائے گلوکولائزیشن پر مرکوز کرنا چاہئے۔

آج کل پاکستان اور بھارت کے درمیان تجارت کا بھی چرچا ہے۔ اس باہمی تجارت سے فائدہ اُٹھانے کے لیے پاکستان کو دونوں ممالک کے مابین زرِمبادلہ کے فرق کا خیال رکھنا پڑے گا۔ مثال کے طور پر پاکستان میں ایک ڈالر 96 روپے کا ہے جبکہ بھارت میں 54 روپے کا۔ بھارتی معیشت متوازن اور تحفظ یافتہ ہے یعنی جو اشیاء بھارت میں بنائی جاتی ہیں، وہ محصولات یا دوسری پابندیوں کے باعث بھارت میں درآمد نہیں کی جاسکتیں۔ بھارت میں موٹر سائیکل بنانے والے سات اور کار بنانے والے چار کارخانے ہیں۔ پاکستان میں موٹر سائیکل بنانے والے 65 ادارے کام کررہے ہیں اور مزید کی آمد آمد ہے۔ کئی ادارے استعمال شدہ کاریں درآمد کرتے ہیں جس سے سال بہ سال مقامی صنعت کو نقصان پہنچتا ہے۔ بھارت کی پیداواری صلاحیتیں روز مرہ اشیاء سے بڑھ کر مشینیں وغیرہ بنانے تک پہنچ چکی ہیں۔ بھارت انجینئرنگ، کیمیکل پلانٹس حتیٰ کہ ایٹمی اور دیگر پرزہ جات برآمد کرتا ہے بلکہ خود کار گاڑیاں بھی برآمد کرنے کے قابل ہوگیا ہے۔

عالمی حالات کی بے یقینی اور امن وامان کی صورتِ حال سے قطع نظر، غیر ملکی سرمایہ کار پاکستان میں سرمایہ کاری کرنے سے گریزاں ہیں، کیونکہ یہاں آئے دن پالیسیاں تبدیل ہوتی رہتی ہیں جن سے اُن اشیاء کی درآمد کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے جو غیر ملکی سرمایہ کار پاکستان میں پیدا کرسکتے ہیں۔ اب پاکستانی سرمایہ کار بھی ملائشیا میں سرمایہ کاری کرنا چاہتے ہیں کیونکہ وہاں پالیسیوں کا تسلسل ہے جو سرمائے کے تحفظ کا ضامن ہے۔

پاکستان دنیا کا چھٹا بڑا ملک ہے جہاں اٹھارہ ارب کنزیومرز ہیں اور جی ڈی پی کے 5 فیصد جتنی خیرات دیتے ہیں۔ یہ شرح دنیا میں سب سے زیادہ ہے، جبکہ ٹیکس کی ادائیگی مجموعی جی ڈی پی کے 8.6 فیصد کے برابر ہے جو دنیا میں کم ترین ہے۔ اس کے اسباب وہی ہیں، یعنی 79 فیصد آمدنی جس پر یا تو ٹیکس دیا ہی نہیں جاتا یا پھر مختلف اشکال میں ٹیکس کی چھوٹ حاصل ہے۔ بین الاقوامی تجارت پر ٹیکس کی راشن بندی کی حوالے سے ایک تازہ سروے میں مشورہ دیا گیا ہے کہ محصولات میں چھوٹ ختم کی جائے، ٹیرف کو تمام سیکٹرز کے لئے مناسب اور یکساں بنایا جائے، ڈیوٹی فری درآمدات کا حجم کم کردیا جائے اور درآمدات پر زیرورریٹنگ کو کم سے کم کردیا جائے۔ اسی طرح جی ڈی پی میں بین الاقوامی تجارت سے ٹیکس کا تناسب بڑھے گا۔

فری ٹریڈ ایگریمنٹس (ایف ٹی ایز) اور پریفرینشل ٹریڈ ایگریمنٹس (پی ٹی ایز) کا ازسرِنو جائزہ لینا ہوگا تاکہ ان ممالک کے ساتھ برآمدات اور زرِمبادلہ کے فوائد کا کسٹم ڈیوٹی میں چھوٹ وغیرہ سے موازنہ کیا جاسکے۔

یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ بین الاقوامی تجارت کے حوالے سے درآمدات سے ٹیکس وصولی اور جی ڈی پی میں اس کا کیا تناسب ہے۔ چند شعبوں پر درآمدات کے حجم میں ذرا سی تبدیلی محصولات کی آمدنی کو تہہ وبالا کرسکتی ہے، لہٰذا آمدنی میں اضافے کے لئے ضروری ہے کہ محصولات میں توازن ہو اور یہ تمام شعبوں پر لاگو کئے جائیں۔ مختلف شعبوں میں محصولات میں واضح فرق ہے۔ گاڑیوں پر بھاری ٹیکس سمجھ میں آتا ہے، لیکن سال 2010-11ء کے لئے مجملہ تقریباً 195 ارب روپے کی بھاری رقم کسٹم ڈیوٹی کی مد میں چھوٹ کے لئے مختص کی گئی۔ چار سو اشیاء پر زیرورٹینگ کی وجہ سے کوئی آمدنی نہیں ہوئی۔ یہ نقصان بھی چھوٹ کے علاوہ ہے۔ ماضی کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ قابلِ ڈیوٹی اشیاء کی درآمد ہمیشہ ڈیوٹی فری اشیاء کی درآمد کے مقابلے میں زیادہ رہی، گزشتہ چند برسوں سے صورتِ حال بدل گئی۔ ڈیوٹی فری درآمدات (بشمول زیرو ریٹنگ) کا تناسب اب مجموعی درآمدات کے نصف سے بھی تجاوز کرگیا ہے۔

اسی لئے جی ڈی پی میں ٹیکس کا تناسب نہایت قلیل ہے۔پچھلی دو دہائیوں میں خصوصاً محصولات میں اصلاحات اور زیرو ریٹنگ سمیت ٹیکس کی چھوٹ کی وجہ سے نہ صرف درآمدی محصولات کی مد میں کمی واقع ہوئی ہے' بلکہ جی ڈی پی میں اس کا تناسب بہت گر گیا ہے' لہٰذا محصولات میں اضافے کی شدید ضرورت ہے۔اس کے لئے ٹیکس کی بنیاد کو وسیع اور ٹیکسوں میں چھوٹ کو ختم کرنا ہوگا کیونکہ درآمدی سٹیج پر اتنی چھوٹ سے آمدنی نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہے۔

پاکستان کی معیشت پائیدار ہے' پاکستان کی ٹیکسٹائل کی صنعت دنیا بھر میں پانچویں نمبر پر ہے۔ملک میں سونے کے ذخائر بھی پانچویں نمبر پر ہیں۔ اس کے علاوہ ملک میں کوئلے' چاندی اور دیگر معدنیات کا بیش بہا ذخیرہ ہے جسے ابھی تک استعمال نہیں کیا گیا۔ پاکستان کی افرادی قوت بھی بہترین ہے لہٰذا بلا مبالغہ سرمایہ کاری' پیداوار اور برآمدات' سماجی انفراسٹرکچر' بجلی کی پیداوار' انرجی' پانی اور ٹرانسپورٹ کے شعبوں اور مقامی معیشت میں مقامی لوگوں کی رسائی گلوبلائیزیشن سے نہیں' گلوکولائیزیشن سے ہی روزگار کے مواقع مہیا کئے جا سکتے ہیں تاکہ عوام کو روٹی کپڑا اور مکان مناسب رقم میں فراہم کیا جا سکے۔

اکتوبر 2012ء میں ایک قومی مشاورت بعنوان ''پاکستان کی معیشت کو کیسے ازسرِنَو بحال کیا جائے'' کا اہتمام کیا گیا۔حقیقت میں اس مشاورت کا اصل مقصد معیشت کو مکمل تباہی سے بچانا تھا اس لئے معیشت کی بحالی پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔

موجودہ حالات میں پاکستان کو قلیل المیعاد اور طویل المیعاد معاشی چیلنج درپیش ہیں اور مالیاتی نظم وضبط کی بحالی' قیمتوں میں استحکام برقرار رکھنا اور معاشی ترقی کا فروغ مختصر المیعاد معاشی چیلنجز کا محور ہیں۔ نیا ایوارڈ سامنے آنے کے بعد مالیاتی پالیسی سے نبرد آزما ہونا بھی ایک معاشی چیلنج ہے۔

منزل ہماری — خوداتحصاری

جادہ ہمارا خوداعتمادی' منزل ہماری خود انحصاری
دولت ہماری کامل بھروسہ' طاقت ہماری محنت شعاری
خوددار بن کر زندہ رہیں گے' اپنے وسائل سے کام لیں گے
اپنے چمن کی مِل کر کریں گے' اپنے پسینے سے آبیاری
پختہ ارادہ دن رات محنت' جُہدِ مسلسل تا خود کفالت
واجب ہے ہم پر لازم ہے ہم پر' ناموسِ ملّت کی پاسداری
میرے وطن کے غیّور لوگو! آسودگی کی تدبیر سوچو
کشکول لیکر کب تک پھریں گے' کب تک رہیں گے آخر بھکاری
مل کر سجاؤ اپنے چمن کو' جنّت بناؤ پیارے وطن کو
قریہ بہ قریہ کُوچہ بہ کُوچہ' لہرائے جھومے بادِ بہاری
آؤ جوانو! وعدہ کریں ہم' جھکنے نہ دیں گے یہ سبز پرچم
آگے بڑھو اور ہاتھوں میں لے لو' اِس کی حفاظت کی ذمّہ داری
لکھّیں گے ہم سب لوحِ ازل پر' اپنے قلم سے اپنا مقدّر
دیکھے گا سورج غیرت ہماری' مانے گی دنیا عظمت ہماری

—— عاشق حسین عاشق

معاشی ترقی کے راستے سے رکاوٹیں کیسے دور ہوں؟ یہ وسط المیعاد اور طویل المیعاد معاشی چیلنج ہے۔معاشی ترقی کی راہ میں حائل رکاوٹوں پر غالب آنے کے لئے بہت سے طریقے ہیں۔توانائی کے بحرانوں (گیس اور بجلی) کے باوجود نجی کاروبار کو بڑھانے کے لئے انسانی وسائل کو بہتری' ملک کے مادی انفراسٹرکچر کو وسعت دینا' ٹیکس نظام اور انتظامیہ میں اصلاحات لانا اور غیر معمولی مالیاتی نظام کی تعمیر شامل ہیں۔معاشی ترقی کی راہ میں بدانتظامی' بدعنوانی اور مبہم معاشی پالیسی جیسی رکاوٹوں کو دُور کیا جانا بھی بے حد ضروری ہے۔قلیل المیعاد' وسط المیعاد اور طویل المیعاد منصوبوں کے ذریعے معاشی چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کی ضرورت ہے۔ان چیلنجز

کے حل سے میکرو اکنامک صورتِ حال مستحکم ہوگی' دوسری طرف ترقی کی اہم اصلاحات سے معاشی ترقی کو فروغ حاصل ہوگا۔

مختصر المیعاد معاشی چیلنجز سے نمٹنے کے لئے مالیاتی نظم وضبط قائم رکھنا شرطِ اول ہے۔میکرو اکنامکس میں استحکام حاصل کرنے کے لئے مضبوط مالیاتی حیثیت ضروری ہے۔مضبوط اور غیر معمولی معاشی ترقی کے فروغ اور ابدی غربت کے خاتمے کے لئے اسے اہم عنصر تسلیم کیا گیا ہے۔

پبلک پالیسی میں بڑھتے ہوئے اخراجات کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے محصولات کی وصولی کو ایک خاص حد اور سطح تک ممکن بنانا ضروری ہے۔محصولات میں اضافے کے لئے ٹیکسوں کی شرح میں کمی' ٹیکس بیس میں وسعت' درآمدات اور سرمایہ کاری سے اصراف اور آمدنی میں ٹیکسوں کی بار بار منتقلی ٹیکس بڑھانے کے لئے سازگار ماحول کی فراہمی کے لئے ضروری اقدامات ہیں۔معیشت کے ہر شعبے کو ٹیکس نظام کے دائرہ کار میں لانا ہوگا۔اگر کوئی شعبہ قابلِ ٹیکس ہو تو اس پر ٹیکس لازماً عائد کیا جائے۔ مساویانہ اور عدل پر مبنی ٹیکس کے ہر شعبے سے حاصل ہونے والی آمدنی پر اطلاق ہونا چاہیے۔

امکانی شعبہ جات بشمول زرعی آمدن' ڈاکٹروں' وکلا' بیوٹی پارلرز' چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ' تھوک فروش' خوردہ فروش اور ٹرانسپورٹرز کی آمدنی کو بھی بالواسطہ طور پر ٹیکس نظام میں شامل کیا جانا چاہیے۔ودہولڈنگ ٹیکس کے طریقے ونظام میں بہتری سے حکومت کے محصولات میں غیر معمولی اضافہ ہوگا۔ ودہولڈنگ ٹیکس اور ایجنٹس کے ذریعے جمع ہونے والے ٹیکس' سرکاری خزانے میں جمع نہیں ہوتے۔مقامِ مسرت ہے کہ اب ایف بی آر نے اس معاملہ پر توجہ دینے کے لئے کوششیں شروع کر دی ہیں۔ اخراجات کی مد میں مخدوش پبلک سیکٹر انٹر پرائزز کے مستقبل کے لئے اہم فیصلہ کرنا چاہیے۔آخر کب تک ٹیکس ادا کرنے والوں کے پیسوں سے ان مخدوش' ناکام' خستہ حال اداروں کو چلایا جاتا رہے گا۔وقت آ گیا ہے کہ ان ناکام اداروں کو فروخت کر دیا جائے۔ان معاملات کو حل کرنے کے لئے بہترین دستیاب ٹیم تعینات کی جائے۔اس طرح کم سے کم 300 بلین روپے بچائے جا سکتے ہیں اور وہی روپیہ لاکھوں غریب اور لاچار لوگوں اور ملک کے جسمانی وانسانی انفراسٹرکچر کی بہتری کے لئے خرچ کیا جا سکتا ہے۔بجلی کے شعبے سے غلط طریقے سے نمٹنے کے نتیجے میں گردشی قرضوں کا بار ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ چکا ہے۔بجلی کے ٹیرف میں اضافے سے گردشی قرضوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔بجلی کے ٹیرف میں اضافہ' ٹیکس کی شرح میں اضافے کے مساوی ہے۔یہ عام فہم بات ہے کہ ٹیکس کی شرح میں اضافہ کرنے سے عوام ٹیکس ادا کرنے سے دُور بھاگتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہم بجلی کے ٹیرف میں اضافہ کرتے رہیں' تو لوگ ناجائز ذرائع کا استعمال کرتے ہوئے بجلی کے باقاعدہ بل ادا کرنے کے بجائے بجلی چوری یا واپڈا اہل کاروں سے مل کر سرکاری خزانے کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ جب تک تکنیکی نقائص اور بجلی کی چوری جیسے مسائل موجود رہیں گے' گردشی قرضوں کے مسائل بھی درپیش ہوں گے۔گزشتہ سال کُل مجموعی پیداوار 6.5 فیصد مالیاتی خسارہ کم کر کے 3.0 فیصد تک کم کرنا ہوگا۔مالیاتی نظم وضبط کا عزم کیا جائے تو یہ ہدف حاصل کیا جا سکتا ہے۔

مالیاتی خسارے میں کمی سے حکومت کی قرض لینے کی ضروریات میں بھی کمی ہوگی' نتیجتاً سٹیٹ بینک آف پاکستان سود کی شرح کم کر دے گا اور نجی شعبے کو قرضے حاصل کرنے کی آسانی ہوگی اور حکومت کی جانب سے سٹیٹ بینک سے قرض لینے میں بھی کمی ہوگی جس سے افراطِ زر میں اعتدال واقع ہوگا۔

مذکورہ بالا گزارشات پر عمل کر کے معاشی چیلنجز کا مقابلہ ہو سکتا ہے جن کا نتیجہ خوش حالی اور خود انحصاری کی صورت میں نکلے گا۔

آبی ذخیرے

محمد سفیر تارڈ

اللہ رب العزت نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا اور ہر زندہ چیز اپنی بقاء اور تسلسل کے لئے پانی کی محتاج ہے' جبکہ دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی اور اس کی روز افزوں ضروریات کے لئے درکار پانی کی مقدار میں مسلسل کمی آ رہی ہے۔ دنیا بھر کے ممالک اپنے آبی وسائل کو ترقی دینے اور ان میں اضافے کے لئے اقدامات کرنے میں مصروفِ عمل ہیں۔

پاکستان کو قدرت نے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح وافر آبی وسائل سے بھی نوازا ہے۔ بلند و بالا پہاڑوں پر سردیوں میں پڑنے والی برف کے گرمیوں میں پگھل جانے اور گرمیوں میں ہونے والی بارشوں کا پانی جھرنوں' آبشاروں' ندیوں اور نالوں سے ہوتا ہوا دریاؤں کا رُوپ دھارتا' اللہ تعالیٰ کی نعمت کی نوید بن کر ہمارے درِ احساس پر دستک دے کر سمندر میں جا گرتا ہے۔

ملکی معیشت میں زراعت کی کلیدی حیثیت سے کسی کو انکار نہیں۔ ملک کا 35 ملین ایکڑ رقبہ نہروں اور ٹیوب ویلوں کے ذریعے سیراب ہوتا ہے۔ 1947ء سے 1976ء کے دوران نہروں کے ذریعے دستیاب پانی کی مقدار 67 ملین ایکڑ فٹ سے بڑھ کر 106 ملین ایکڑ فٹ تک پہنچ گئی۔ پانی کی مقدار میں مذکورہ اضافہ منگلا' تربیلا اور چشمہ کے آبی ذخیروں کی تعمیر سے ممکن بنایا جا سکا۔ 1976ء کے بعد سے اب تک نہری پانی کی دستیابی میں مزید اضافہ نہیں کیا جا سکا' پانی کی موجودہ مقدار تین فی صد سالانہ کے تناسب سے بڑھتی ہوئی ملکی آبادی کی ضروریات کے لئے کافی نہیں۔ دوسری جانب تربیلا' منگلا اور چشمہ کے آبی ذخیروں میں پانی محفوظ کرنے کی گنجائش میں 2012ء تک 5.58 ملین ایکڑ فٹ کمی واقع ہو چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ منگلا ڈیم ریزنگ پراجیکٹ جیسے بروقت اقدام کی بدولت منگلا کے آبی ذخیرے سے گاد نکال کر اس کی افادیت کو پہلے سے زیادہ بڑھا دیا گیا ہے۔ ڈیموں اور آبی ذخیروں میں گاد بھرنے کا موجودہ قدرتی تناسب برقرار رہا تو ہمارے بڑے آبی ذخیروں کی گنجائش میں 2015ء تک 6.27 ملین ایکڑ فٹ کی کمی ہو جائے گی۔

پاکستان کی آبادی میں مسلسل اضافہ اور آبی وسائل میں متواتر کمی آ رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ 1951ء میں 5650 مکعب میٹر فی کس پانی دستیاب تھا جو 2012ء میں کم ہو کر 1145 مکعب فی کس رہ گیا۔ پانی کی شدید قلت کے شکار ممالک میں شامل ہونے سے بچنے کے لئے کم از کم ایک ہزار مکعب میٹر فی کس پانی کی دستیابی ضروری ہے۔ پانی میں کمی کی یہی صورتِ حال رہی تو 2014ء میں پاکستان کو پانی کی شدید قلت کا سامنا ہوگا۔

شعبۂ آب میں سرمایہ کاری کی منصوبہ بندی کے مطالعات کے مطابق پاکستان کو 13-2012ء کے دوران بارہ ملین ٹن غلہ کی قلت کا سامنا ہوگا۔ اس غذائی قلت کو کاشتکاری کے طریقِ کار کو بہتر بنانے اور ٹیکنالوجی کے استعمال سے پورا کرنا بھی مشکل ہے' اس لئے ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ نئی اراضی کو زیرِ کاشت لایا جائے۔ اگر آبپاشی کے لئے ضروری

وسائل مہیا ہوں تو مزید 22.5 ملین ایکڑ اراضی کو زیرِ کاشت لا کر غذائی قلت سے نمٹا جا سکتا ہے۔

ایک طرف آبی وسائل کی کمی کے نتیجے میں ہماری فصلوں کی پیداوار میں کمی آ رہی ہے تو دوسری جانب تھرمل بجلی کے حصول پر اُٹھنے والے اخراجات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے جس سے زراعت اور صنعت کے شعبوں میں بھی اضافی لاگت کا دباؤ بڑھ رہا ہے۔ دسمبر 2011ء میں ایوانِ صنعت و تجارت لاہور کا دورہ (جولائی 2012ء) کرنے والے عالمی بنک کے تین رکنی مشن نے نشاندہی کی کہ پاکستان میں صنعتوں کی پیداواری لاگت دوسرے ملکوں کے مقابلے میں زیادہ ہونے کے باعث غیر ملکی سرمایہ کاری اور مشترکہ منصوبوں کے امکانات کم ہو رہے ہیں۔

یہ صورتِ حال تقاضا کرتی ہے کہ ہم آبپاشی کی بہترین سہولتوں کے ذریعے اپنی اراضی سے زیادہ سے زیادہ پیداوار کا حصول ممکن بنائیں اور تھرمل کے مقابلے میں سستی پن بجلی کے ذریعے صنعتی پیداواری لاگت کو کم کریں تاکہ عالمی اور بین الاقوامی مارکیٹ میں جاری مسابقت میں اپنی جگہ بنا سکیں۔

مسئلہ آبپاشی کے لیے اضافی پانی کا انتظام کرنے کا ہو یا پن بجلی کے منصوبوں کا' ہر دو مقاصد کے لئے ہمیں بڑے آبی ذخائر کی ضرورت ہے۔ یہی وہ صورتِ حال ہے جس میں اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ فوری طور پر ایک بڑا ڈیم تعمیر کیا جائے۔ بڑے ڈیموں کی تعمیر کا جب بھی ذکر ہوتا ہے' فوری طور پر کالا باغ ڈیم کا نام سامنے آتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ گزشتہ کم و بیش پانچ عشروں سے اس موضوع پر جاری بحث میں فنی ماہرین نے' چاہے ان کا تعلق کسی بھی صوبے یا علاقے سے ہو' ہمیشہ یہ بات کہی ہے کہ کالا باغ ڈیم پاکستان کی ترقی و خوشحالی کے لئے نہ صرف ناگزیر ہے بلکہ کسی بھی دوسرے مجوزہ ڈیم کے مقابلے میں اس کی لاگت کم اور افادیت زیادہ ہے۔

ضلع میانوالی کے شہر کالا باغ کے قریب اس مجوزہ ڈیم پر کام کا آغاز 1953ء میں ہُوا جو 1989ء تک کسی نہ کسی شکل میں جاری رہا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر 36 برسوں میں جتنا تحقیقی اور فنی کام اس منصوبے پر ہُوا ہے' کہیں اور نہیں ہُوا' نہ ہی ڈیم کے لئے اس سے بہتر اور قدرتی جگہ کوئی اور ہے۔ اس مجوزہ آبی ذخیرے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پاکستان کے دوسرے آبی ذخائر کے مقابلے میں اس کی زندگی دراز ہے۔ تربیلا اور منگلا کی زندگی اس لئے محدود ہے کہ وہاں گاد جمع ہوتی رہتی ہے اور اسے صاف کرنے کا کوئی آسان طریقہ دستیاب نہیں ہے جبکہ دریائے سندھ پر تربیلا سے 210 کلومیٹر زیریں جانب اور جناح بیراج سے 26 کلومیٹر بالائی جانب واقع اس مجوزہ منصوبے کی صورتِ حال مذکورہ ڈیموں سے مختلف ہوگی۔ اس کا مقام جغرافیائی اعتبار سے ایسا ہے کہ وہاں ریت جمع نہ ہو سکے گی۔ اس کے گیٹ دریا کی سطح سے نیچے رکھے گئے ہیں۔ جونہی گاد آئے گی' بہہ کر آگے نکل جائے گی۔ ڈیم ٹیکنالوجی پر اتھارٹی کا درجہ رکھنے والے چینی ماہر ڈاکٹر ژنگ لیان ژن کے علاوہ ڈاکٹر جان کینیڈی (امریکہ) ڈاکٹر ڈبلیو روَنی وائٹ (انگلستان) نے بھی کالا باغ ڈیم کو نہایت موزوں قرار دیا۔

کالا باغ ڈیم سے آبپاشی' بجلی کی پیداوار اور سیلاب سے بچاؤ کے طور پر ساٹھ ارب روپے سالانہ کا فائدہ ہوگا۔ ڈیم سے سالانہ 6.1 ملین ایکڑ فٹ پانی آبپاشی کے لئے دستیاب ہوگا جس سے ربیع کی فصلوں کو اکتوبر اور مارچ کے دوران اور خریف کی فصلوں مثلاً کپاس' گنا اور چاول کے لئے اپریل اور مئی کے دوران وافر مقدار میں پانی فراہم ہو سکے گا جس سے ساڑھے بارہ ارب روپے کا فائدہ ہوگا۔

کالا باغ ڈیم سے سالانہ 11 ہزار 400 ملین یونٹ بجلی پیدا ہوگی۔ کالا باغ ڈیم اور تربیلا ڈیم کو ایک ساتھ چلانے کے نتیجے میں تربیلا کی موجودہ پیداواری صلاحیت کے مقابلے میں 336 ملین یونٹ زیادہ بجلی موجودہ پیداواری سہولت سے ہی حاصل ہوگی۔ محتاط اندازے کے مطابق بجلی کی پیداوار سے 46 ارب روپے کا فائدہ ہوگا۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ کالا باغ ڈیم سے حاصل ہونے والی بجلی کی بدولت تھرمل بجلی پر انحصار کم ہوگا' جس سے تیل کی درآمد پر خرچ ہونے والے قومی زرِمبادلہ کے اخراجات میں کمی آئے گی۔

کالا باغ ڈیم کی تعمیر سے زیریں علاقوں کے سیلاب کے نقصانات اور خطرات میں کمی آئے گی جس سے سالانہ ایک ارب پچاس کروڑ روپے فائدہ کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔ کالا باغ ڈیم سے وافر پانی کی دستیابی سے چاروں صوبوں کی زرعی پیداوار بڑھے گی۔ اضافی پانی کی فراہمی کے باعث صوبہ سندھ میں آٹھ لاکھ ایکڑ' صوبہ خیبر پختونخواہ میں 4.4 لاکھ ایکڑ' پنجاب میں 6.8 لاکھ ایکڑ اور بلوچستان میں 5.1 لاکھ ایکڑ اراضی کو فائدہ ہوگا۔

حتمی تکمیل کے بعد کالا باغ ڈیم سے 3600 میگا واٹ بجلی میسر ہوگی جو کہ اس وقت کی زیادہ سے زیادہ ضرورت کا بیس فی صد ہوگی' جس سے ہائیڈل اور تھرمل کا تناسب بہتر بنانے کے علاوہ بجلی کی قیمتیں کم کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ اس طرح صنعتی انقلاب اور تمام اشیائے خوراک میں خود انحصاری کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا۔ علاوہ ازیں سندھ میں موسمِ سرما اور غیر معمولی حالات میں پانی کی کمی کا مسئلہ ختم ہو جائے گا اور سیلاب پر قابو پایا جا سکے گا جو کہ سندھ میں 2012ء کے ہولناک سیلاب کی طرح ہر سال تباہی کا موجب بنتا ہے۔ اسی طرح توانائی کی کمی کو پورا کرنے کے لئے اب تک جتنے بھی منصوبے ہیں یا زیرِ غور ہیں' ان میں کالا باغ ڈیم ایسا منصوبہ ہے جس کی تیار شدہ بجلی کی لاگت سب سے کم ہوگی۔ اگر یہ حقیقت پیشِ نظر رکھی جائے کہ سوئی گیس کے ذخائر کم ہو رہے ہیں جس کے نتیجے میں سوئی گیس اور CNG کی لوڈ شیڈنگ کی تکلیف دہ نوبت آ چکی ہے' تیل کی قیمتوں میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے' تو سستی پن بجلی کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ان حالات میں آبی ذخائر کی ذخیرہ گنجائش میں ہونے والی کمی کے ازالے' بڑھتی ہوئی آبادی کی غذائی ضروریات کو پورا کرنے اور زراعت کو تباہی سے بچانے کے لئے کالا باغ ڈیم کی تعمیر ضروری ہے۔ انجینئر شاہ نواز خان اور انجینئر شمس الملک جیسے بین الاقوامی شہرت کے حامل ماہرین اور واپڈا کے سابق چیئرمین (حُسنِ اتفاق کہ ان دونوں کا تعلق صوبہ خیبر پختونخواہ سے ہے) سمیت لاتعداد ماہرین نے اس ڈیم کی افادیت اور اہمیت سے کبھی انکار کیا' نہ اس کی مخالفت کی بلکہ ان میں سے اکثر ریٹائرمنٹ کے بعد بھی' جب ان پر کوئی حکومتی دباؤ نہیں ہے' کالا باغ ڈیم منصوبے کی حمایت کر رہے ہیں۔

تحفظات

کالا باغ ڈیم کے حوالے سے صوبہ خیبر پختونخواہ اور سندھ کے بھائیوں میں کچھ تحفظات پائے جاتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہاں اس ڈیم کی شدید مخالفت ہو رہی ہے۔

سندھ کے لوگوں کا پہلا تحفظ یہ ہے کہ کالا باغ ڈیم کو بھرنے کے لئے اضافی پانی دستیاب نہیں ہے۔ اس حوالے سے یہ دیکھا جائے کہ تربیلا کی تعمیر سے اب تک سالانہ 35 ملین ایکڑ فٹ پانی کوٹری سے سمندر میں جا رہا ہے۔ 2012ء کے سیلاب کے دوران اس مقام پر پانی کا اخراج 43 ملین ایکڑ فٹ تھا۔ جولائی سے ستمبر کے دوران اضافی پانی دستیاب ہوتا ہے۔ کالا باغ ڈیم میں 6.1 ملین ایکڑ فٹ پانی بھرنے کے بعد بھی

29 ملین ایکڑ فٹ پانی ہر سال سمندر میں جائے گا۔ پانی اور بجلی پر سینیٹ کی سٹینڈنگ کمیٹی کی ہدایت پر ارسا نے تحقیق کے بعد تصدیق کی کہ مزید آبی ذخیروں کے لئے اضافی پانی دستیاب ہے۔

دوسرا خدشہ یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ کالا باغ ڈیم کی تعمیر سے سندھ بنجر ہو جائے گا۔ ڈیموں کے حوالے سے ایک بات واضح ہونی چاہیے کہ ڈیم پانی ذخیرہ کرتے ہیں، خرچ نہیں کرتے۔ ڈیموں میں سیلاب کے دنوں میں ذخیرہ کیا گیا پانی سال کے باقی دنوں میں فصلوں کے لئے دستیاب ہوتا ہے۔ اس کا حقیقی مظاہرہ تربیلا ڈیم کے کام شروع کرنے کے بعد ہوا۔ 1967ء تا 1970ء میں سندھ کو آبپاشی کے لئے 35.6 ملین ایکڑ فٹ پانی دستیاب تھا جو کہ تربیلا اور منگلا کے بعد بڑھ کر 44.2 ملین ایکڑ فٹ ہو گیا ہے۔ اسی طرح سندھ کو 24 فی صد اضافی پانی دستیاب ہوا۔ کالا باغ ڈیم کی تعمیر کے بعد سندھ کو مزید 2.25 ملین ایکڑ فٹ پانی دستیاب ہونے کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔

تیسرا خدشہ یہ ہے کہ بڑی نہروں کے ذریعے کالا باغ ذخیرہ کا پانی استعمال میں لایا جائے گا۔ اس حوالے سے یہ بات پیشِ نظر رہے کہ کالا باغ ڈیم کے منصوبے میں آبی ذخیرہ سے نہریں نکالنے کی کوئی شق شامل نہیں ہے۔ پانی کی تقسیم کو شفاف بنانے اور ہر بیراج پر پانی کے اخراجات کا جائزہ لینے کے لئے جدید ترین ٹیلی میٹری نظام نصب کیا گیا ہے جو کہ ارسا کی نگرانی میں کام کر رہا ہے۔ اس نظام کو کالا باغ ڈیم تک توسیع دی جائے گی، اس لئے پانی کی تقسیم کے حوالے سے خدشات کی گنجائش نہیں ہے۔

سندھ کے بعض حلقوں کی جانب سے چوتھا تحفظ یہ ہے کہ کالا باغ ڈیم کی تعمیر سے سیلاب کے علاقے میں فصلوں کی کاشت بری طرح متاثر ہو گی۔ سیلاب کی فصلیں دریا سے ملحقہ علاقے میں کاشت ہوتی ہیں۔ اگرچہ یہ فصلیں سیلاب کے بعد کے وَتر پر کاشت کی جاتی ہیں، لیکن ان کے پکنے کے لئے ایک آبپاشی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیلاب کی فصلوں کی فی ایکڑ پیداوار کم ہوتی ہے۔ کاشت کار فصلوں کے لئے لفٹ پمپ اور کم گہرائی پر لگائے گئے ٹیوب ویل سے آبپاشی کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ نقصان سے بچنے کے لئے سیلاب کے خدشہ کے پیشِ نظر یہ پمپ آبپاشی کے بعد ٹیوب ویل سے نکال لئے جاتے ہیں۔ سندھ میں سیلابہ کا رقبہ ساٹھ ہزار ایکڑ ہے جو کہ سمندر سے گُڈو بیراج تک پھیلا ہوا ہے۔ اکثر علاقوں میں آبپاشی کی اضافی ضروریات کے لئے ٹیوب ویل لگائے گئے ہیں۔ بنیادی طور پر اس علاقے میں تیس لاکھ کیوسک سیلاب کے وتر پر کاشت کاری ہوتی ہے۔

کالا باغ ڈیم کی تعمیر کے بعد بھی 3 لاکھ کیوسک سے زائد پانی دستیاب رہے گا اور تباہ کُن سیلاب کو روکا جا سکے گا۔ اس طرح اس علاقے میں مستقل ٹیوب ویل لگانے کی سہولت دستیاب ہو جائے گی اور کاشتکار ایک کی بجائے دو فصلیں اُگا سکیں گے۔

سندھ کے حوالے سے ایک خدشہ یہ بھی ہے کہ کالا باغ ڈیم کی تعمیر سے سمندر میں تازہ اور پینے کے صاف پانی کی ترسیل کم ہو جائے گی جس کی وجہ سے سمندری ساحلی مچھلیاں زندہ نہ رہ سکیں گی اور ماہی گیری کی صنعت سے وابستہ لاکھوں لوگ بے روزگار ہو جائیں گے۔

کچھ اور خدشات

کالا باغ ڈیم کی تعمیر پر صوبہ خیبر پختونخواہ کے بعض حلقوں کی جانب سے بھی کچھ تحفظات ہیں۔ سب سے پہلا یہ کہ کالا باغ ڈیم بننے کے بعد نوشہرہ کا شہر زیرِ آب آ جائے گا۔ اس حوالے سے زمینی حقائق یہ ہیں کہ نوشہرہ شہر کے زیرِ آب آنے کی بات 1929ء میں آنے والے سیلاب کے حوالے

سے کی جاتی ہے جس میں 940 فٹ پانی آنے پر نوشہرہ زیرِ آب آ گیا تھا۔ اُس وقت جدید آلات اور ٹیکنالوجی موجود نہیں تھی۔ اب سیلاب کے آنے بلکہ اس کی سطح اور دباؤ کا پتہ کئی دن پہلے ہی چلایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ 1929ء میں نوشہرہ کے آگے چٹانیں ٹوٹ کر دریا کے راستے میں گر گئی تھیں جس کی وجہ سے دریا کا بہاؤ رکاوٹوں کی زد میں آ گیا تھا اور پانی کی سطح 940 فٹ تک بلند ہو گئی تھی۔ اب جدید سہولتوں کی وجہ سے ایسی کسی صورتِ حال کا خدشہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود نوشہرہ کے لوگوں کے اطمینان کے لئے ڈیزائن میں ترمیم کر کے ڈیم کی اونچائی کو 925 فٹ (جو سیلاب کی سطح سے 15 فٹ نیچے تھی) سے مزید کم کر کے 915 فٹ تک لے جایا جا چکا ہے۔ اس طرح کالا باغ ڈیم میں پانی کی زیادہ سے زیادہ اونچائی بھی مذکورہ سیلابی سطح سے 25 فٹ نیچے چلی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ماہرین نے پورے علاقے اور مجوزہ ڈیم کے مختلف ماڈل بنا کر بھی تجربات کئے ہیں اور کمپیوٹر کی مدد سے بھی بارہا پڑتال کے بعد یہ حتمی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کالا باغ ڈیم بننے سے سیلاب کی شدت میں کسی اضافے کا اندیشہ نہیں ہے۔ کالا باغ ڈیم کے پیچھے آبی ذخیرہ مکمل بھر جانے پر اس کا آبی لیول سطح سمندر سے 915 فٹ بلند ہو گا جبکہ نوشہرہ میں کم سے کم آبی سطح 935 فٹ ریکارڈ کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نوشہرہ کی سب سے نچلی سطح آب سے بھی کالا باغ ڈیم میں بھرے ہوئے پانی کی سطح 20 فٹ نیچے رہے گی اور اس ذخیرے کی حد نوشہرہ سے 10 میل دُور نشیب میں ہو گی۔

صوبہ خیبر پختونخواہ کے حوالے سے کالا باغ ڈیم پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر کے باعث صوبہ کی لاکھوں ایکڑ زرخیز زرعی اراضی ڈیم کی حدود میں شامل کر لی جائے گی اور اس طرح صوبہ اس زرعی پیداوار سے محروم ہو جائے گا جو اس اراضی سے حاصل کی جا رہی ہے۔ اس لحاظ سے جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ڈیم کے لئے مجموعی طور پر ایک لاکھ 34 ہزار 500 ایکڑ اراضی درکار ہو گی۔ اس میں سے 99 ہزار 500 ایکڑ اراضی ایسی ہے جس پر کوئی کاشتکاری نہیں ہو رہی' بلکہ یہ بنجر اور پتھریلی زمین ہے۔ منصوبے کے لئے جو زرعی اراضی استعمال ہو گی' اس کا حجم 27 ہزار ایکڑ ہے جس میں سے 24 ہزار 500 ایکڑ اراضی پنجاب مہیا کرے گا جبکہ صوبہ خیبر پختونخواہ سے صرف 3 ہزار ایکڑ اراضی لی جائے گی۔ نہروں کے ذریعے سیراب ہونے والے موجودہ رقبے کے حوالے سے دیکھا جائے تو پنجاب کی 29 ہزار ایکڑ آبپاش اراضی استعمال ہو گی جبکہ اس کے مقابلے میں صوبہ خیبر پختونخواہ سے صرف 100 ایکڑ آبپاش زمین لی جائے گی۔ جہاں تک زرعی اراضی کے فوائد کا تعلق ہے' اس ڈیم کی تعمیر کے بعد صوبہ خیبر پختونخواہ کے صرف ڈیرہ اسماعیل خان کے علاقے میں ایک لاکھ 25 ہزار ایکڑ بنجر اور بے آب اراضی کو آبپاشی کی سہولیات میسر آ جائیں گی۔

صوبہ خیبر پختونخواہ کے بعض حلقوں کی جانب سے تیسرا خدشہ یہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ ڈیم کی تعمیر کے بعد اثرات کے سبب صوابی' مردان' پبی اور نوشہرہ کی قیمتی اور زرعی اراضی سیم اور تھور کا شکار ہو جائے گی اور اس کی زرخیزی ختم ہو جائے گی۔ کالا باغ ڈیم میں پانی کی سطح اور صوابی' مردان' پبی اور نوشہرہ کا باہمی تقابل کیا جائے تو سروے آف پاکستان کے جدید ترین تخمینوں کے مطابق کالا باغ ڈیم (915 فٹ) کے مقابلے میں مردان 970 فٹ' پبی 960 اور صوابی 1000 فٹ بلند ہے۔ اس طرح یہ تمام علاقے کالا باغ ڈیم کی بھری ہوئی سطح سے بالترتیب 55 فٹ' 45 فٹ اور 85 فٹ بلندی پر واقع ہیں۔ ویسے بھی سال کا زیادہ تر حصہ کالا باغ ڈیم میں پانی کی سطح 915 فٹ سے خاصی نیچے رہے گی۔ کالا باغ ڈیم کے اردگرد چٹانی علاقہ ہے۔ اس میں پانی جذب ہونے اور سیم و تھور پھیلنے کا

امکان ویسے بھی بہت کم ہے' لہٰذا ہزارہ اور مردان میں پانی کی نکاسی کے راستوں کی وجہ سے سیم اور تھور کا امکان اور بھی کم ہو جاتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ آبی ذخیرے کے دباؤ کی وجہ سے اگر قرب و جوار کی زمین پانی جذب کر بھی لے تو اس کی اونچائی 5 فٹ سے زیادہ بلند نہیں ہو سکتی لیکن کالا باغ علاقہ زیادہ تر سنگلاخ چٹانوں پر مشتمل ہے' اس لئے یہاں پانی کا بہاؤ اس سطح سے نیچے رہے گا۔

کالا باغ ڈیم کی تعمیر پر چوتھا تحفظ یہ ہے کہ اس سے لاکھوں لوگ بے گھر ہو جائیں گے اور پھر ان کی آبادکاری سالہا سال تک نہیں ہو سکے گی۔ اس حوالے سے عرض ہے کہ کالا باغ ڈیم منصوبے کے سروے کے مطابق بے گھر ہونے والے افراد کی کُل تعداد تقریباً 83 ہزار ہو گی جنہیں متبادل جگہوں پر آباد کرنا پڑے گا۔ ان میں سے 48 ہزار 500 افراد کا تعلق پنجاب جبکہ 34 ہزار 500 افراد کا خیبر پختونخواہ سے ہوگا۔ اس مقصد کے لئے واپڈا نے جو انتظامات تجویز کئے ہیں' ان کے مطابق ان لوگوں کی آبادکاری کے لئے حکومت جدید ترین سہولتوں کے حامل 27 نئے گاؤں تعمیر کرے گی۔ پہلے سے موجود قرب و جوار کے 20 دیہات میں توسیع کی جائے گی۔ ان سب دیہات میں ضروریات اور سہولیاتِ زندگی کی فراہمی کا کام بین الاقوامی فلاحی اداروں کی نگرانی میں ہوگا۔ وہ اس امر کا اطمینان کریں گے کہ کسی فرد کے ساتھ امتیازی سلوک نہ کیا جائے اور سب کو یکساں سہولتیں میسر آئیں۔ اس کے علاوہ نقل مکانی کرنے اور بے گھر ہونے والے خاندانوں کی آبادکاری کے لئے منگلا ڈیم ریزنگ پروجیکٹ سے متاثرہ افراد کی آبادکاری جیسے عمل کو اپنایا جائے گا۔

زمینی حقائق

1991ء میں صوبوں کے مابین پانی کی تقسیم کے معاہدے کے پیراچھ میں صوبے دریائے سندھ اور دوسرے دریاؤں پر آبی ذخائر کی تعمیر پر اتفاق کر چکے ہیں۔ ملک و قوم کی خوشحالی کے پیشِ نظر چند زمینی حقائق کو مدِ نظر رکھنے کی ضرورت لازم آتی ہے:

- آبی ذخائر یا ڈیم تعمیر نہ کئے گئے تو تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے خوراک میں کمی آئے گی اور سال 2020ء تک 200 ارب روپے سالانہ کا غلہ درآمد کرنا پڑے گا جس سے ملک کی اقتصادیات پر بوجھ بڑھ جائے گا۔
- سال 2015ء تک موجودہ آبی ذخائر میں گاد بھر جانے سے موجودہ گنجائش میں کمی 25 فی صد سے بڑھ کر 43 فی صد ہو جائے گی تو آبپاشی میں کمی سے زرعی پیداوار مزید کم ہو جائے گی۔ خشک سالی کی صورت میں آبی ذخائر کی غیر موجودگی چاروں صوبوں کے درمیان اختلافات بڑھائے گی۔ کالا باغ ڈیم سے بجلی کی سالانہ پیداوار 20 ملین بیرل تیل کے برابر ہے۔ اس کی عدم تعمیر سے یہاں سے حاصل ہونے والی برقی پیداوار کے بقدر تھرمل بجلی حاصل کرنے کے لئے تیل کی درآمد سے خزانے پر مزید 160 بلین روپے کا اقتصادی بوجھ پڑے گا۔
- کالا باغ ڈیم سے سستی بجلی حاصل نہ کی جا سکی تو تھرمل بجلی سے فی یونٹ قیمت میں ناقابلِ برداشت حد تک اضافہ ہوگا جس کی وجہ سے ملکی برآمد کے علاوہ گھریلو صنعتکاری اور زرعی پیداوار متاثر ہوگی اور میٹھے پانی کی کمی کی وجہ سے زمینوں کے نمکیات میں اضافہ ہوگا تو اناج کی پیداوار میں بھی کمی ہو جائے گی۔

ملکی و غیر ملکی ماہرین اور انجینئر کالا باغ ڈیم کی تعمیر کے خلاف تحفظات' خدشات اور تاثرات کو بے بنیاد قرار دے چکے ہیں۔ زمینی حقائق بھی ان ماہرین کی آراء کو تقویت دیتے ہیں۔ کالا باغ ڈیم پانی کی مسلسل کمی کا ازالہ کر کے ملک میں سبز انقلاب کی نوید لائے گا' لاکھوں بے روزگاروں کے لئے روزگار کے مواقع پیدا کرے گا اور سستی بجلی کی فراہمی کا ضامن ہوگا۔

کانِ نمک

محمد مرتضیٰ نعیم

پاکستان میں پہاڑوں کے طویل سلسلے موجود ہیں جو غذا کے علاوہ کئی صنعتوں کی ضروریات کو بھی پورا کرتے ہیں۔ جن علاقوں میں نمک کے پہاڑ پائے جاتے ہیں' انہیں سالٹ رینج' کوہستانِ نمک یا نمکستان کہتے ہیں۔ کوہستان نمک ضلع خوشاب کی وادیِ سُون اور دریائے جہلم کے درمیان دو پہاڑی سلسلوں پر مشتمل ہے۔ مشرقی علاقے میں تقریباً 80 میل لمبی پٹی میں جگہ جگہ چٹانی نمک کی کانیں ہیں۔ پہاڑیوں کا یہ سلسلہ تقریباً 160 میل لمبا' اوسطاً دس میل چوڑا اور تین ہزار فٹ اونچا ہے۔ جنوب کی جانب کٹی پھٹی سطح مرتفع ہے۔ کوہستانِ نمک کا سلسلہ قوس کی شکل میں دریائے جہلم کے شمال میں باغاں والا سے شروع ہوتا ہے اور نشیب میں جنوب مغرب کی طرف سے ہوتا ہُوا جب شمال مغرب کی طرف مُڑتا ہے تو ضلع میانوالی میں کالا باغ کے مقام پر دریائے سندھ میں ختم ہوتا ہے۔

کوہستانِ نمک کی زمین بُھربُھری اور ریتلی چٹانوں اور چونے کے پتھروں پر مشتمل ہے جس میں بظاہر کوئی کشش معلوم نہیں ہوتی مگر قدرت نے اس زمین کے سینے میں معدنی ذخائر کے بیش بہا خزانے چھپا رکھے ہیں۔ ان میں چونے کا پتھر' چقماق' سرخ پتھر' کوئلہ' پیلا پتھر اور سب سے بڑھ کر نمک کی سوغات عام دستیاب ہے۔ سلسلۂ کوہِ نمک کی نمایاں چوٹیاں ٹلہ جوگیاں اور سکیسر ہیں۔ کھبکی' اوچھالی' نمل' کلر کہار' جاہلر اس میں واقع نمایاں جھیلیں ہیں۔ جھیل کھبکی اور اوچھالی وادیِ سُون کے مرکزی قصبہ نوشہرہ سے آٹھ میل مشرق اور آٹھ میل مغرب میں واقع ہیں۔ ان میں سے پہلی تین کو بین الاقوامی اہمیت حاصل ہے اور انہیں Ramsar Convention کے تحت خصوصی درجہ دیا گیا ہے۔ ان جھیلوں میں انواع واقسام کی جڑی بوٹیاں اُگتی ہیں اور رنگ برنگے پرندوں کے مسکن ہیں۔ موسمِ سرما میں سائبیریا کی مرغابیاں جھیل کھبکی میں آن بسیرا کرتی تھیں۔ افغانستان میں روسی جارحیت (دسمبر 1979) کے ساتھ ہی سائبیریا کی مرغابیوں نے کہیں اور کا رخ کرلیا۔ اس حُسنِ اتفاق کا پس منظر یہ ہے کہ اسی سال جھیل کا پانی یکدم میٹھا ہو گیا تو اس جھیل میں مچھلی کی افزائش ہونے لگی جن سے مرغابیوں کے سکون میں خلل پڑا' اور انہوں نے سردیوں کے لیے کسی دوسرے پُر امن آبی ذخیرے کو ٹھکانہ بنا لیا۔ جھیل اوچھالی کا پانی قدرے کڑوا اور کھارا ہے۔ یہ مرغابیاں اب وہاں بھی آن بسیرا کرتی ہیں۔

Dr. Warth اور Dr.Christe کا کہنا ہے کہ نمک کے ان ذخائر کی جگہ سمندر تھا۔ لاکھوں سال پہلے خطہ ہمالیہ' پنجاب اور راجپوتانہ سمندر کی تہہ میں موجود تھے جسے Tethys Sea کہا جاتا تھا۔ یعنی جس جگہ اس وقت خشک اور بنجر پہاڑوں کا طویل سلسلہ دکھائی دیتا ہے' کروڑوں سال پہلے یہاں ٹھاٹیں مارتا سمندر تھا۔ انڈین پلیٹ کے ایشین پلیٹ سے ٹکرانے کے نتیجے میں یہ سمندر اپنی جگہ چھوڑ گیا اور آخر کار یہ علاقہ ایک وسیع جھیل بن گیا جس کی نوعیت کم وبیش بحرِ مردار کی سی تھی۔ پھر اس علاقہ میں پانی

نتھرنے اور خشک ہونے کا قدرتی عمل شروع ہُوا۔ انجام کار سارا پانی رقیق ''نمکوں'' کی صورت میں تبدیل ہو گیا اس کی تہیں بنتی گئیں جو سوڈیم کلورائیڈ' پوٹاشیم سالٹ اور کیلیسم سالٹ وغیرہ کی شکلوں میں باقی ہے۔

وادیِ سُون کے مرکزی قصبہ نوشہرہ سے خوشاب یا راولپنڈی جائیں تو راستے میں واقع پہاڑوں کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ چٹانوں کو تہہ در تہہ جوڑ کر یہ پہاڑ بنا دیئے گئے ہیں۔ ہولناک زلزلوں کے باوجود بھی الحمدللہ یہ پہاڑ گرتے نہیں۔ نوشہرہ سے خوشاب' نوشہرہ سے راولپنڈی اور خوشاب سے کٹھہ جانے والی سڑکیں ان کے دامن کے ساتھ ساتھ بنی ہوئی ہیں۔

اس علاقے میں قدیم انسانی تہذیب کے آثار بھی ملے ہیں۔ کھیوڑہ کی کان کا تذکرہ ابنِ بطوطہ کے سفرنامے میں بھی ملتا ہے۔ کوہستانِ نمک ہی وہ علاقہ ہے جہاں ''مہابھارت'' کے کرداروں کا تذکرہ ملتا ہے۔ اسی علاقے میں پانڈو شہزادوں نے جلاوطنی کاٹی۔ اسی بناء پر اس علاقے کو ماہرینِ آثارِ قدیمہ اور مورخین کی خصوصی توجہ حاصل ہے۔ سالٹ رینج میں بہنے والے دریا کا نام سواں ہے۔

کوہِ سکیسر کوہستانِ نمک کا اہم مقام ہے۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی پانچ ہزار فٹ ہے۔ کوہِ سکیسر کے ایک جانب تین جھیلوں والی خوبصورت وادیِ سُون سکیسر ہے جس کے اردگرد تھل کے ریگستانی علاقے اور میانوالی' اٹک وغیرہ ہیں۔ یہ وادی زمانہ قدیم سے علم و فضل کا گہوارہ رہی ہے۔ حضرت پیر مہر علی شاہؒ نے اسی وادی کے ایک گاؤں انگہ سے ابتدائی دینی اور روحانی تعلیم حاصل کی۔ برِصغیر کے ممتاز شاعر جناب احمد ندیم قاسمی اسی قصبہ انگہ کے فرزند ہیں۔ اردو کی دو نامور افسانہ نگار خواتین وادیِ سُون کی بہو ہیں۔ محترمہ خدیجہ مستور کا سسرالی گاؤں انگہ ہے۔ اُن کے شوہر جناب ظہیر بابر ایک عرصے تک روزنامہ امروز کے ایڈیٹر رہے۔ اس سے ملحقہ بستی کفری نے ایک دور میں برِصغیر میں سب سے زیادہ حفاظ کرام پیدا کئے۔ اسی بستی میں حضرت میاں عبدالحمید اور صاحبزادہ عزیز احمد آسودۂ خاک ہیں جن کے کشف و کمالات اور روحانی تصرف کے واقعات ترقی پسند ادیبوں کی کتابوں میں بھی ملتے ہیں۔ ان کی خانقاہ مرجعِ خواص و عوام ہے۔ ملحقہ گاؤں کھوڑہ مشہور زمانہ صحافی اور کالم نگار جناب عبدالقادر حسن کا آبائی اور اردو اور پنجابی کی معروف افسانہ نگار محترمہ رفعت کا سسرالی قصبہ ہے۔ محترمہ رفعت جناب عبدالقادر حسن کی رفیقِ حیات ہیں۔ انگریزی روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' کے آخری ایڈیٹر جناب امیر اعوان کا گاؤں مردوال بھی وادیِ سُون میں واقع ہے۔ جھیل کھبکی کے کنارے آباد قصبہ کھبکی مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے فکری رفیق جسٹس ملک غلام علی اور عربی کے نامور اُستاد پروفیسر ظہور احمد اظہر کا مسکن ہے۔ منفرد تفسیر قرآن مجید کے مؤلف اور درجنوں عسکری و تاریخی کتب کے مصنف میجر امیر افضل خان کا تعلق وادی کے قصبہ بھکی (اب مصطفےٰ آباد) سے ہے۔ وادی کے باشندے صرف صاحبِ قلم ہی نہیں' اربابِ سیف بھی ہیں۔ سپاہی سے جرنیل تک کی حیثیت سے پاکستان کی برّی' بحری اور فضائی افواج کی صفوں میں دفاعِ وطن کا فریضہ سرانجام دیتے چلے آ رہے ہیں۔

کانِ نمک

علاقے سے نمک کی دریافت کا تعلق سکندرِ اعظم کی ہندوستان آمد سے ہے۔ جن دنوں سکندر کے فوجیوں کا دریائے جہلم کے کنارے پڑاؤ تھا' انہوں نے دیکھا کہ ان کے گھوڑے پہاڑوں میں گھاس چرنے کے دوران پتھروں کو شوق سے چاٹتے جس سے بیمار گھوڑے تندرست ہو جاتے ہیں۔ غور کرنے پر یہاں نمک کی موجودگی کا انکشاف ہوا۔ اُسی زمانے سے یہاں سے نمک کی ترسیل کا کام مسلسل جاری ہے۔

کھیوڑہ کانِ نمک کی سیر کے لیے کان کا ایک حصہ مختص ہے۔

کان میں کئی جگہوں پر نمک کی ٹائلیں بچھا کر ان میں بلب لگائے گئے ہیں جس پر کسی خلائی گزرگاہ کا گمان ہوتا ہے۔ کھیوڑہ کی کان دراصل سحر انگیز سرنگوں کا ایک عجیب وغریب سلسلہ ہے جو سترہ منزلوں تک پھیلا ہُوا ہے۔ تاہم عوام کو سیاحت کے لیے ایک مخصوص حصے کے علاوہ کہیں اور جانے کی اجازت نہیں۔ ایسا ان کی حفاظت کے پیش نظر کیا گیا ہے۔

اب آیئے کانِ نمک کی انوکھی دنیا میں اور شکر ادا کیجئے اُس رب کا جس نے ہمیں وہ ملک عطا کیا جو قرآنی آیت ''تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے'' کی سچی تصویر ہے۔

• **راہداری:** استقبالیہ ہال سے کان کے دہانے تک پہنچنے کے لیے ایک پختہ راہداری تعمیر کر دی گئی ہے تا کہ کان تک پہنچنے میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو۔ برساتی نالے پر بنے تھامس برج کو عبور کر کے کان تک پہنچا جاتا ہے۔ راہداری میں روشنی کا بھی مناسب انتظام ہے۔ کان میں آکسیجن کی مقدار مستقل طور پر 17.40 فیصد رہتی ہے جس کا آغاز کان کے دہانے سے ہی ہو جاتا ہے۔ پوری کان میں کہیں گھٹن کا احساس نہیں ہوتا۔

• **الیکٹرک ٹرام:** کان میں سائرین (سیر کے لئے آنے والوں) کو 2.5 کلومیٹر رقبے کی سیر کرائی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے بجلی سے چلنے والی ایک چھوٹی ٹرام کان کے دہانے سے ایک کلومیٹر اندر لے جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے موجودہ ریل خوروں کی نظرِ بد سے بچائے! 1930ء کا بنا ہُوا ایک تاریخی انجن اسے کھینچتا ہے۔ 1918ء تک کان کے اندر چلنے والے دو سٹیم انجن بہت دھواں چھوڑتے تھے۔ کان کنوں کے لیے نقصان دہ ہونے کی وجہ سے یہ انجن بند کر دیئے گیے تاہم اس کے دھوئیں کے نشانات ابھی تک کان کی اُجلی دیواروں اور چھتوں کے درمیان (نظر بٹّو کے لیے شاید) سیاہ دھبوں کی صورت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

• **نمک کی مسجد:** کان کا وہ حصہ جہاں مٹی کا کچا راستہ ختم اور نمک کی چھت اور فرش شروع ہوتا ہے، وہاں ایک نرالی مسجد واقع ہے۔ یہ دنیا کی واحد مسجد ہے جو اینٹ گارے کی بجائے نمک سے بنائی گئی ہے۔ اسے عرفِ عام

کیوریاسیٹی

کائنات کے کسی اور سیارے یا ستارے پر زندگی تلاش کرنے کی انسانی کوششوں نے 6 اگست 2012ء کو ایک نیا موڑ لیا جب امریکہ کی جدید ترین موبائل لیبارٹری ''کیوریاسیٹی'' خلا کا 570 ملین کلومیٹر کا طویل سفر آٹھ ماہ میں طے کرتے ہوئے کامیابی کے ساتھ نظامِ شمسی کے سرخ سیارے مریخ پر اتر گئی۔ یہ ایک ٹن وزنی روبوٹک گاڑی مریخ پر اپنے دو سالہ قیام کے دوران معلوم کرنے کی کوشش کرے گی کہ آیا کبھی مریخ پر زندگی کے آثار موجود تھے یا نہیں۔ اس مشن کا بڑا مقصد مریخ کے گڑھے ''گیل'' میں واقع پانچ کلومیٹر اونچے پہاڑ پر تحقیق کرنا ہے۔ گاڑی نے 8 اکتوبر 2012ء کو اس پہاڑ پر چڑھ کر نمونے جمع کئے اور ان چٹانوں کا جائزہ لیا جو اربوں سال قبل سے وہاں موجود ہیں۔ گاڑی کو گرینچ کے معیاری وقت کے مطابق صبح تقریباً ساڑھے پانچ بجے مریخ کے خطِ استوا کے قریب واقع ایک گہرے گڑھے میں اتارا گیا۔ اس نے مریخ پر اترنے کے فوراً بعد سیارے کی سطح کی چند عام تصاویر زمین پر بھیجیں اور دو روز بعد ہائی ریزولیوشن تصاویر کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کیوریاسیٹی تیرہ ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتے ہوئے جب مریخ کی فضا میں داخل ہوئی تو اس کی رفتار بڑھ کر اکیس ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ ہو گئی۔ مریخ کی فضا میں داخل ہونے کے ٹھیک سات منٹ بعد یہ مریخ کی سطح پر اتری۔ زمین سے مریخ تک سفر کے بعد گاڑی کے مریخ کی سطح پر اُترنے کے عمل کو ''خوف کے ساٹھ منٹ'' کا نام دیا گیا۔ کیوریاسیٹی ناسا کی جانب سے سب سے بڑا خلائی مشن ہے۔ ناسا نے 20 نومبر 2011ء کو ایک کیپسول میں بند یہ خلائی گاڑی اٹلس راکٹ فائیو کی مدد سے فلوریڈا میں واقع کیپ کینیورل سے روانہ کی تھی۔ خلائی گاڑی جسے مریخ پر سائنسی تجربہ گاہ بھی کہا جاتا ہے، سیارے پر زندگی کے شواہد جمع کرنے کے لئے اب تک بنائی جانے والی سب سے مہنگی اور جدید ترین روبوٹک گاڑی ہے۔ سائنسدان اس مشن کے ذریعے مریخ کی مٹی اور چٹانوں کا تجزیہ کر کے ماضی میں زندگی کے ممکنہ آثار کا سراغ لگانا چاہتے ہیں۔ اس عظیم مشن میں چار سو سے زائد سائنسدانوں کی شب و روز محنت شامل ہے۔

—— تحقیق و تحریر: بسمہ سرفراز ASAB

میں ''مزدوروں کی شاہی مسجد'' کہتے ہیں۔ 1960ء کی دہائی میں اُس وقت کے چیف مائننگ انجینئر رانا محمد سلطان نے پوری کان سے مختلف رنگوں کا شفاف نمک نکلوایا اوراس کی اینٹیں بنوا کر یہ منفرد مسجد تیار کرائی جس میں با جماعت نماز ادا کی جاتی ہے۔ نمازیوں میں اکثر سیّاح ہی ہوتے ہیں۔نمک کی رنگ برنگی کھوکھلی اینٹوں میں جب بلب روشن کئے جاتے ہیں تو ایمان افروز منظر دکھائی دیتا ہے۔

• **اسمبلی ہال:** یہ کان کا سب سے بڑا کمرہ ہے۔اس کی لمبائی 200 فٹ اور چوڑائی 50 فٹ ہے۔ دیواریں' چھت اور فرش سبھی نمک کے ہیں۔ چھت کی بلندی تقریباً دوسو چالیس فٹ ہے۔ اس میں کم وبیش پانچ سو سیڑھیاں ہیں جو کان کے بالائی راستوں کو جاتی ہیں۔ کسی زمانے میں جب کان کی سطح پر نمک کھود کر اکٹھا کیا گیا' تو یہ گڑھا وجود میں آیا۔ ماہرِ ارضیات ڈاکٹر وارتھ نے پہاڑ میں سرنگ بنوائی تو اس جگہ پہنچنے پر قدرتی طور پر یہ بڑا کمرہ سامنے آ گیا۔ کمرے کی دیوار میں 6 مقامات اس قدیم کھائی کا پتہ دیتے ہیں۔ ہال کی دیواروں پر نمک سے قدرتی طور پر بنے ڈیزائین نمایاں ہوگئے۔ان میں خاصے کی چیز حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی شبیہہ ہے۔

• **تالابوں کے پُل:** کان کی اندر کے مختلف حصوں کو ملانے اور تالابوں کو عبور کرنے کے لیے پُل بھی تعمیر کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک کو ''پُل صراط'' کہا جاتا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ تالابوں پر بنے سبھی پُل بغیر ستونوں کے ہیں۔

• **شیش محل:** ''پل صراط'' کو عبور کر کے کان کا مرکزی اور اہم حصہ آتا ہے جسے ''شیش محل'' کہتے ہیں۔ یہاں شفاف گلابی رنگ کا نمک بہت ہی بھلا لگتا ہے۔نمک کی رنگت مختلف اجزاء کی وجہ سے مختلف ہوتی ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ جس نمک میں فولاد موجود ہو اس کا رنگ سرخ ہوگا۔ ''شیش محل'' کی طویل ترین دیوار کو ''دیوارِ چین'' اور ''دیوارِ محبت'' کا نام دیا گیا ہے۔ اہلِ دل یہاں عموماً دیواروں کو چاٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ غالباً شیش محل کے پہلو میں ایک چھوٹی سی سرنگ کا نام ''غارِ ثور'' ہے۔ یہ کان کنوں کا سب سے پسندیدہ مقام ہے۔ یہیں سے لکڑی کا ایک ایسا ٹکڑا برآمد ہوا جسے جلانے سے ربڑ کی بُو آتی ہے۔ خیال ہے کہ اس ٹکڑے کی عمر کروڑوں سال پرانی ہوگی۔ یہ بھی اللہ پاک کی شان ہے کہ نمک کے اندر لکڑی کا ٹکڑا کیسے محفوظ رہ گیا۔لکڑی کے اس ٹکڑے کا تذکرہ جہلم گزیٹئر میں بھی ہُوا ہے۔

• **چاندنی چوک:** جس جگہ نمک کی کان کے مختلف حصے باہم آ کر ملتے ہیں' اس سے ایک چوک وجود میں آ جاتا ہے۔ اسے ''چاندنی چوک'' کا نام دیا گیا ہے۔ یہ خاصی کشادہ جگہ ہے اور یہاں سے کان کی مختلف اطراف کو راستے نکلتے ہیں۔کان کی سیاحت کا اختتام بھی اسی چوک میں ہوتا ہے۔

• **احسان دانش کا ہدیۂ دانش:** کان میں اوپر تلے کان کنی جاری رہتی ہے۔ نمک نکالنے سے پیدا ہونے والے گڑھے پہاڑ سے رسنے والے پانی کی وجہ سے قدرتی طور پر تالاب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اوپر والے حصوں میں موجود پانی کے ان تالابوں سے بھی پانی کے قطرے مسلسل گرتے رہتے ہیں جس سے کان کی نچلی منزلوں میں نمک کی پہاڑیاں سی وجود میں آ جاتی ہیں۔نمک کی مسجد یعنی ''مزدوروں کی شاہی مسجد'' سے کچھ فاصلے پر کسی اوپر والے تالاب سے پانی کے رسنے سے ایک پہاڑی بن گئی ہے جو بظاہر موم کی معلوم ہوتی ہے۔ مزدور شاعر احسان دانش نے قدرت کا یہ شاہکار دیکھا تو ان مناظر کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکے۔ پہاڑ سے رسنے والے پانی کو برجستہ ''اشکِ نمک'' موم جیسی پہاڑی کو ''آہِ نمک'' اور ان کے مابین فاصلے کو ''فراقِ نمک'' کا نام دیا۔

• **انگوری باغ:** پانی کے وہ قطرے جو چھت سے لٹکے ہوتے ہیں، تکنیکی زبان میں انہیں Stalacitite اور جو نمک پہاڑی کی طرح نیچے اُبھر آتا ہے، اسے Stalagmite کہتے ہیں۔ چھت سے انگور کے گچھوں کی طرح نمک کے لٹکے ہونے کی وجہ سے اس مقام کو ''انگوری باغ'' کا نام دیا گیا ہے۔

• **مینارِ پاکستان اور موٹروے:** ''انگوری باغ'' سے آگے کان میں ایک چوراہا بن جاتا ہے۔ اس چوراہے سے ایک راستہ ''اسمبلی ہال'' کو جاتا ہے۔ جہاں نمک سے بنا مینارِ پاکستان کا ماڈل رکھا گیا ہے۔ کھوکھلی اینٹوں میں روشنی کر کے اسے قدرت کی شان کا ایک اور نمونہ بنایا گیا ہے۔ یہ مینار سول انجینئر جناب محمد اسلم کی زیرِ نگرانی تعمیر ہوا۔ مینارِ پاکستان جس راستے پر موجود ہے، اسے ''موٹروے'' کا نام دیا گیا ہے۔

• **ڈائمنڈ ویلی اور صرافہ بازار:** ''موٹروے'' پر ''مینارِ پاکستان'' سے سرنگ نما راستہ کان کی نچلی منزل کو جاتا ہے۔ یہیں کان کا سب سے خوبصورت حصہ ''ڈائمنڈ ویلی'' واقع ہے۔ اسے ''کرسٹل ویلی'' اور ''صرافہ بازار'' کے ناموں سے بھی پکارا جاتا ہے۔ مائن کے اس حصے میں چھت سفید نمک کی ٹکڑیوں سے مرصع ہے جنہیں سرخ، سبز اور نیلی روشنیوں سے منوّر کیا گیا ہے۔ یہ قدرتی نمکین ٹکڑیاں دراصل کان میں کسی مقام پر مسلسل پچیس سال تک پانی کھڑا رہنے سے وجود میں آجاتی ہیں۔ کئی لوگ چھت سے یہ ٹکڑیاں توڑ کر لے جاتے تھے۔ اگر یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا تو چند ہی برس میں چھت قدرت کی مینا کاری اور مخلوقِ خدا اللہ تعالیٰ کی صناعی کے دیدار سے محروم ہو جاتی۔ یہاں سے ٹکڑی توڑنے پر پانچ سو روپے جرمانہ کیا جاتا ہے۔ اس حصے میں داخلہ کو محدود رکھنے کے لیے اس کا دروازہ تالہ بند رکھا جاتا ہے، تاہم باہر سے اس کی خوبصورتی سے لطف اُٹھایا جا سکتا ہے۔ آئندہ منصوبوں میں ''ڈائمنڈ ویلی'' کی توسیع بھی شامل ہے جس سے اس کا رقبہ بڑھ جائے گا۔

• **بَحرالکاہل:** کان میں مختلف مقامات پر کھدائی سے وجود میں آنے والے گڑھے، پہاڑ کی سطح سے رِس رِس کر اندر آنے والے پانی کی بدولت تالابوں کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ یہ تمام تالاب پینتیس سے اسّی فٹ تک گہرے ہیں۔ ان کی تعداد ساٹھ سے ستّر کے لگ بھگ ہے۔ سب سے بڑا تالاب ستّر فٹ چوڑا اور اسّی فٹ گہرا ہے۔ اسے ''بَحرالکاہل'' کا نام دیا گیا ہے۔ تمام تالابوں کا پانی اس قدر شفاف ہے کہ ان کی تہہ بھی باآسانی دکھائی دیتی ہے۔ انہی تالابوں کا پانی پائپوں کے ذریعے نکال کر بین الاقوامی کیمیکل ساز کمپنی ICI کو فروخت کیا جاتا ہے۔ یہ نمکین پانی کیمیکلز کی تیاری کے لیے بنیادی ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے۔ نمک کے ان تالابوں میں کوئی چیز نہیں ڈوبتی۔ جب گائیڈ سیاحوں کو اس عجوبے سے آگاہ کرتے ہیں، تو ان میں سے کئی ہاتھ میں پکڑی پانی کی بوتلیں وغیرہ تالاب میں پھینک کر اس بات کی صداقت جانچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تالاب میں چیزوں کے نہ ڈوبنے کی وجہ نمک کے مسلسل گھلتے رہنے سے پانی میں مزید حل پذیری کی صلاحیت کا ختم ہونا ہے۔

• **کیفے ٹیریا:** کان کی سیاحت کے لیے آنے والوں کی سہولت کے لیے کان میں ایک کیفے ٹیریا بھی بنایا گیا ہے۔ لوگ پہاڑ میں موجود قدرت کی جلوہ گری سے مسحور ہونے کے ساتھ ساتھ یہاں بیٹھ کر کھا پی بھی سکتے ہیں۔

• **رنگین روشنیاں:** یوں تو پوری کان میں روشنی کا خاطر خواہ انتظام ہے، مگر کان کے وہ حصے جو سیاحوں کی خصوصی توجہ کا مرکز ہیں، انہیں بطورِ خاص عمدہ قسم کی روشنیوں سے منوّر کیا گیا ہے جس سے یہاں ایک سحر انگیز ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ ان مقامات میں مسجد، مینارِ پاکستان کا ماڈل، ڈائمنڈ ویلی اور شیش محل وغیرہ نمایاں ہیں۔ جب روشنی نمک سے چھن چھن کر باہر آتی ہے تو بڑا روح پرور سماں پیدا ہو جاتا ہے۔ نمک کی شفافی اور خوبصورتی کو

نمایاں کرنے کے لیے کان میں ریفلیکٹر ٹائپ روشنیوں کا انتظام کیا گیا ہے۔

- **محافلِ میلاد:** دو دفعہ محافلِ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کانِ نمک میں منعقد کی گئیں۔
- **عکس بندی:** 1959ء میں کانِ نمک میں فلم ''آدمی'' کی شوٹنگ ہوئی۔
- **نمک کی سیڑھیاں:** کھیوڑہ کی کان سے سیڑھیوں کا ایک راستہ اوپر دمہ سنٹر کو جاتا ہے۔ سیڑھیوں کی تعداد ایک سو دو ہے۔ سکھ دور میں تعمیر کئے گئے اس راستے کے ذریعے کان کُن اُس وقت کان میں آتے جاتے تھے۔ انگریز دور میں بھی یہ راستہ زیرِ استعمال رہا اور مین حصے سے صرف نمک کے بھرے ڈبے ہی انجن کے ذریعے باہر لے جائے جاتے تھے۔ اب یہ راستہ دمّہ سنٹر میں مقیم مریض کان میں آنے جانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔
- **دمّہ سینٹر:** ہوا میں بڑھتی ہوئی آلودگی سے سانس کی بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ آبی آلودگی کی وجہ سے جلد کے امراض بڑھ رہے ہیں۔ ان سب کا علاج نمک سے کامیابی سے کیا جاسکتا ہے۔ مشرقی یورپ کے ممالک آسٹریا، ہنگری، پولینڈ، رومانیہ اور روس میں سالٹ سینی ٹوریم قائم ہیں۔ رومانیہ میں نمکین پانی کی سات ایسی جھیلیں ہیں جو جلد کے امراض، استحالی امراض، دردِ شقیقہ حتیٰ کہ بانجھ پن تک کے علاج میں معاون ثابت ہو رہی ہیں۔ پنجاب منرل ڈیولپمنٹ کارپوریشن (پی ایم ڈی سی) کے میڈیکل سروسز ڈیپارٹمنٹ نے اس جدید تحقیق کی روشنی میں مشاہدے کے بعد پتہ چلایا کہ نمک کی کان میں ایسے قدرتی عوامل پائے جاتے ہیں جو اپنے منفرد طبّی خواص اور بخارات کے باعث دمّہ کے مریضوں کے لیے سودمند ہیں۔ دمّہ کے مریض کانِ نمک کے اندر چند دن سانس لینے کے بعد مکمل صحت یاب ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں نمک کی دیگر کانوں کے تجربات کی روشنی میں کھیوڑہ کانِ نمک میں بھی ایک دمّہ سنٹر قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ 03-2002ء میں پی ایم ڈی سی نے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ اسلام آباد اور آرمی میڈیکل کالج راولپنڈی (NUST) کے اشتراک سے کان میں دمّے کے علاج کے امکانات کا جائزہ لیا۔ 26 مارچ 2007ء کو کانِ نمک میں ''استھما ریزارٹ'' کا افتتاح ہُوا۔ سینٹر کے قیام پر ایک کروڑ روپے کی لاگت آئی۔ یہاں رجسٹرڈ مریضوں کی تعداد اسی ہزار ہے۔
- **گائیڈز:** کانِ نمک سیاحوں کے لیے اتوار اور سرکاری تعطیلات سمیت پورا سال کھلی رہتی ہے، سوائے عیدین اور دسویں محرم کے۔ کان کی سیر کے اوقات صبح نو بجے سے شام چھ بجے تک ہیں۔ طلبہ اور سیاحوں کی بڑی تعداد ہر سال کھیوڑہ کی بھُول بھُلیّوں میں کھونے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نظارے کے لیے آتی ہے۔ تجسس اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کان میں پہلی بار داخل ہونے والے شخص کا حوصلہ بلند کرنے اور اس کی ڈھارس بندھانے والے یہ گائیڈ ہی ہیں جو لوگوں کو کانوں کی سیر اس عمدگی سے کراتے ہیں کہ وہی سیاح جو کان میں داخلے کے وقت وسوسوں کا شکار ہوتا ہے، اس کا کان سے باہر آنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ فریضہ 7 مرد اور 3 خواتین گائیڈز عمدگی سے انجام دے رہے ہیں۔ ان کی دلچسپ باتیں اور کان میں موجود قدرت کے انوکھے نظاروں کا تعارف کسی بوریت کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ کان کی سیر پر تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے صَرف ہوتے ہیں۔ یہ سارا سفر معلومات، حیرت اور دلچسپیوں سے پُر ہے جس میں گائیڈ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ سچ پوچھیں تو کانِ نمک کی سیر کی اصل روح یہی گائیڈ ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو جو نعمتیں عطا کی ہیں، ان کا شمار ناممکن ہے۔ کانِ نمک بھی اللہ کریم کی قدرت کا بے بدل نمونہ اور اہلِ پاکستان کے لئے انمول تحفہ ہے۔

بدلتے رنگ

دیکھئے اِس بَحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا
گُنبدِ نیلو فری رنگ بدلتا ہے کیا

—اقبالؒ

کشمیر — حال اور مستقبل

مکالمہ : اُرون دتی رائے/ڈیوڈ بریسمین

تارید : **حنا فاروق**

اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے مطابق مسئلہ کشمیر کے تین فریق ہیں۔ کشمیری بنیادی فریق ہیں۔ قراردادِ الحاقِ پاکستان 19 جولائی 1947ء نے نہ صرف پاکستان کو فریقِ ثانی بنا دیا' بلکہ پاکستان کو ہی اپنی منزل قرار دیا۔ بھارت نے 1947ء میں فوج کشی کر کے کشمیر کے بڑے حصے پر غاصبانہ قبضہ کر لیا' اس طرح وہ تیسرا فریق بن گیا۔ بھارت کے غاصبانہ قبضے کے خلاف کشمیری عوام نے جہاد شروع کیا جو تا حال جاری ہے۔ تنازعہ کشمیر تقسیمِ برِصغیر کا نامکمل ایجنڈا ہے' کوئی علیحدہ مسئلہ یا معاملہ نہیں۔ اسی کو بنیاد بنا کر اقوامِ متحدہ نے 13 اگست 1948ء اور 5 جنوری 1949ء کو قراردادیں پاس کر کے کشمیریوں کو اس لئے حقِ خودارادیت دیا کہ تقسیمِ برِصغیر کے وقت انہیں اس بنیادی حق سے محروم رکھا گیا تھا۔ کشمیر میں جاری آزادی کی تحریک 1947ء ہی سے شروع نہیں ہوئی بلکہ کشمیری عوام کی جدّ وجُہدِ آزادی 1846ء میں شروع ہوئی جب انگریز نے 75 لاکھ نانک شاہی کے عوض کشمیر کو مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ دوسرا دور 13 جولائی 1931ء کو شروع ہوا جب ڈوگرہ حکمرانوں نے مسلمانوں کی مذہبی آزادی پر حملہ کیا۔ ریاست بھر میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ سری نگر جیل کے سامنے احتجاج کے دوران پولیس کے ہاتھوں 22 مسلمان شہید ہوئے جن کے لہو نے تحریک میں نیا رنگ بھر دیا۔ جدّ وجُہدِ آزادی کا تیسرا دور 3 جون 1947ء کے اعلانِ آزادی کے بعد شروع ہوا جب وائسرائے ہند نے ریاستی عوام کو حکمرانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ کشمیری مسلمانوں نے' جن کی ریاست میں نوّے فیصد آبادی تھی' 19 جولائی 1947ء کو کشمیر کی واحد نمائندہ جماعت آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے قراردادِ الحاقِ پاکستان پاس کر کے تحریکِ آزادی کو الحاقِ پاکستان سے مشروط کر دیا اور مہاراجہ ہری سنگھ پر واضح کر دیا کہ ریاست کی اکثریت کو اعتماد میں لئے بغیر مہاراجہ ریاست کے متعلق تنہا کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ مہاراجہ کے کسی فیصلے تک پہنچنے سے پہلے ہی بھارتی حکمرانوں نے جن سنگھی تنظیم کے دہشت گرد ریاست میں بھیج کر قتل و غارت شروع کرا دی۔ مسلمانوں نے بہ امرِ مجبوری ہتھیار اُٹھا لئے اور شمالی علاقہ جات سمیت 32 ہزار مربع میل علاقہ آزاد کرا لیا۔ پورے جموں و کشمیر پر قبضہ کرنے کے لئے بھارت نے فوج کشی کی' اس کے باوجود کشمیری مجاہدین کی جدّ وجُہد جاری رہی۔ بھارتی حکمرانوں نے کشمیر ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر اقوامِ متحدہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اقوامِ متحدہ کی مداخلت اور پاکستان کے کہنے پر مجاہدین نے فائر بندی کر دی اور کشمیر میں سیز فائر ہو گیا۔ کشمیری عوام نے طویل انتظار کیا' مگر جب دیکھا کہ بھارت اپنے وعدوں سے منحرف ہو گیا اور اقوامِ متحدہ اپنی قراردادوں پر عمل درآمد کرانے میں مخلص نہیں' تو مقبوضہ کشمیر کے نوجوانوں نے 1988ء کے آخر میں مقبوضہ کشمیر کے اندر مسلّح تحریک کا آغاز کر دیا۔

یہ باہر کے نہیں، مقبوضہ کشمیر کے نوجوان تھے۔ان میں استاد، طالب علم، انجینئر اور ڈاکٹر شامل تھے جو حالات سے تنگ آ کر ہتھیار اُٹھانے پر مجبور ہوئے۔ مقبوضہ کشمیر میں ایک لاکھ سے زائد شہداء کی قبریں اس کی گواہ ہیں، اس لئے اسے غیر ملکی مداخلت کا نام دینا غلط ہے۔تحریکِ آزادی کا یہ چوتھا دور تھا۔ 9/11 کے بعد بھارت بین الاقوامی برادی کو ورغلانے میں کامیاب ہوگیا۔مقبوضہ کشمیر کے عوام نے اپنی تحریک میں جدّت پیدا کر کے سیاسی محاذ پر بھی تحریک شروع کر دی ہے۔کشمیری رہنما جناب عبدالعزیز شیخ کی قیادت میں پاکستان کی منڈیوں کی طرف مارچ ہُوا۔جناب عبدالعزیز شیخ اور ان کے ساتھیوں کو بھارتی فوج نے شہید کر دیا۔بیرونی دنیا میں بھی کشمیریوں نے سفارتی محاذ پر جدّ وجُہد تیز کر دی ہے۔بھارت کی سیاسی تنظیموں کے نمائندوں سے رابطے بھی اس سلسلے کی کڑی ہیں۔یہ پانچواں دور ہے۔(ایڈیٹر)

آج کشمیر میں کیا ہو رہا ہے اور مستقبل میں کیا ہونے والا ہے؟ بے خوفی اور حق گوئی کے لئے معروفِ زمانہ بھارتی مصنفہ اُرون دتی رائے سے امریکی صحافی ڈیوڈ برسمین (David Barsman) کے ایک انٹرویو کے چند حصوں کے مطالعے سے اس سوال کا جواب مل جائے گا، ملاحظہ فرمائیے

ڈیوڈ برسمین: 2011ء کا موسمِ گرما مقبوضہ کشمیر کے لئے خونی موسمِ گرما تھا۔یہ پتھر اور پتھر پھینکنے والوں کا موسم تھا۔آپ اکثر جدّوجُہدِ آزادیِ کشمیر کے بارے میں لکھتی رہی ہیں۔یہ پتھر آخر کیا کہانی سُنا رہے ہیں اور پتھر مارنے والے کون ہیں بھلا؟

ارون دتی رائے: خونی موسمِ گرما!! آپ نے بالکل درست کہا، کیونکہ کشمیریوں کے لیے یہ 1990ء سے اب تک کا خونیں ترین موسمِ گرما تھا۔اگرچہ اب تک تقریباً 70 ہزار سے زائد کشمیریوں کا قتلِ عام ہو چکا ہے، لیکن یہ موسمِ گرما مختلف نوعیت کا تھا۔بھارتی حکومت کی طرف سے مسلسل دعویٰ کیا جاتا رہا ہے کہ اُن عسکریت پسند جنگجوؤں کا خاتمہ کر دیا گیا ہے، جو 1990ء کے عشرے میں اچانک سامنے آئے تھے۔بھارتی عوام کو تقریباً قائل کر لیا گیا تھا کہ امن قائم کروالیا گیا ہے اور حکومت، کشمیر میں معمول کی زندگی واپس لے آئی ہے۔اب کشمیری نوجوان کافی شاپس، ریڈیو سٹیشن اور ٹی وی شوز کے ذریعے قومی ترقی میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔یہ یک طرفہ پروپیگنڈا اتنا مؤثر تھا کہ غیر جانب دار حلقے بھی یقین کر چلے تھے کہ تحریکِ آزادیِ کشمیر کا گلہ گھونٹ دیا گیا ہے۔اچانک ہم سب نے دیکھا کہ پچھلے مسلسل تین برسوں کے موسمِ گرما سے کشمیر کے گلی محلوں کی سطح پر ایک تحریک اُبھرتی ہے، اور پھر جو مناظر ہم کشمیر کے بازاروں کے چوراہوں میں دیکھتے ہیں، وہ مصر میں التحریر چوک کے مناظر سے بے حد مشابہ ہیں اور یہ مناظر اب بھی بار بار دُہرائے جا رہے ہیں... سچ تو یہ ہے جدّوجُہدِ آزادیِ کشمیر سے وابستہ نوجوانوں کے تمام گروہ اپنے اظہار کی شکل بدل بدل کر ہمارے سامنے اپنا مدعا بیان کر رہے ہیں۔میں سمجھتی ہوں یہ کافی مشکل راستہ ہے جو نوجوان کشمیری نسل نے اختیار کیا ہے۔ انھوں نے مضبوط نوکر شاہی کے تمام پُر تشدد حربوں کا استقامت کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔یہ اُن کا عزم، استقلال اور صبر ہی ہے جس کی وجہ سے لاتعداد، جدید ترین اسرائیلی اور بھارتی اسلحہ رکھنے کے باوجود بھارتی حکام کو سمجھ نہیں آ رہا کہ ان پتھر مارنے والوں سے کیسے نمٹا جائے۔اس بے بسی کے بعد بھارتی قبضے کو اخلاقی جواز صرف بھارت نواز پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے فراہم کیا جاتا ہے۔یہ یک طرفہ پروپیگنڈے پر مبنی شور وغل، ایک بڑے ڈیم (آبی ذخیرے) کی طرح ہے، لیکن اس اجارہ داری کو انٹرنیٹ (فیس بک، ٹویٹر اور یُوٹیوب) نے کافی حد تک روک دیا ہے،

اس لیے ہر روز نئی کہانیاں سامنے آتی ہیں۔ مقبوضہ کشمیر فوجی کیمپوں' تفتیشی مراکز' جیلوں' مورچوں اور بنکرز سے اٹا پڑا ہے جس کی وجہ سے یہ رقبے اور آبادی کے لحاظ سے' پوری دنیا میں سب سے زیادہ فوج رکھنے والا علاقہ بن گیا ہے۔

سوال: اس پس منظر میں مقامی کشمیری کس طرح زندگی گزار رہے ہیں؟

جواب: میرا خیال ہے کہ جدّوجُہدِ آزادیِ کشمیر کو اب کوئی ختم نہیں کر سکتا' کیونکہ کشمیریوں نے اپنے بارے میں خود لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اب ہمیں کشمیریوں کی کہانیاں سنانے کی ضرورت نہیں رہی' اور ویسے بھی ہم اُن کی اذیّت ناک کہانیوں کو اپنے ذاتی تجربات کی حیثیت سے بیان نہیں کر سکتے... ہمیں حقیقت جاننے کے لیے انسانی حقوق کی رپورٹس' اخبارات میں بیان کردہ ٹارچر سیلوں (عقوبت خانوں) کے احوال اور جھوٹے مقدمات کی بنیاد پر گرفتاریوں کی تفصیلات کے مطالعے سے صورتِ حال سے آگاہی حاصل کرنا پڑتی ہے' لیکن ہم اُن جیسا محسوس تو نہیں کر سکتے۔ مَیں ابھی تک اس سوال کے جواب کی تلاش میں ہُوں کہ آپ کس طرح محسوس کریں گے اگر آپ کے سامنے آپ کے بوڑھے ماں باپ کو تھپڑ رسید کئے جائیں یا پھر آپ کی بچیوں کو بے عزت کیا جائے۔ اس طرح کے واقعات تو جیل میں ہوتے ہیں۔ مجھے تو کشمیر دنیا کا سب سے بڑا جیل خانہ لگتا ہے۔ کشمیری اگر اپنی روز مرہ زندگی کے معمولات کی یادداشتیں لکھیں' تو پھر یہ ایک قیدی کی یادداشتیں ہوں گی... حقیقت یہ ہے کہ جب سے بھارت نے برطانیہ سے آزادی حاصل کی ہے' تب سے بھارت کے کونے کونے میں جنگیں چھیڑ دی گئی ہیں اور یہ جنگیں کشمیر کے ساتھ ساتھ منی پور' ناگالینڈ' میزورام اور آسام میں جاری ہیں۔ کشمیر اب واحد جگہ نہیں رہا جہاں شناخت پریڈ' مورچہ بندی' دورانِ تشدد' قتل و غارت اور انسانی حقوق کی پامالی کی جا رہی ہو۔ یہ جنگ

> مصر میں احتجاج کی لہر اُٹھی اور عوام التحریر چوک میں جمع ہوئے تو بین الاقوامی میڈیا نے اس سارے واقعے کو بہت زیادہ کوریج دی۔ 2008ء سے اب تک کشمیر میں ہر موسمِ گرما میں التحریر چوک جیسے کئی مناظر وقوع پذیر ہو چکے ہیں' لیکن اس کی معمولی سی کوریج بھی بین الاقوامی میڈیا پر نظر نہیں آ سکی۔ کچھ تحریکوں کو زیادہ کوریج کیوں دی جاتی ہے اور باقیوں کو کیوں نظر انداز کر دیا جاتا ہے؟ حالانکہ اگر مزاحمت کرنے والوں کے حوصلے' پامردی اور جرأت کے حوالے سے دیکھا جائے تو پھر مصر ہو یا کشمیر' سب برابر ہیں' لیکن بین الاقوامی میڈیا بالخصوص مغربی میڈیا کا صرف ایک جانب توجہ مرکوز کئے رکھنا اور دوسرے کو یکسر نظر انداز کر دینا' پُر اسرار معاملہ ہے۔
>
> — BBC' راؤنڈ دی ورلڈ' 29 نومبر 2012ء: سید علی شاہ گیلانی

اب بھارت کے مرکز تک پہنچ چکی ہے' لیکن بھارتی حکمران ان آوازوں پر کان نہیں دھرنا چاہتے جو کشمیر کے گلی محلوں سے آ رہی ہیں اور نہ اُن اسباق ہی کو پڑھنا چاہتے ہیں جو پتھروں پر لکھے ہوئے آ رہے ہیں' چنانچہ اب باقی تمام تر بھارت کئی لحاظ سے کشمیر بنتا رہا ہے۔

سوال: مسئلہ کشمیر عالمی توجہ حاصل کرنے میں ناکام کیوں رہا؟

جواب: مصر میں ہم نے دیکھا کہ لمحہ بہ لمحہ رپورٹنگ ''جمہوریت کی طرف بڑھتے ہوئے قدم'' کی حیثیت سے دکھائی گئی۔ شہ سرخیاں جمائی گئیں ''مصر اب آزاد ہے۔ مصر تسلط سے آزاد ہو گیا۔'' لیکن کشمیر کے بارے میں اُن کے پاس کہنے کو الفاظ نہیں ہیں۔ کیا یہ محض مفاداتی سیاست نہیں کہ مصر مغربی اسٹیبلشمنٹ کے لئے اہم ملک ہے' کیونکہ مصر کو کنٹرول میں لائے بغیر غزہ کے محاصرے کے کوئی معنی نہیں ہیں اور حُسنی مبارک بھی اپنے اقتدار سے علیحدہ ہونے سے پہلے اخبارات کے مطابق' لمحہ بہ لمحہ گرتی ہوئی صحت کی وجہ سے موت کے قریب جا رہا تھا۔ دوسری طرف کشمیر کو کوریج نہیں دی جا سکتی کیونکہ اگر کشمیر ہاتھ سے جاتا ہے' تو پھر

افغانستان اور بھارت میں بہت کچھ چلا جائے گا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کشمیریوں کی درد بھری آہیں کوئی ایسی چیز نہیں جس کے لئے دنیا کے ممالک ایک ارب سے زائد آبادی کے حامل ملک بھارت کی پُرکشش منڈی کو کھودیں اور اپنے سب سے بڑے گاہک کو ناراض یا غضب ناک کر دیں' اس لیے استحصال پر مبنی موجودہ صورتِ حال اور منظر نامے کو کوئی بھی تبدیل کرنا نہیں چاہتا۔ لہٰذا مغرب کو بھارت کی دو وجوہات سے ضرورت رہے گی: ایک تو یہ کہ بھارت ایک انتہائی وسیع اور بڑی منڈی ہے۔ دوسرا: بھارت کو چین کے مقابلے میں کھڑا کرنے کی مغربی خواہش۔ ان عوامل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا' اس لیے کشمیر سے متعلق انسانی حقوق کی پامالی کی تمام تر تفصیلات ایک طرف رکھتے ہوئے' بھارت مغرب کا مستقل نوعیت کا اتحادی رہے گا اور مسئلہ کشمیر کے لیے بھارت کو ناراض کرنا کبھی بھی مغربی طاقتوں کی حکمتِ عملی نہیں بن سکتی۔

سوال: بے رحم حکومتوں کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی اقلیتوں کو انسانی حقوق سے محروم کر دیتی ہیں یا پھر اُن کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کر کے اُن کے اثرات کو زائل یا کم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ کیا بھارت بھی وہاں یہی کچھ کر رہا ہے؟

جواب: ہندوستان میں 1857ء کی جنگِ آزادی کو بھارتی حکومت بغاوت کا نام دیتی ہے اور بعض لوگ اسے آزادی کی جنگ کہتے ہیں۔ برِصغیر پاک و ہند میں برطانیہ کے فوجی بہت زیادہ نہیں تھے لیکن 1857ء میں سکھوں نے برطانیہ کی طرف سے دہلی کے قریب لڑائی لڑی تھی۔ یہی کچھ بھارت اب خود کر رہا ہے۔ اُس نے ناگالینڈ کے غریب عیسائیوں کو لڑنے کے لیے چھتیس گڑھ بھیجا۔ چھتیس گڑھ والوں کو کشمیر اور کشمیریوں کو اڑیسہ تعینات کیا گیا۔

سوال: بھارت کا مسلسل اصرار ہے کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔ موجودہ بھارتی وزیرِاعظم نے' جو 1990ء کے عشرے میں وزیرِ مالیات تھے' جب بھارت میں لبرل اصلاحات کا نفاذ کیا تو تسلیم کیا تھا کہ کشمیر میں گڑبڑ ہے۔ پھر بتایا گیا کہ معاملات اب قابو میں ہیں۔ اب کہا جا رہا ہے کہ بھارت اور کشمیر کے معاملے کا موازنہ فلسطین اور اسرائیل کے تنازعے سے نہیں کیا جانا چاہیے' کیونکہ بھارت میں ایک متحرک جمہوریت کام کر رہی ہے۔ سیاست دان بھی جب بات کرتے ہیں تو سچائی کو جانے اور صورتِ حال کو سمجھے بغیر عزمِ مصمم کا اعادہ کرتے ہیں کہ کشمیر بھارت کا حصہ رہے گا' آپ کا تبصرہ؟

جواب: یہ کہنا کہ بھارت ایک متحرک جمہوریت ہے یا پھر فلسطین اسرائیل تنازعے کا کشمیر سے موازنہ نہیں کیا جانا چاہیے' دونوں ہی غلط دعوے ہیں۔ یہ غلط معلومات گمراہ کُن اور دل پسند مفروضوں پر مبنی ہیں۔ تاریخ سے ہم بخوبی جان سکتے ہیں (اگر ہم متعصب نہ ہوں) کہ بھارت کا کشمیر سے سیاسی اور جغرافیائی رشتہ ماضی قریب میں کیا رہا ہے اور یہ کہنا کہ کشمیر کا فلسطین اسرائیل تنازعے سے موازنہ نہیں ہو سکتا' تاریخ کو جھٹلانا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کشمیر میں زیادہ بڑے پیمانے پر پکڑ دھکڑ کا سلسلہ جاری ہے۔ سیکڑوں نوجوانوں کو پکڑا اور بغیر ٹھوس ثبوت کے جیل میں ڈالا جا رہا ہے۔ فیس بک کو بند کر دیا گیا ہے۔ پولیس لوگوں کو خوف زدہ کر رہی ہے' املاک جلا رہی ہے۔ کھڑکیوں کے شیشے توڑ کر گھروں میں داخل ہو جاتی ہے۔ ایسی جگہیں جہاں درجہ حرارت 30 سینٹی گریڈ سے کم ہوتا ہے' وہاں آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ اس لیے ایک لحاظ سے کشمیر اور مسئلہ فلسطین کا موازنہ بنتا نہیں۔ کشمیری زیادہ بدتر صورتِ حال بھگت رہے ہیں۔ جب متحرک جمہوریت کی بات کی جاتی ہے' تو کشمیر میں متحرک فوجی قبضہ ضرور نظر آتا ہے۔ بھارت میں متحرک جمہوریت ہمیں دہلی' کیلاش یا گرین پارک میں تو نظر آتی ہے لیکن ڈانڈی والا' منی پور' اُڑیسہ

جھاڑکھنڈ، چھتیس گڑھ اور کشمیر میں ہرگز اس کا وجود نہیں ہے۔

متحرک جمہوریت کے دعوے کے جواب میں مَیں بھارتی وزیرِ اعظم سے ایک سوال کا جواب چاہتی ہوں۔ اگر چھتیس گڑھ کے دیہاتی یا عام کشمیری کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے اور یہاں ناانصافی سے مراد یہ ہے کہ اُس کے خاندان کے چند افراد کو قتل کر دیا جاتا ہے یا جان و مال کی سلامتی کا تحفظ کرنے والے ادارے اُس کی بیٹی یا بہن یا بہو کی بے حرمتی کرتے ہیں، تو آخر اس متحرک جمہوریت میں ایسا کون سا غیر جانب دار ادارہ ہے جہاں جا کر وہ حصولِ انصاف کے لیے درخواست دائر کر سکے اور انصاف حاصل کر سکے؟ ہے کوئی؟ یقیناً کوئی نہیں! چنانچہ بات یہاں ختم ہو جاتی ہے۔

سوال: اتنی مزاحمت کے باوجود بھارت کشمیر میں کیوں اڑا ہُوا ہے؟

جواب: بہت سی وجوہات ہیں۔ پہلی بات یہ کہ بھارت کو وہاں سات لاکھ فوجیوں کے لئے کتنی بڑی رقم کی ضرورت ہوگی جو قبضہ برقرار رکھنے کے لئے مؤثر کردار ادا کر سکے؟ وہ رقم جو زمین، خاردار تاروں، بکتر بند گاڑیوں، پٹرول اور اس جبر کو برقرار رکھنے کے لیے چاہیے، نیز رشوتوں اور دیگر مدوں میں دی جانے والی رقم اس کے علاوہ ہے۔ یہ عسکری کاروبار مؤثر انداز سے مقامی غیر مسلم اشرافیہ اور کاروباری کمپنیوں کے مابین چل رہا ہے۔ منافع میں سب کا حصہ ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا ملک چلانے جیسا ہے۔ پھر آخر کیوں کوئی اسے چھوڑنا چاہے گا؟

دوسری وجہ یہ ہے کہ کشمیر کا تنازع بھارت کی قومی اَنا کا مسئلہ بنا دیا گیا ہے۔ اب بھارت اتنا دُور نکل آیا ہے کہ اس کو اپنی طے کردہ پالیسی پر دوبارہ سوچنے کے لئے گہری بصیرت کی ضرورت ہوگی۔ ایسی صورتِ حال میں جہاں سیاسی جماعتیں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوں اور ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دے رہی ہوں، مثلاً برسرِ اقتدار کانگریس اگر کوئی جرأت مندانہ اقدام کرنا چاہے، تو

> بھارتی اخبارات اور ٹی وی پر ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے کہ کشمیریوں کو فوج اور پولیس میں بھرتی کیا جانا چاہیے۔ یہ ایک طرح سے ان کا مذاق اور بے آبروئی ہے۔ اعلان کیا جاتا ہے کشمیریوں نے خاموشی سے زرِ تلافی قبول کر لیا ہے، گویا پہلے فوج کشمیریوں کا قتلِ عام کرے، اُن کے قریبی رشتہ داروں کو معمولی معاوضوں پر شورش زدہ علاقوں میں بھیج کر اپنے قومی مفادات پورے کرے، یہ دوہرا ظلم ہے۔ یوں لگتا ہے سرکاری منصوبے کا ایک ہی مقصد ہے کہ ہر سطح اور ہر قیمت پہ کشمیریوں کو زیادہ سے زیادہ بے عزت کیا جائے، یعنی محض جسمانی تشدد اور قتل و غارت گری کے ذریعے ہی نہیں، بلکہ نفسیاتی طور پر اذیّت پہنچا کر بھی۔
>
> —— کشمیر میں بھارتی منصوبہ: کلدیپ نائر (روزنامہ ایکسپریس، 2 دسمبر 2012ء)

بی جے پی اس پر سیاست چمکانا شروع کر دے گی اور حقیقت پسندانہ فیصلے کے لئے کوئی موقع نہیں چھوڑے گی۔ اس طرح یہ منحوس چکر چلتا رہتا ہے۔

ایسی بات بھی نہیں کہ کشمیر پر بھارتیوں کے موقف میں دراڑیں نہ پڑی ہوں۔ یہ دراڑیں کشمیریوں کی پُرامن، بغیر اسلحے کے سیاسی جِدّوجُہد کے نتیجے میں اور زیادہ گہری اور وسیع ہوتی جائیں گی۔ عام پڑھے لکھے بھارتی اب کشمیریوں کی آواز سننے پر مجبور کر دیے گئے ہیں۔ اب حکمران عوام کو یہ کہہ کر بہلا نہیں سکتے کہ یہ جنگجو ہیں، یہ اسلامسٹ ہیں، یہ طالبان ہیں! بھارت میں اُوٹ انگ والا طے شدہ موقف دم توڑ رہا ہے، اس لیے چھتیس گڑھ، اُڑیسہ، جھاڑکھنڈ، کشمیر اور کسی حد تک منی پور میں بھارت نواز حکومت اس امر سے باخبر ہے کہ کشمیر کے بارے میں بھارتی عوام کے قومی اتفاقِ رائے کو ٹھیس پہنچی ہے۔

سوال: کشمیر میں ایک صحافی نے مجھے بتایا کہ پچھلے کئی برسوں سے اعلیٰ سطح کے اسرائیلی فوجی، بشمول اسرائیلی خفیہ اداروں کے سربراہان، کشمیر کا دورہ کرتے رہتے ہیں۔ وہاں کیا کر رہے ہیں وہ؟

جواب: افغانستان پر قابض قوت اس حقیقت سے باخبر ہے کہ پاکستان کے ساتھ تعلقات متزلزل نوعیت کے رہیں گے۔ پاکستان ایٹمی طاقت ہے' افغانستان کی مہم جوئی میں اس کا تعاون بے حد ضروری ہے کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ اب وہاں کیا کرنا ہے؟ وہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ افغانستان سے باہر کیسے نکلنا ہے؟ پھر چین کے عروج کا مسئلہ بھی ہے۔ وسطی ایشیا میں وسیع پیمانے پر قدرتی گیس کے ذخائر بھی مسئلہ ہیں اور بھارت کو جمہوری فکر اور حقِ حکمرانی کی آزادی میسّر ہے' لیکن یہی آزادی اب خود بھارت کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ امریکا پیچھے ہٹ کر نئے اتحادی کی تلاش میں ہے کیونکہ پاکستان کو وہ نچوڑ چکا ہے اور پاکستان ہاتھ سے نکل رہا ہے۔ مَیں یہ سب کچھ ہوتے ہوئے دیکھ رہی ہوں' اس لیے وہ کشمیر اور لدّاخ سے پسپائی کا تصور نہیں کر سکتے۔ اسرائیلیوں کا عمل دخل بھی اپنے سرپرست کی مداخلت کی طرح ہے۔ اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ امریکہ نے کسی دوسرے ملک کے مقابلے میں سب سے زیادہ مشقیں بھارت کے ساتھ مل کر کی ہیں۔ ''نیویارک ٹائمز'' کے مطابق جب اوباما نے 2010ء میں بھارت کا دورہ کیا تو اعلان کیا: ''بھارت بڑی تیزی سے اسلحہ خریدنے والے قابلِ اعتماد خریدار میں تبدیل ہو رہا ہے۔'' یہی وجہ ہے جب اوباما چوٹی کی 200 تجارتی کمپنیوں کے سربراہوں کے ساتھ بھارت آئے تھے تو 5 ارب ڈالر کی مالیت سے زیادہ کے 17-سی بوئنگ جنگی طیاروں کے معاہدے پر دستخط کیے تھے۔ ''نیویارک ٹائمز'' نے اسے بھارت کی جدید ترین اسلحے کی بھوک قرار دیا تھا... ''یہ سچ ہے کہ بھارت کی یہ بھوک بڑھ چکی ہے۔ زیادہ تر یہ اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے ہے۔ حالانکہ یہ بے چارے نہیں جانتے کہ یہ جدید ترین حساس اسلحہ انہوں نے آخری بار کب استعمال کیا تھا؟ آخر اب کس کے خلاف استعمال ہوگا؟ وہ ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ دونوں ممالک جوہری طاقتیں ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ بڑے بڑے کارپوریٹ ادارے جتنے زیادہ جدید ترین اسلحہ بناتے جائیں گے' اتنا زیادہ روایتی جنگ کا خدشہ کم ہوتا جائے گا' لیکن اس کے ساتھ ساتھ جو خطرات مزاحمت کاروں کی طرف سے آ رہے ہیں' انہیں جدید ترین ٹینکوں' جنگی طیاروں یا تارپیڈو کے وار سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ یقیناً تمام ممالک اس رَوِش پر چل رہے ہیں' لیکن بھارت سب سے آگے ہے۔ جاسوسی کے آلات کا طوفان اُمڈ پڑا ہے' حالانکہ روایتی اسلحے کا زیادہ تر استعمال نیو دہلی میں راج پتھ کی روایتی پریڈ کے دوران ہوتا ہے۔ محض دکھاوے کا ڈرامہ سرمایہ کاری کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس ملک میں جہاں اربوں' کھربوں روپے خوف پر مبنی خارجہ پالیسی کے تحت اسلحے کی خریداری میں جھونک دیے جاتے ہیں' عام آدمی بیس روپے روزانہ سے بھی کم پر گزارا کر رہا ہوتا ہے...''

سوال: اس گفتگو سے واضح ہوا کہ بھارت میں رہتے ہوئے سرکاری موقف سے مختلف نقطہ نظر پیش کرنا کتنا مشکل ہو گیا ہے' لیکن آپ نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے: ''اس قدر تشدّد اور لالچ کے درمیان ابھی بھی کافی امید باقی ہے...'' یہ امید آپ کیسے دیکھتی ہیں؟

سوال: اُمید مجھے صرف عام لوگوں کی آنکھوں میں نظر آتی ہے۔ اب 2012ء ہے' احتجاج بڑھ چکا ہے۔ ریاست کا ظلم ڈھکا چھپا نہیں رہا۔ ہزاروں مزاحمت کار جیلوں میں ہیں' لیکن ان کے جذبے اور تحریک کو دبایا نہیں جا سکا۔ آخر دنیا میں کسی اور جگہ یہ کب ہوا ہے کہ دنیا کے امیر ترین کارپوریٹ اداروں نے ریاست کے ساتھ مل کر عوام کو دبانے کی کوشش کی' لیکن وہ اس مقصد میں ناکام رہے اور تمام تر مزاحمتی گروہ آپس کے اختلافات اور اختلافِ رائے کے باوجود' ان طاقت وروں کو روکنے میں کامیاب رہے ہوں۔ یقیناً یہ ان کے لیے بہت بڑا دھچکا ہے!

تبدیلی کی لہر

ڈاکٹرانیس احمد

مسلم دنیا گذشتہ دوصدیوں میں عظیم سیاسی' معاشی' معاشرتی اور ثقافتی انقلابات اور بیرونی طاقتوں کا خصوصی مرکز رہی ہے۔ اُمت کے اندرونی خلفشار' فکری انتشار' معاشی اضمحلال اور عسکری پس ماندگی نے اسے بیرونی طاقتوں کے لیے ایک تَرنوالہ بنادیا۔ چنانچہ انیسویں صدی میں مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ جو مسلمانوں کی عالمی طاقت کا مظہر تھے' دیکھتے ہی دیکھتے یورپی سامراجی طاقتوں کے زیراثر آ گئے۔ برطانیہ نے 1992ء میں مصر کو زیرِنگیں کیا اور اسی دوران فرانس نے الجزائر' تیونس' مراکش اور شام پر تسلط قائم کیا۔ سلطنتِ عثمانیہ کے زوال کے نتیجے میں اٹلی نے لیبیا کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ ایک جانب مغربی سامراج اپنے توسیعی عزائم کے ساتھ مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ میں اپنے قدم جما رہا تھا' دوسری جانب اللہ تعالیٰ کے قانون کی پیروی کرتے ہوئے بے سروسامانی کے باوجود اُمتِ مسلمہ میں بیداری کی لہر اُبھر رہی تھی۔ 1920ء میں شیخ عبدالکریم الریفی نے ریف میں سپین کی افواج کو شکست دے کر ایک اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی لیکن مراکش پر قابض فرانسیسی سامراج سے ٹکر اُن کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔ ادھر سوڈان میں محمد احمد المہدی کی قیادت میں برطانیہ کے خلاف تحریکِ آزادی برپا ہوئی اور اسی عرصے میں لیبیا میں افسانوی کردار کے حامل رہنما عمر مختار نے اطالوی سامراج کا بیس سال تک پامردی سے مقابلہ کیا۔ یہ تحریکات اور ان کے بانی مکمل طور پر تو اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے لیکن انہوں نے بیرونی سامراج کے خلاف جس جِدّوجُہد کو اپنے خون سے سینچا' وہ بالآخر نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔

مسلم دنیا سے مغربی سامراج کے پسپا ہونے کے بعد حالات ایک نیا رُخ اختیار کر گئے۔ اب مغربی سامراج کی جگہ اس کے تربیت یافتہ سلاطین اور آمروں کا دور شروع ہوا۔ مصر میں جمال عبدالناصر کے بعد حُسنی مبارک' لیبیا میں معمر قذافی' یمن میں علی عبداللہ صالح نے اپنے عوام کو اپنی ناجائز دولت اور ظلم و جور کے ذریعے خاموش رہنے اور اپنے ذاتی اقتدار کو قائم رکھنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔

مسلم دنیا میں جو انقلابی لہر نظر آ رہی ہے' وہ اسی آمریت' ملوکیت اور سلطانی کے خلاف عوام الناس کے اتحاد کی مظہر ہے' لیکن بات اتنی آسان بھی نہیں ہے۔ بنیادی طور پر ہر انقلابی تحریک کا آغاز اندر سے ہوتا ہے اور جب تک اندرونی عنصر اس میں شامل نہ ہو' کوئی تحریک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی' لیکن حالیہ تحریکات میں بیرونی ہاتھ' وسائل اور دولت کا استعمال جس آزادی سے کیا گیا' وہ مسلم دنیا کو کسی نہ کسی طرح اپنی گرفت میں رکھنے اور اس کے وسائل کو اپنے تصرف میں لانے کے ایجنڈے کا ایک اہم پہلو ہے۔

امریکی یمن سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ سی آئی اے کے سربراہان کے بقول یمن میں پائی جانے والی 'القاعدہ' کی قوت پاکستان یا کسی اور ملک سے کہیں زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ہے۔

لیبیا میں بھی بیرونی مالی، عسکری اور سیاسی وسائل کو کھلے عام اس غرض سے استعمال کیا گیا تھا کہ یا تو لیبیا کو مشرقی اور مغربی حصوں میں تقسیم کر دیا جائے یا قذافی اور ان کے حمایتی قبائل کو شکست دے کر لیبیا کے تیل کے ذخائر کو مغربی اقوام کے استعمال کے لیے آسان بنا دیا جائے۔ اٹلی کے وزیر خارجہ فرانکو فرینتی نے رائٹر کو بیان دیا تھا کہ اٹلی 400 ملین یورو نقد امداد قذافی کے مخالفین کو دیتا رہا۔ ناٹو کو ایک امریکی تجزیہ کار ولیم بلم نے ''ننگی جارح تنظیم'' کے نام سے یاد کرتے ہوئے اس کی کارگزاری پر سخت تنقید کی۔ لیبیا پر اس کی کتاب Killing Hope میں تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ: ''عراق، افغانستان، پاکستان، صومالیہ، یمن اور لیبیا پر جس طرح جارحیت کی گئی، اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر امریکی صدر کے ساتھ معاملہ کیا ہے؟ قطر سے جاری ہونے والی الجزیرہ کی نشریات امریکی پالیسی اور ناٹو کی تباہ کاریوں کی بھرپور توثیق کرنے کے سبب اپنا اعتبار کھو چکی ہیں۔ ناٹو کے 13 ہزار سے زائد فضائی حملوں میں 4 ہزار 9 سو 63 بمباریوں میں ہزار ہا افراد شہید اور زخمی ہوئے، جب کہ ذرائع ابلاغ صرف قذافی کی حمایتی فوج کی تباہ کاریوں کا تذکرہ کرتے رہے۔ ان تمام حملوں کو لیبیا کے خلاف جنگ نہیں قرار دیا جاتا۔''

ولیم بلم سوال کرتا ہے کہ: ''اگر کوئی بیرونی طاقت امریکا کی سرزمین پر میزائل داغے تو کیا اسے بھی ہلہ بول دینا (strike sorties) کہا جائے گا یا جنگی اقدام قرار دیا جائے گا؟ لیبیا پر ناٹو کے ذریعے حملہ جس عنوان سے بھی کیا گیا، اسے بین الاقوامی قوانین کی صریح خلاف ورزی اور ننگی جارحیت کے علاوہ کچھ اور نہیں کہا جا سکتا۔''

بحرین کی صورتِ حال ان دونوں سے کسی قدر مختلف ہے۔ یہاں مسلکی اختلاف رکھنے والی منظّم اقلیت، جس کی مقامی جڑیں خاصی مضبوط ہیں، ایک عرصے سے برسرِ اقتدار خاندان کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے اور پارلیمنٹ میں واضح تعداد میں ان کی موجودگی بھی ان کی عوامی حمایت کی توثیق کرتی ہے۔ حزبِ اختلاف کی جماعت وفاق پارٹی 40 ارکان کی پارلیمنٹ میں 18 نشستوں پر براجمان ہے اور کم آمدنی والے ممبران اس کی اصل قوت ہیں۔

یمن پر 33 برس سے اور لیبیا پر 40 برس تک حکومت کرنے والے آمروں کی حکمت عملی تقریباً وہی تھی جو حسنی مبارک نے 30 سال اختیار کیے رکھی، یعنی اگر ہمیں حکومت سے ہٹایا گیا تو 'اسلامیان' جنہیں مختلف عنوانات سے یاد کیا جاتا ہے، ملک پر قابض ہو جائیں گے۔ اسلامی شدت پسندی، بنیادی پرستی، اسلامی جہاد اور اس سے ملتے ہوئے دیگر الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے یورپ اور امریکا کو اسلامی ریاست کے خطرات دکھا کر اپنے اقتدار کو مزید طول دینے کی کوشش کی جاتی رہی۔ یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ اسلام کا 'خطرہ' مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ کے حوالے سے ایک سیاسی حقیقت ہے اور اس خطرے کی گھنٹی کے بجنے میں گزشتہ عشرے میں اضافہ ہی ہوا ہے۔

اس پس منظر میں مسلم قیادت کے لیے چند امور خاص طور پر قابلِ غور ہیں:

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ مسلم دنیا کے عوام گیلپ کے عالمی جائزے کے مطابق جو 2011ء میں بڑے پیمانے پر کیا گیا، امریکی حکومت کی پالیسیوں خصوصاً فلسطین کے مسئلے پر اسرائیل کی مسلسل حمایت اور مسلم دنیا میں جابر حکمرانوں کی حمایت کرنے کے سبب امریکا کو سخت ناپسند کرتے ہیں، لیکن امریکا کی عسکری طاقت اور دنیا کے مختلف ممالک خصوصاً عراق، افغانستان، شمالی پاکستان پر امریکی فوجی حملوں میں امریکا کا ڈر بھی ایک زمینی حقیقت ہے۔ اس صورتحال میں مسلم قیادت کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ کیا امریکا پر محض لعن طعن اور عوامی خطابات میں اس کی واپسی کا مطالبہ کرنا مسائل کے حل کی طرف لے جا سکتا ہے یا اس بات کی ضرورت ہے کہ امریکی دراندازی کو ان عملی ملکی مسائل کے پس منظر میں پیش کیا جائے جن سے عوام دوچار ہیں اور یہ کہ ملک میں غربت کے اضافے میں

کس طرح امریکا کا دخل ہے۔ ملک میں دہشت گردی، عدم تحفظ اور جان و مال اور عزت پر حملے پر امریکی موجودگی سے کیا تعلق ہے؟ روزمرہ کی اجناس کی قیمتوں میں اضافے، رشوت، سفارش، بے انصافی اور اس خطے میں امریکی پالیسی میں کیا اندرونی تعلق پایا جاتا ہے۔ عوامی مسائل پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے امریکا کو مسائل کا اصل سبب قرار دینا عوام اور خواص میں مسلم قیادت کے مقام و کردار کی بہتر ترجمانی کر سکتا ہے۔

مسلم قیادت کو اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ وہ خود کس حد تک میڈیا، ذرائع ابلاغِ عامہ کے پیدا کردہ فکری خلفشار کی شکار ہے۔ اس وقت ہر مسلم ملک کے بیشتر ٹی وی پروگرام اور تجزیے خواہ وہ کسی بھی جماعت یا مال دار ادارے سے تعلق رکھتے ہوں، اجتماعی طور پر ناظرین کو ملک کے مستقبل سے مایوس کرنے اور حالات کے بگڑنے کی ایسی تصویر پیش کرنے میں جس کی تان ملک کے ٹوٹنے پر جا کر رُکے، اور اسلام کے حوالے سے یہ تاثر دینے میں لگے ہیں کہ یا تو وہ ماضی کا قصہ ہے یا اگر اسلام نافذ ہوا تو فرقہ واریت، بنیاد پرستی، انتہا پسندی، تشدد، مار دھاڑ، تکفیر اور خصوصاً خواتین کے حقوق کی پامالی ایک یقینی امر ہے۔ گویا اسلام کو بھیانک بنا کر پیش کرنے میں جو جتنی فن کاری کا استعمال کرتا ہے، اتنا ہی لبرل، ترقی پسند اور رواداری کا علَم بردار سمجھا جاتا ہے۔ سوات میں ملالہ یوسف زئی کا واقعہ اس کی زندہ مثال ہے، وہ وہ بیگمات جلسے جلوس میں تصاویر کے لئے پوز بناتی نظر آئیں جن کے خلاف اپنی نوکرانیوں کی ہڈیاں توڑنے کے جُرم میں مقدمات عدالتوں میں زیرِ سماعت ہیں۔

مسلم قیادت کے لیے قابلِ غور بات ہے کہ کیا وہ اس منفی اور تخریبی اندازِ فکر کی جگہ ملک کے روشن مستقبل، یک جہتی اور محفوظ ہونے کے مثبت تصورات کو عوام تک پہنچا رہی ہے، یا وہ بھی بیرونی قوتوں کی اس ابلاغی سازش سے جسے ملکی ذرائع ابلاغ کے ذریعے کیا جا رہا ہے، غیر شعوری طور پر متاثر ہو جاتی ہے۔ اسلام اُمید، اللہ تعالیٰ سے بہترین توقع اور زندگی کے روشن پہلوؤں پر مبنی مستقبل کی تعمیر کی دعوت دیتا ہے۔ مایوسی اور نا اُمیدی کو رد کرتا اور اسے ایمان کے منافی قرار دیتا ہے۔ مسلم قیادت کو اس طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ اس کے طرزِ عمل سے مایوسی کا اظہار نہ ہو بلکہ وہ امتِ مسلمہ میں اُمید، اعتماد اور منزل کا یقین پیدا کرنے کے لیے عملی اقدامات کرے۔

> اندازوں کے مطابق 2050ء تک توانائی کے جس بحران کی پیش گوئی کی جا رہی ہے، نہ صرف ناٹو کے ذریعے جارجیت بلکہ دیگر مسلم ممالک میں مداخلت کا اس سے انتہائی منطقی تعلق ہے۔ لیبیا اور یمن میں خلافِ قانون کارروائی کے لیے ان ممالک کو استعمال کیا گیا جو وہاں کے جغرافیائی، فضائی اور انسانی مسائل کے حوالے سے بطور سابقہ سامراجی حکمران ذاتی تجربہ رکھتے ہیں اور جو وہاں کی گلیوں اور شہریوں سے مانوس ہیں۔ دوسری جانب قذافی اور یمن کے صدر کے خاندان کے افراد نے اپنی ناجائز جمع کردہ دولت اور تعلقات و وسائل کا پوری قوت سے استعمال کیا تاکہ انقلاب کی بڑھتی ہوئی لہروں کی شدت کو کم کیا جا سکے، لیکن نتیجہ برعکس نکلا!

مسلم قیادت کے لیے تیسرا قابلِ توجہ نکتہ معاشی خود انحصاری کا حصول ہے۔ عالمی معاشی مراکز سرمایہ دارانہ نظام کے نمائندہ شمالی ممالک کے ذریعے جنوب کے معاشی نظام کو اپنے قابو میں رکھے ہوئے ہیں۔ مسلم دنیا اپنے وسائل کے لحاظ سے مال دار لیکن اپنی معاشی حکمتِ عملی اور معاشی طرزِ فکر کے لحاظ سے انتہائی کنگال واقع ہوئی ہے۔ مغربی سرمایہ دارانہ فکر نے اس کی قیادت کو صرف ایک ہی معاشی حل سمجھایا ہے اور وہ ہے بیرونی امداد کے سہارے ترقی کے نام پر لئے گئے قرضوں کی جزوی ادائیگی اور نتیجتاً اپنی معاشی بدحالی میں اضافہ۔ مسلم ممالک اگر انتہائی سادہ اور غیر ترقی یافتہ حکمتِ عملی، یعنی مال کے بدلے مال، ہی کو آپس میں متعارف کرا دیں تو چند برسوں میں ڈالر کی غلامی سے نجات مل سکتی ہے۔ مسلم دنیا

کے قدرتی وسائل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک انعام اور آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان وسائل کو اگر امانت اور دیانت کے اصولوں کے تحت استعمال میں لایا جائے تو مغرب پر انحصار کا خاتمہ آج ہوسکتا ہے۔ مسلم دنیا کا معاشی استحکام اور خود انحصاری نہ صرف معیشت بلکہ اس کی سیاست، معاشرت، تعلیم اور ثقافت، غرض ہر شعبۂ حیات پر اثر انداز ہوگی اور چاہے وہ سیاست ہو یا تعلیم و معاشرت، اس پر مغربی سرمایہ دارانہ نظام کے اثرات آہستہ آہستہ زائل ہوسکیں گے۔جغرافیائی طور پر بھی اللہ تعالیٰ نے مسلم دنیا کو ایک ایسی سبز پٹی کی شکل دے رکھی ہے کہ ریل، شاہراہوں، سمندری راستوں پر ہر طریقے سے اشیائے تجارت کی نقل و حمل میں کوئی دقت پیدا نہیں ہوسکتی۔صرف مسلم قیادت کو اس طرف یکسوئی کی ساتھ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔یہ مخفی سرمایہ نہ صرف مسلم دنیا کو معاشی خود انحصاری فراہم کرسکتا ہے، بلکہ تھوڑے عرصے میں ایک متحدہ بلاک کی طرف لے جاسکتا ہے۔

یاد رہے معاشی تعلقات کی بنیاد محض معاشی مفاد کبھی نہیں ہونی چاہیے بلکہ حلال تجارت و معیشت کی ترقی اور حرام سرمایہ دارانہ استحصالی معیشت سے نجات کی بنیاد پر مسلم دنیا کا اتحاد یورپی معاشی اتحاد سے زیادہ حقیقی پائیدار اور باہمی منفعت کا حامل ہوسکتا ہے کیونکہ اس کی بنیاد اخوت، خوفِ خدا اور بھلائی میں تعاون اور برائی کے خلاف اتحاد پر ہوگی۔آج جب امریکہ کے معاشی، سیاسی اور اخلاقی زوال کی پیش گوئی خود امریکی ماہرینِ علومِ عمرانیات و معاشیات کررہے ہیں، مسلم قیادت کی لیے معاشی خود انحصاری کا حصول ایک اہم ضرورت کی شکل اختیار کرگیا ہے۔اس ضمن میں عملی اقدامات میں تاخیر مزید مسائل و مشکلات پیدا کرسکتی ہے۔

مسلم قیادت کے لیے چوتھا قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ بڑھتی ہوئی لسانی اور نسلی عصبیّت جو تمام برسرِ اقتدار طبقے کا حربہ ہوتی ہے اور جس کے ذریعے وہ بندر بانٹ کرکے خود کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، اُس عصبیت کی آگ کو بجھانے اور مفاہمت پیدا کرنے میں کیا کردار ادا کرسکتی ہے۔مسلم قیادت ہی وہ واحد عنصر ہے جو بڑھتی عصبیت اور لسانی منافرت کے مظاہرے کے خاتمے اور مختلف المسالک و مذاہب گروہوں کے درمیان غلط فہمیوں اور نفرتوں کو دُور کرنے میں اپنا مثبت کردار ادا کرسکتی ہے۔کیا اس دائرے کو توڑنے کی شعوری کوشش نہیں کرنی چاہیے جس میں مفاد پرست طبقے عصبیتوں کو ہوا دے کر، امنِ عامہ کو خراب کرکے اور بعض اوقات محلاتی سازشوں کی ذریعے اپنا مطلب پورا کرتے رہے ہیں۔یہ عمل ایک تسلسل سے پوری دنیا کے سامنے ہورہا ہے۔اس حوالے سے اسلام کے لائحہ عمل کو اپنایا جائے تو اندرونی اور بیرونی دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بناتے ہوئے ایک صحت مند تبدیلی کے لیے راہ ہموار کی جاسکتی ہے۔

مسلم قیادت کو لیبیا، یمن، اور عراق کے واقعات دعوت دیتے ہیں کہ وہ لگے بندھے انداز سے ہٹ کر غور کرے اور عوامی مسائل و مشکلات پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے حالاتِ حاضرہ کے لحاظ سے ایسی حکمتِ عملی وضع کرے جو اُمت کو مکڑی کے جالے سے آزاد ہونے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے میں کامیابی سے ہم کنار کرسکے۔

مغربی ابلاغ میں 'عرب بہار' (Arab Spring) کا ذکر 2011ء کے آغاز سے اُبھرنے والی انقلابی تحریک کے حوالے سے مسلسل کیا جارہا تھا۔تیونس کے چنبیلی یا سفید انقلاب اور اس کے متوازی مصری انقلاب نے اردگرد کے مسلم ممالک میں ایک نئی فضا پیدا کردی جس میں یمن، بحرین، لیبیا اور شام دنیا کی توجہ کا مرکز بن گئے۔

ان حالات میں مسلم قیادت کے لیے غور کرنے کا اہم پہلو یہ ہے کہ انتشار کی اس فضا میں کیا وہ اپنا وزن کسی ایک فریق کی طرف ڈال کر کوئی فوری ہدف حاصل کریں یا اس دورِ فتنہ میں اپنا الگ تشخص برقرار رکھتے ہوئی قیادت اور معاشرے کی اصلاح کے طویل المیعاد ہدف کے لیے کام کریں۔

وال سٹریٹ کہانی

عبداللہ

دو اکتوبر 2012ء کو لاس اینجلس میں نوجوانوں، بزرگوں اور خواتین کو پیروں تلے پرچم روندتے اور ''وال سٹریٹ پر قبضہ کرو'' کے نعرے لگاتے دیکھ، سُن کر ان مخصوص مغربی دانشوروں کے ہوش و حواس اُڑ گئے جو پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر ''وال سٹریٹ پر قبضہ کرو'' تحریک کا ذکر کرتے ہوئے کہتے تھے کہ رات گئی بات گئی۔ ٹھیک ایک سال بعد یہ چنگاری پھر بھڑک اٹھی

علی الصباح گھر سے روزی روٹی کی فکر میں نکلنے والوں کو کیا معلوم کہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام کس طرح اس کی خون پسینے کی کمائی میں سے اپنا حصہ اچک لے جاتا ہے۔ دو وقت کی روٹی کے لیے کولھو کے بیل کی طرح جُتے افراد شاید نہیں جانتے کہ وہ درحقیقت ایک تاریک پگڈنڈی کے مسافر ہیں، جن کی بھول بھلیوں میں چلتے چلتے بال سفید ہو جائیں گے، مگر منزل نہیں ملے گی۔ امت کے وسائل کو امت پر مسلّط خائن حکمرانوں کے تعاون سے مسلسل اس طرح لُوٹا جا رہا ہے کہ تیل، گیس اور دیگر قدرتی وسائل کی قیمتیں تک، جو اس دور میں قوت کی چابی سمجھی جاتی ہیں، اہلِ مغرب کی مرضی اور ان ہی کے طے کردہ معیار، ڈالر کے ذریعے متعین ہوتی ہیں، جب کہ مسلمانوں کو اپنے پاور پلانٹ اور ریلوے انجن تک چلانے کے لیے بھی ایندھن میسر نہیں۔ اس پر مستزاد، کاغذی کرنسی کا شیطانی کھیل بڑے غیر محسوس انداز میں لوگوں کی کمائی ان کی جیبوں سے اُچک لیتا ہے۔ نوٹ تو اتنے ہی رہتے ہیں، لیکن ڈالر کے مقابلے میں روپے کی قدر گرنے کی وجہ سے، جب کوئی شخص اپنی موٹر سائیکل میں پیٹرول بھروانے جاتا ہے، تو اسے ماضی کی تیس روپے فی لیٹر قیمت کے بجائے ایک سو روپے فی لیٹر ادا کرنے پڑتے ہیں۔ سونے کی قیمت کا معلوم کرتے ہیں، تو وہ بھی کچھ عرصہ قبل کے چالیس ہزار فی تولہ کے بجائے، اب ساٹھ ہزار سے اوپر جا پہنچا ہے۔ ایک عام آدمی کے پاس تو اس پورے عمل کو سمجھنے کے لیے صرف ''مہنگائی'' کا لفظ ہے، لیکن اصل میں یہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام ہے، جو ہر ممکن طریقے سے انسان کے حلق کے اندر تک پہنچ کر، نوالے چھین رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسی سرمایہ دارانہ نظام کے قلب وال سٹریٹ سے ''انقلاب'' کی صدائیں آنے لگیں۔ ''وال سٹریٹ پر قبضہ کرو'' تحریک جنگل کی آگ کی طرح پھیلی۔

دنیا پہ حکمرانی کرنے والی اکلوتی سپر پاور گزشتہ چند برس میں معاشی طور پر انتہائی کم زور ہوئی ہے۔ حکومت کی پالیسوں اور جنگوں پر بہت زیادہ خرچ کرنے سے، امریکی قرضے 143 کھرب ڈالر تک پہنچنے سے، غربت کی شرح تاریخی سطح پر پہنچ گئی ہے، تقریباً 50 فیصد امریکی ایسے ہیں، جن کی رواں برس صحت کی انشورنس نہیں کی گئی۔ جب کہ کاروباری اداروں کے دیوالیہ ہونے سے لاکھوں افراد بے روزگار اور بے گھر ہوئے ہیں۔ تشویش ناک امر یہ ہے کہ 5 کروڑ غریب امریکیوں میں سے 22 فی صد 18 برس سے کم عمر کے نوجوان ہیں، جب کہ غربت سے عورتیں اور بچّے بھی سخت متاثر ہوئے۔ ''واشنگٹن ٹائمز'' اپنے اداریے میں لکھتا ہے: ''ملک وسیع پیمانے پر مشکلات کا شکار ہے اور اس وقت کھانا سرکار کی طرف سے فراہم کردہ فوڈ اسٹیمپس کی بدولت ممکن ہے۔ محکمۂ زراعت کے بقول یہ تعداد ایک ریکارڈ ہے۔ ملک اس وقت 1930ء کی سرد بازاری سے بھی بُرے حالات سے گزر رہا ہے۔ اگرچہ سرکاری طور پر بے روزگاروں کی مجموعی تعداد

ایک کروڑ چالیس لاکھ بتائی گئی ہے، تاہم اس میں وہ لوگ شامل نہیں، جنھوں نے روزگار کی تلاش ہی چھوڑ دی ہے اور اب وہ اس فہرست میں شامل نہیں۔ امریکی ماہرینِ معیشت کھل کر یہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ نے ملکی معیشت کی چولیں ہلادی ہیں۔ امریکا 2001ء سے اب تک اس جنگ میں 19 کھرب سے زائد رقم خرچ کرچکا ہے، جس میں سے 8 کھرب 94 ارب 98 کروڑ 15 لاکھ ڈالر عراق اور 11 کھرب 53 ارب 79 کروڑ 40 لاکھ ڈالر افغانستان میں خرچ کیے جا چکے ہیں۔ ان جنگی اخراجات میں ہر سیکنڈ 7 ہزار ڈالر کا اضافہ ہورہا ہے۔ دوسری جانب، آج بھی امریکی شہری خود کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں، بیرونی اور اندرونی قرضہ بڑھ جانے سے دیوالیہ ہونے کا خدشات اُمڈ آئے ہیں، جب کہ کئی ملٹی نیشنل ادارے دیوالیہ ہو چکے ہیں۔ بے روزگاری، مہنگائی اور غربت بڑھنے سے گزشتہ کئی روز سے احتجاجوں کا سلسلہ جاری ہے۔" (22 ستمبر 2012ء)

"وال سٹریٹ پر قبضہ کرو" (Occupy Wallstreet) تحریک 17 ستمبر کو کینیڈا کے ایک جریدے کی اپیل پر امریکی وال سٹریٹ سے ملحق، زوکوٹی پارک سے چند سو نوجوانوں نے شروع کی تھی، مہم نیویارک سمیت امریکا کے آٹھ سو چھوٹے بڑے شہروں اور مغربی ممالک میں پھیل گئی۔ ایشیا سے افریقہ اور افریقہ سے یورپ اور امریکا تک سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ "وال سٹریٹ پر قبضہ کرو تحریک" سے اظہارِ یک جہتی کے لیے پانچ براعظموں کے 82 ممالک کے 951 شہروں میں سرمایہ دارانہ نظام کے مراکز کے باہر دھرنا دیا گیا، کچھ مقامات پر مہینوں دھرنا جاری رہا۔ یہ مظاہرین نہ صرف یہ کہ حکومت کی مالیاتی پالیسیوں کے خلاف احتجاج کر رہے تھے، بلکہ ایک متبادل معاشی نظام کے لئے بھی آواز اٹھا رہے تھے۔ "آکوپائی وال سٹریٹ" تحریک کا نہ تو کوئی تنظیمی ڈھانچہ تھا، نہ اس پر کسی پارٹی کا ٹھپہ اور نہ اس کا ایجنڈا یا مطالبات کی فہرست۔ یہ تحریک امریکا میں، بقول ان لوگوں کے "کارپوریٹ" لالچ اور امیر، غریب کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج کے خلاف تھی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں جاری تحریکوں پر چیختا چنگھاڑتا امریکی میڈیا اس تحریک کی ابتدا میں خاموش رہا، یہاں تک کہ "وال سٹریٹ جرنل" جو کہ زیادہ تر وال سٹریٹ اور دنیا کے معاشی و سیاسی امور پر خبریں دیتا ہے، اس میں بھی یہ امریکی نوجوان دو کالمی خبر نہیں بن سکے، لیکن رفتہ رفتہ وال سٹریٹ تحریک نے امریکا سمیت دنیا بھر کی نام ور اور نیک نام شخصیات کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس تحریک نے "سٹیزن جرنلزم" پر انحصار کیا، اپنے کیمروں اور موبائل فون پر تصاویر اور خبریں "فیس بک"، یا آکوپائی وال سٹریٹ کی ویب سائٹ پر پوسٹ کرتے رہے۔ چند نوجوان تو وال سٹریٹ ہی پر لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ گئے اور وہیں سے تحریک منظّم کرنے لگے۔

مشرقِ وسطیٰ کی طرح مغرب میں بھی اس تحریک کو سوشل نیٹ ورکنگ کی ویب سائٹس کی مدد سے پذیرائی ملی اور انہی کی وجہ سے یہ تحریک منظّم ہوئی۔ اظہارِ رائے کی آزادی کے پرچارک ابتدا میں چُپ سادھے رہے۔ تاہم ایک اور برطانوی خبر رساں ادارے کے ایک سروے کے مطابق یہ تحریک سماجی رابطے کی ویب سائٹس، ٹوئٹر اور فیس بک کے ذریعے تقریروں اور پمفلٹس کو مات دے گئی۔ اسی حوالے سے انٹرنیٹ پر سیکڑوں صفحات منظرِ عام پر آ گئے، جن کی وجہ سے تحریک کو تقویت ملی۔ "وال سٹریٹ پر قبضہ کرو" مہم کے حوالے سے انٹرنیٹ پر سب سے پہلے 13 جولائی کو ایک پوسٹ دکھائی دی، جو ایڈبسٹرز گروپ کی جانب سے تھی لیکن اسے توجہ حاصل نہ ہوئی۔ بعد ازاں 20 جولائی کو اسٹاریکا کے فلم پروڈیوسر، فرانسسکو گوئریرو نے ٹوئٹر پر اس کا پھر ذکر کیا۔ اس پوسٹ میں "ویک اَپ فرام یور سلمبر" نامی ویب سائٹ کا حوالہ بھی تھا، جس میں "ایڈبسٹرز" کی آواز کو آگے بڑھایا گیا۔ یہ ویب سائٹ 2006ء میں قائم کی گئی، جس کے منتظمین کا کہنا ہے کہ وہ دھوکا و ہی پر مبنی سرمایہ دارانہ مالیاتی

نظام کی حقیقت کھولنا چاہتے ہیں۔ 23 جولائی تک خاموشی رہی۔ پھر دو پوسٹس منظر عام پر آئے، جن پر دو ہفتے تک کوئی خاص ردعمل دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس کے بعد لیزی بکوارم نے پانچ اگست کو اس حوالے سے ٹوئٹر پر آواز اٹھائی۔ یعنی انٹرنیٹ پر یہ آواز بدستور موجود تھی، لیکن زور نہیں پکڑ رہی تھی۔ تاہم، اس میں تیزی لانے میں اہم کردار ٹوئٹر کے اکاؤنٹ ''نیویارکسٹ'' نے ادا کیا، جس پر گیارہ ہزار سے زیادہ ٹوئٹس کی گئیں۔ ٹوئٹر پوسٹس کے رجحانات کا جائزہ لینے والے ایک ادارے کے مطابق اس تحریک میں انٹرنیٹ پر 16 ستمبر کو قابلِ ذکر تیزی دیکھی گئی۔ دراصل یہی اس کا آغاز تھا، جس کے پہلے دو ہفتے سست رہے۔ نیویارک میں احتجاج شروع ہوا، لیکن ذرائع ابلاغ نے چنگاری کو ہوا دی اور ''قبضہ کرو'' کے عنوان سے ایسی کئی تحریکیں اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اب تک فیس بک پر اس حوالے سے ایک سو پچیس سے زائد صفحات بن چکے ہیں۔ جب کہ ٹوئٹر کی ہر پانچ سو میں سے تقریباً ایک پوسٹ اس تحریک سے متعلق ہے۔ اس مقصد کے لیے ویڈیو شیئرنگ کی ویب سائٹس کا استعمال بھی جاری ہے۔

امریکا میں بائیں بازو نظریات کے حامی، پروفیسر نوم چومسکی، جنھوں نے امریکا کی موجودہ اقتصادی صورتِ حال کو ''بے روزگاری کا بڑا بحران'' قرار دیا ہے، نے وال سٹریٹ تحریک کو امریکی تاریخ کا ایک انتہائی غیر معمولی اور امید افزا واقعہ قرار دیا ہے۔ BBC کے ایک رپورٹر نے زوکوٹی پارک میں براجمان نوجوانوں سے ان کے نظریات کی تصدیق چاہی تو انہوں نے واضح کر دیا کہ ان کا تعلق سوشلزم یا بائیں بازو کے نظریات سے نہیں ہے، وہ تو صرف اپنے حق اور اس غیر منصفانہ نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ مظاہرین سے اظہار یک جہتی کے لیے کئی نام ور شخصیات سامنے آئیں، جن میں فلم ساز مائیکل مور، نوبل انعام یافتہ امریکی ماہر جوزف اسٹگلٹز، اداکارہ سوسن ساراڈون، امریکی پاپ سنگر کینی ویسٹ،

> ''وال سٹریٹ پر قبضہ کرو'' تحریک دراصل اُس سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف نفرت ہے جس میں امریکہ اپنی بقاء تلاش کرتا رہا ہے اور جس کی بنیاد پر اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے پوری دنیا میں آگ اور خون کا خوفناک کھیل جاری ہے۔ امریکہ کے عوام محسوس کر چکے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام اپنے منطقی انجام کو پہنچ رہا ہے۔ ''وال سٹریٹ پر قبضہ کرو'' تحریک نے پولیس اور زندگی کی بے یقینیوں کو سڑکوں پر آمنے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ مصر کے ''تحریر سکوائر'' کے عظیم اجتماع سے متاثر ہونے والے ''وال سٹریٹ پر قبضہ کرو'' تحریک کے کارکنوں نے اس تحریک کو پانچ براعظموں کے ستانوے ممالک کے تین سو دس شہروں میں پھیلا دیا۔ امریکہ کے ٹاؤن، ڈاؤن ٹاؤن قصبے اور دیہات اس تحریک کے زیرِ اثر آ گئے۔
>
> ـــــ بے نیازیاں: ڈاکٹر محمد اجمل نیازی

ہپ ہاپ بزنس دنیا کے کروڑ پتی رسل سائمنس شامل ہیں۔ حتیٰ کہ امریکی صدر بارک اوباما نے بھی ان نوجوانوں کو ''حق'' پر قرار دیا۔

وال سٹریٹ کی منظر کشی کرتے ہوئے BBC کا رپورٹر کہتا ہے: ''ایسا لگتا ہے کہ مظاہرین نے وال سٹریٹ پر ایک احتجاجی شہر آباد کیا ہوا ہے۔ آس پاس موجود کھانے پینے کی دکانوں پر کئی افراد خاموشی سے اپنے کریڈٹ کارڈ نمبر تک دے کر چلے گئے کہ احتجاج میں شامل نوجوانوں کو کھانا فراہم کیا جاتا رہے۔ نیویارک کے مالیاتی حب، وال سٹریٹ پر دھرنے کی اس تحریک کی دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے پہلے ہی دن نیویارک کے میئر، بلوم برگ نے بیان دیا کہ ''ہمارے نوجوان کالجوں سے گریجویٹ بن کر نکل رہے ہیں، مگر ان کے لیے روزگار نہیں ہم اس ''بہار'' میں مصر، تیونس اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں جو سماجی غصّہ دیکھ رہے تھے، وہ اب ہماری گلیوں میں امڈ آیا ہے۔''

سوال یہ ہے کہ کیا امریکا میں طبقاتی جنگ کا بگل بج چکا ہے۔

اس کا جواب شاید اتنا آسان نہ ہو، لیکن یہ لوگ موجودہ اقتصادی نظام کی جگہ ایک نئے سماجی آرڈر کی بات ضرور کر رہے ہیں۔ ان مظاہرین کی سب سے متاثر کُن بات ان کا مکمل پُرامن ہونا تھا۔ اس احتجاج کو مصر اور تیونس سمیت عرب دنیا کے مختلف ممالک میں شروع ہونے والی احتجاجی لہر کی طرز پر ''امریکا کا سپرنگ'' کہا جا رہا ہے۔ ''کارپوریٹ لالچ''، بینکوں کی مبینہ

لوٹ کھسوٹ' بے گھری اور بے روزگاری جیسے مسائل کے خلاف بے روزگار اور بے گھر امریکی 'وال سٹریٹ پر 17 ستمبر سے ہنوز دھرنا دیے ہوئے ہیں۔''

اس احتجاج کی سب سے دل چسپ بات یہ ہے کہ ہر فرد منفرد مطالبے کا پلے کارڈ اور بینر اٹھائے ہوئے ہے۔ کوئی معاشرتی تفریق کے خلاف سراپا احتجاج ہے' تو کسی کو اپنے بچّوں کے مستقبل کی فکر' کوئی قومی خزانے کے غلط استعمال پر معترض ہے' تو کوئی ہیلتھ انشورنش کا رونا رو رہا ہے۔ الغرض جتنے منہ اتنے مطالبے' مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اکثر مظاہرین سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے میں اسلام کا نظامِ معیشت آزمانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ جی ہاں' اہل مغرب اسلامی نظام کی بات کر رہے تھے۔ اسی طرح اکثر مظاہرین' امریکی عوام کے ٹیکسوں سے لڑی جانے والی جنگ کے خاتمے کا مطالبہ کرتے دکھائی دیئے۔

اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے' یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا' لیکن پلے کارڈز پر لکھی تحریریں مغرب کی سوچ میں آنے والی تبدیلی کی واضح عکاس ہیں۔

باہر سے آنے والے لوگ امریکی سوسائٹی میں ایک مسرور کُن ٹھہراؤ اور اطمینان سا محسوس کرتے تھے' لیکن اب بے چینی ایک معروضی حقیقت کے طور پر سامنے نظر آتی ہے۔ ''وال سٹریٹ قبضہ تحریک'' اس بے چینی کا ایک معمولی سا اظہار ہے۔ یہ بے چینی بڑھ کر ایسی افراتفری اور انتشار کا سبب بن سکتی ہے جسے کنٹرول کرنا آسان نہیں۔ امریکہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ اُس کی افواج افغانستان میں شکست خوردگی اور تھکن کے احساس میں مبتلا ہیں۔ امریکی عوام کی بے چینی میں اضافے سے امریکہ کے دنیا بھر میں سارے آپریشن متاثر ہونے والے ہیں۔ امریکی معیشت کا حال یہ ہے گزشتہ تین سال کے دوران ساڑھے تین ٹریلین ڈالرز کے نوٹ چھاپے گئے۔ امریکی حکومت کے ساتھ ساتھ امریکہ کا ایک ایک فرد مقروض ہے۔ امریکی معاشرے میں بیروزگاری کی شرح 10 فیصد تک پہنچ گئی ہے۔ گریجویٹ نوجوان مزدوروں والے کام کرنے پر مجبور ہیں۔ صحت مند غذا کا حصول عام لوگوں کے لئے مشکل ہو گیا ہے۔ جن گھروں میں لوگ رہتے ہیں' وہ گروی ہیں اور اُن کی ماہانہ اقساط لوگ ادا نہیں کر سکتے۔ کچھ عرصہ قبل بینک دیوالیہ ہو گئے تھے جنہیں بچانے کے لئے امریکی حکومت کو آگے آنا پڑا اور اربوں ڈالر بینکوں کو دینا پڑے کیونکہ بینک نہیں ہوں گے تو قرضے جاری نہیں ہوں گے' قرضے جاری نہیں ہوں گے تو کاروبار نہیں ہوگا اور کاروبار نہیں ہوگا تو لوگوں کو ملازمتیں نہیں ملیں گی۔ بینک جو قرضے جاری کرتے ہیں' وہ اُنہیں واپس نہیں ملتے' تو پہلے والی صورتِ حال پیدا ہو سکتی ہے اور بینک دوبارہ دیوالیہ ہو سکتے ہیں۔ کب تک امریکی حکومت بچاؤ کے لئے آگے آتی رہے گی' وہ تو خود قرضوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے۔

لاکھوں افراد نے سرمایہ دارانہ لُوٹ مار اور لالچ کے خلاف مظاہروں میں شرکت کی۔ چین کے سرکاری خبر رساں ادارے نے تبصرہ کیا ہے کہ اگر اس طرح کے مظاہرے دنیا کے دیگر ملکوں میں ہوں تو مہذب دنیا کی طرف سے بیانات آنا شروع ہو جاتے ہیں کہ ان ملکوں کے حکمران اقتدار چھوڑ دیں اور فوراً اُن پر بمباری ہونے لگتی ہے۔ اب ان کو یہ باتیں کرنے سے پہلے اپنے گھر کو سنبھالنا چاہیے۔ امریکہ میں جو حالات بننے والے ہیں' وہ سوویت یونین سے مختلف نہیں' اور ہو سکتا ہے کہ تاریخ میں افغانستان وہ سرزمین ثابت ہو' جس نے دو عالمی طاقتوں کا شیرازہ بکھیر دیا۔ ''وال سٹریٹ قبضہ تحریک'' ایسی اجتماعی دانش کا مظہر ہے جو سرمایہ داری' یرغمال جمہوریت اور سامراجی عزائم کے لئے جنگی جنون کو مسترد کرتی ہے۔ واشنگٹن میں ایک بہت بڑا بینر آویزاں ہے جس میں ڈاکٹر مارٹن لُوتھر کنگ کی تصویر ہے اور یہ عبارت تحریر ہے ''دوزخ میں سب سے گرم جگہ اُن لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو عظیم اخلاقی کشمکش کے دوران غیر جانبدار رہتے ہیں۔ ہر جگہ قبضہ کرو۔'' دنیا بھر میں اس تحریک کی حمایت میں لاکھوں افراد کے مظاہروں نے سوپر پاور کو بہت بڑے داخلی تصادات اور بحرانوں کا شکار بنا دیا ہے۔

بدلتی دُنیا

خالد رحمان

آج کی دُنیا میں بڑی بڑی تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ ٹیکنالوجی کی ترقی، اقتصادی ترقی، معلومات تک آسان و سستی اور تیز رسائی، طب اور صحت کے علوم میں کرامات، نئے اور موثر ذرائع پیداوار و آمد و رفت اور مواصلات کے دائرے میں آنے والی حیرات کُن تبدیلیوں نے کل کے خوابوں کو آج کی حقیقت بنا دیا ہے۔ دُنیا بھر کے عوام، معاشرے اور معیشتیں باہم ضم ہو رہے ہیں، فاصلے سکڑ رہے ہیں اور تیز ترین ذرائع مواصلات کی بدولت، سرمایے، معلومات اور علوم کا تبادلہ آسان تر ہو چکا ہے۔ اب جغرافیائی سرحدیں رکاوٹ نہیں رہیں اور خلائیں بھی مسخر ہو چکی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ معیشت آج کی انسانی زندگی میں نمایاں ترین اور مرکزی مقام حاصل کر چکی ہے۔ اس کا اثر تمام شعبہ ہائے زندگی پر اس طرح حاوی ہو چکا ہے کہ تبدیلی کے ہر عمل کے پیچھے اصل قوتِ محرکہ معیشت ہی نظر آتی ہے۔ معاشی محرک کے اس غلبے کے نتیجے میں غیر معمولی ترقی ہوئی لیکن اس کے نتیجے میں انسانی زندگی کی بنیادی اقدار بھی تبدیل ہوئی ہیں۔ یہ صورتِ حال دورِ حاضر میں زندگی کے تمام گوشوں میں پریشان کُن منفی نتائج بھی گھسیٹ لائی ہے۔ سرمایے نے کلیدی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ زندگی کے کسی بھی میدان میں آگے بڑھنے کے لیے اہم ترین کردار سرمایے کا ہے۔

کثیر سرمایے کے حاملین کے لیے مواقع بھی زیادہ پیدا ہوتے ہیں، اس لیے اس سارے عمل میں سرمایہ کار ہی سب سے زیادہ فوائد سمیٹتا ہے۔ اقتصادی لحاظ سے طاقت ور ممالک میں دراصل معاشی طور پر مضبوط افراد اور گروہ ہی اپنے ملک میں اور عالمی سطح پر فیصلہ سازی پر اثر انداز ہونے کے حوالے سے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ فیصلے سیاست کے حوالے سے ہوں، تنازعات اور جنگوں کے سلسلے میں یا تعلیم اور صحتِ عامہ جیسے سماجی شعبے میں ترقی کی بابت یہاں تک کہ اقوامِ متحدہ، عالمی بنک اور عالمی مالیاتی ادارہ (آئی ایم ایف) جیسے بین الاقوامی اداروں میں فیصلہ سازی اور اثر پذیری میں مخصوص ممالک اور طاقتوں کے کردار کا انحصار بھی ان کی طرف سے کیے جانے والے مالی تعاون پر ہوتا ہے۔ معاشروں اور قوموں کے اندر بھی افراد اور جماعتوں کے لیے یہ ممکن نہیں کہ کثیر سرمایے کے بغیر قیادت کے حصول یا اسے برقرار رکھنے کا سوچ بھی سکیں۔ نتیجہ یہ کہ امن، ترقی، جمہوریت، انسانی حقوق، غربت کے خاتمے اور سب کے لیے صحت و تعلیم کی ظاہری کوششوں کے باوجود بدلتی دنیا کے حقائق کچھ اور ہی داستان سناتے ہیں۔

مُلکوں کے درمیان اور معاشروں کے اندر بھی عدم مساوات جڑیں پکڑتی جا رہی ہے۔ خواہ یہ معاشرے ترقی یافتہ ہوں یا ترقی پذیر، صرف چند اقوام بلکہ بیش تر صورتوں میں کچھ اداروں یا افراد کو کروڑوں کے ہجوم پر بالادستی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ کوئی انکشاف نہیں کہ اکیسویں صدی کے آغاز پر دنیا کی مجموعی قومی پیداوار GDP کا ستاسی فی صد صرف بائیس امیر ممالک

میں پیدا ہوتا تھا' دنیا کے باقی ماندہ سات فی صد عوام دُنیا بھر کی مجموعی قومی پیداوار کے محض اکتیس فی صد پر روح و بدن کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے کوشاں ہیں۔ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ گزشتہ دو برس میں اس خلیج میں حیران کُن حد تک اضافہ ہوا ہے' حتیٰ کہ امیر ترین ممالک میں بھی اکیس فی صد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔

دنیا کے سات امیر ترین افراد کے پاس اکتالیس غریب ممالک (جن کی آبادی چھپن کروڑ ستّر لاکھ ہے) کی مجموعی قومی پیداوار سے زائد دولت ہے' جب کہ دنیا کے آدھے کے قریب عوام (تقریباً تین ارب) دو ڈالر یومیہ سے کم آمدن پر انتہائی مشکل سے زندگی گزارتے ہیں۔ دنیا میں رونما ہونے والی ترقی میں ان کے لیے کوئی حقیقی فائدہ نہیں ہے۔ ایک ارب انسانوں کو حفظانِ صحت کے نظام تک رسائی حاصل ہے۔ ایک ارب سے زائد لوگوں کو پینے کا صاف پانی دستیاب نہیں۔ اسّی کروڑ انسان بھوک اور خوراک کی کمیابی کا شکار ہیں اور ہر سال ڈیڑھ کروڑ بچے بھوک کے باعث موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ امیر امیر تر ہوتے جا رہے اور غریب غریب تر۔ اقوامِ متحدہ کے مطابق کہیں اور نہیں' خود ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں آمدن میں تمام بڑی صنعتی اقوام سے زیادہ عدم مساوات پائی جاتی ہے۔

دولت' مادی فوائد اور معیشت کی بڑھتی ہوئی مرکزیت نے فرد' سماج اور تحفظ سے وابستہ غیر روایتی چیلنجوں کو جنم دیا ہے جو خاندانی نظام کی کمزوری' انفرادیت پسندی' منشیات اور انسانوں کی سمگلنگ سے لے کر ماحولیاتی خطرات تک حاوی ہیں۔

اقوامِ متحدہ' اس کی تمام ذیلی ایجنسیاں اور فنڈ ہر سال تیس ارب امریکی ڈالر خرچ کرتے ہیں' یعنی صرف چار امریکی ڈالر فی کس۔ یہ دنیا کی اکثر حکومتوں کے بجٹ کے مقابلے میں حقیر رقم اور دنیا کے دفاعی بجٹ کے تین فی صد سے بھی کم ہے۔

اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یک طرفہ فیصلوں اور پیشگی دفاعی حملوں (pre-emptive strikes) جیسے نظریات عملی طور پر ان ثمرات کو ضائع کر رہے ہیں جو دنیا نے بین الاقوامی قانون' انسانی حقوق' مساوات اور آزادی کے میدانوں میں حاصل کیے تھے۔ قومی مفادات کے نام پر بین الاقوامی تعلقات میں بالادستی اور طاقت کی سیاست کا دور دورہ ہے۔ علاقائی تنازعات خوفناک صورت اختیار کر رہے ہیں اور اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل جیسے ادارے عضوِ معطل بن چکے ہیں۔

اگرچہ اقوامِ متحدہ کے ارکان کی تعداد دو سو کے قریب ہے لیکن فیصلے کرنے اور ان کو دنیا پر نافذ کرنے کا اختیار صرف چند بڑوں کے پاس ہے' بلکہ کچھ معاملات میں تو عملاً صرف امریکہ ہی کے پاس۔ اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی توسیع کے مباحث کچھ عرصے سے جاری ہیں' لیکن ان کا محور بھی یکساں ذہنیت کی حامل کچھ اور طاقتوں (مثلاً بھارت) کو آگے لانا ہے جس کے باعث دنیا میں طاقت کا توازن مزید بگڑ جائے گا۔

علاوہ ازیں عدم توازن کا یہ معاملہ صرف فیصلہ سازی کے ساتھ ہی نہیں' بلکہ فیصلوں کا نفاذ بھی امتیازی طور پر ہوتا ہے۔ کمزور کو آسانی سے نشانہ بنایا جا سکتا ہے' جب کہ طاقت ور بڑی آسانی اور ڈھٹائی سے اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ سرحدوں کی خلاف ورزی کی جا سکتی ہے' قومی خودمختاری کا کوئی تقدّس نہیں' زبردستی مسلّط کردہ اور اپنی مرضی سے تبدیل شدہ حکومتوں کو تحفظ دیا جاتا ہے۔ یہ رویّہ عالمی نظام اور عالمی امن و سلامتی کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے جو غیر ریاستی عوامل کو موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو اپنے حق میں منظّم کریں جو ناانصافیوں سے تنگ آ چکے ہیں اور جن کا اعتماد عالمی نظام اور اس کے نمائندہ اداروں

سے تیزی سے اُٹھتا چلا جا رہا ہے۔

کئی اور چیلنجوں کا دائرہ مختلف ریاستوں کے اندرونی' ریاستوں کے باہمی تنازعات اور مہلک جوہری ہتھیاروں کے افقی اور عمودی پھیلاؤ سے لے کر بین البراعظمی جرائم تک وسیع ہے۔

اس سے بھی زیادہ اہم' انسانی تحفظ کو لاحق غیر روائتی خطرات کا وقوع پذیر ہونا اور ان کی شدت ہے۔ خوراک کا تحفظ (food security) قدرتی آفات اور غیر دانش مندانہ پالیسیوں کی بنا پر سنگین شکل اختیار کر چکا ہے۔ توانائی کے تحفظ (energy security) کا معاملہ اتنا بڑا ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح بڑے پیمانے پر ماحولیاتی آلودگی اور پانی کے مسئلے سے پیدا ہونے والے خطرات' نیز موسمیاتی تبدیلی کے ممکنہ اثرات توجہ طلب اور عملی اقدامات کے متقاضی ہیں۔

بلاشبہہ آج دنیا میں گہری تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ قدیم جغرافیائی و سیاسی حقائق کو آج بڑے بڑے تغیرات' انقلابات اور مدوجزر کا سامنا ہے۔ نئی صف بندیاں' اتحاد' دوستیاں اور دشمنیاں تشکیل پا رہی ہیں۔ علاقائی طاقت کے نئے مراکز' کئی برس سے ظاہر ہو کر اپنے وجود کا احساس دلانے کے لیے کوشاں ہیں۔

عالمی اور علاقائی سلامتی کو لاحق خطرات کے حوالے سے غیر ریاستی عناصر کا کردار نمایاں تر ہوتا جا رہا ہے۔ عالمی معیشت اگرچہ ابھی تک عمومی طور پر ترقی یافتہ شمالی ممالک کے کنٹرول میں ہے' لیکن اس میں بھی تبدیلی کا رجحان واضح دکھائی دیتا ہے۔ چین ترقی کی جانب غیر معمولی تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے عالمی معیشت کی اس تبدیلی کی قیادت کر رہا ہے۔

لیکن کیا یہ عدم مساوات' نا انصافی' طاقت کے استعمال' جارحیت' غربت و بیماری' جہالت' انسانوں' منشیات اور اسلحہ کی غیر قانونی نقل و حمل

> اقوامِ متحدہ بیس برس سے مالی مشکلات سے دوچار ہے۔ اِسے مجبوراً ہر شعبے میں کئی انتہائی مفید منصوبوں کو ختم کرنا پڑا ہے' حالانکہ اس عرصے میں بہت سی نئی ذمہ داریوں نے سر اُٹھایا ہے۔ کئی رکن ملکوں نے اپنے تمام واجبات بھی ادا نہیں کئے' جب کہ کئی نے اقوامِ متحدہ کے رضا کارانہ فنڈ میں عطیات دینا بند کر دیے ہیں۔ 31 اگست 2012ء تک رکن ممالک کے ذمے عمومی بجٹ کے بقایا جات 82.9 کروڑ امریکی ڈالر تک پہنچ چکے تھے۔ ان میں سے ترانوے فی صد امریکہ کے ذمّہ ہیں!!

جیسے ہولناک مسائل کے تدارک کے لیے معاون ثابت ہو رہا ہے؟

جس منظر نامہ پر اوپر بات کی گئی' وہ تبدیلی کے لئے بیک وقت چیلنج اور موقع پیش کرتا ہے۔ اگرچہ مذکورہ بالا مسائل میں سے ہر ایک کے حل کے لیے مخصوص اور متعین لائحہ عمل درکار ہے لیکن ان کے پائیدار اور جامع حل کے لئے ان مسائل کی بنیادی وجوہات کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے جن کی جڑیں زندگی اور ترقی کے موجودہ فلسفے میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے لئے بنیادی طور پر معاملات کو ابتداً فکری سطح پر طے کرنا ہوگا۔

بدقسمتی سے صرف اپنے یا اپنے مفاداتی گروپ کے فوائد کی ہر قیمت پر تحفظ کی پالیسی (survival of the fittest) کے نظریے پر چلنے والا نظام ''جس کی لاٹھی' اس کی بھینس'' کا منظر پیش کر رہا ہے۔ یہ کبھی بھی صحت مند مقابلے کا ماحول فراہم نہیں کر سکتا کیونکہ اس نظام نے انفرادی اور اجتماعی سطح پر طاقت کے استعمال کو اتنی فوقیت دے دی ہے کہ اس کے آگے اخلاقی اصولوں کی کوئی وقعت نہیں رہی۔ تنازعات ایسے حالات کا ناگزیر تقاضا بن جاتے ہیں' آج کی دُنیا میں ہم یہی کچھ دیکھ رہے ہیں۔

موجودہ نظریے کی بنیاد سرمایہ دارانہ طرز پر ہے' معاشی طور پر اس کی باگ ڈور

معاشی طور پر مستحکم ممالک کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کی ترویج امدادی ایجنسیاں اور بین الاقوامی مالیاتی ادارے کر رہے ہیں جن میں سے قابلِ ذکر عالمی بینک، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (IMF) اور بڑے کاروباری ادارے (کثیر الاقوامی اور بین الاقوامی کمپنیاں TNCs اور MNCs ہیں)۔ سرمایے کی تشکیل، آزاد منڈی کی معیشت، نجکاری، غیر ملکی امداد، سماجی و جمہوری تصورات، جائز و ناجائز، مساوات و عدم مساوات اور انصاف و ناانصافی جیسے تصورات بے معنی ہو چکے ہیں۔ بجائے اس کے کہ ''سماجی ترقی کے پیشِ نظر اخلاقی و اصولی انتخاب کو جانا اور اپنایا جائے'' بڑھوتری کے حجم و شرح، سرمایے کی تشکیل، بیرونی امداد و وسائل کی تخصیص، زیادہ سے زیادہ منافع خوری اور انفرادی فوائد کا جنون عروج پر ہے۔ انسانی فلاح اور سماجی بہبود سمیت دیگر تمام امور کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ انصاف اور انسانی بہبود کے بجائے مہارت اس نظریے میں نصب العین بن چکی ہے جس میں اصل زور نمو پذیری (growth) پر ہے۔ غربت میں کمی اور عوامی بہبود کے اہداف کے بارے میں تصور کیا جاتا ہے کہ وہ اس کے نتیجے میں خود بخود حاصل ہو جائیں گے۔ اس لئے اس نظریے کو انسانیت کے نصب العین کے ساتھ ترقی و پیش قدمی سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔

بین الاقوامی تعلقات کے میدان میں اس نظریے کا اظہار قومی مفاد کی سوچ ہے۔ دنیا کے ممالک کے درمیان بین الاقوامی تعلقات کو نافذ کرنے کے حوالے سے اخلاقی اور فکری پہلو کو ترویج دے کر حقیقی معنوں میں عملاً نافذ کرنا ہوگا۔ اگر عالمی نظام مکمل طور پر بڑی طاقتوں کے مفاد کی سوچ کے تحت ہی چلتا رہا، تو کمزور اقوام کے مفادات طاقت ور قوموں کے ہاتھوں پامال ہوتے رہیں گے۔

مختلف ممالک کا باہم انحصار (interdependence) ہی وہ واحد محرک نہیں جس کی وجہ سے باہمی تعامل، مذاکرات اور تعاون کی اہمیت میں اضافہ ہُوا ہے۔ ہمہ پہلو اور پائیدار ترقی بھی تقاضا کرتی ہے کہ بین الاقوامی سیاسی و اقتصادی تعلقات میں نئے رخ اور نئی بصیرت کے ساتھ ایسا فکری انقلاب رونما ہو جس کا جھکاؤ اور رُخ دوسروں کے مفادات کی قیمت پر اپنے قومی مفاد کے حصول کے بجائے ایسے تعلقات کی طرف ہو جس میں توجہ کا مرکز مجموعی انسانی و سماجی بہبود ہو اور اس کی بنیاد تعاون، باہمی احترام، دوطرفہ مفاد اور باہمی منافع ہو۔

اسلامی سن ہجری کا تعین اور اس کا باقاعدہ آغاز فاروقیؓ عہدِ خلافت (21 ہجری) میں ہُوا تھا۔ حضرت عمرؓ فاروق کے سامنے ملاحظہ کے لیے ایک مثل پیش کی گئی۔ تاریخ میں صرف شعبان مذکورہ تھا، آپؓ نے پوچھا کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ گزشتہ شعبان مراد ہے یا اس سال کا شعبان؟ اسی وقت شوریٰ کا اجلاس طلب کیا، تمام کبار صحابہؓ جمع ہوئے اور اس مسئلے پر غور کیا گیا۔ اکثریت کی رائے یہ تھی کہ تاریخ میں دن اور ماہ کے تعین کے ساتھ سال کا تذکرہ بھی ہونا چاہیے۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہُوا کہ سن کی ابتداء کب سے قرار دی جائے؟ حضرت علیؓ نے رائے دی کہ سالِ ہجرت کو آغاز کا سنگِ میل قرار دیا جائے۔ اس پر سب کا اتفاق ہو گیا۔ نبی کریمؐ نے ہجرت ربیع الاول میں فرمائی تھی۔ عرب قاعدے کے مطابق سال کا آغاز محرم سے ہوتا ہے اور یوں آغازِ سال کو دو ماہ اور آٹھ یوم گزر چکے تھے، لہٰذا دو ماہ آٹھ دن پیچھے ہٹ کر شروع سال سے اسلامی سن قائم کر دیا گیا۔

—— الفاروق: شبلی نعمانیؒ

بزمِ ادب

ہوئی ہے زیرِ فلک اُمتوں کی رُسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

— اقبالؒ

حفیظ تائب کی آشوبِ ملّت

سعید بدر

علم اور ادب کی دنیا میں ''شہر آشوب'' ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی شہر کی پریشانی، بربادی و ویرانی، زمانے کی ناقدردانی، معاشرتی اور اخلاقی و سیاسی حالت کی خرابی اور بے سروسامانی کا ذکر کیا گیا ہو۔ یہ فارسی لفظ اب اردو لغت کا حصہ بن چکا ہے۔

فتنۂ تاتار کے نتیجہ میں چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان نے جب بغداد کو تباہ و برباد کیا تو شیخ سعدی شیرازیؒ نے بغداد پر شہر آشوب لکھی جس کا یہ شعر آج تک مشہور ہے:

آسمان راحق بود گر خواں ببارد بر زمیں
بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنیں

ترجمہ: امیر المومنین ملک مستعصم کے زوال پر آسمان کو حق حاصل ہے کہ وہ زمین پر خون کی بارش کرے

علامہ اقبالؒ نے بانگِ درا میں اٹلی کے جزیرہ سسلی یعنی ''صقلیہ'' پر جو نظم لکھی ہے، وہ بہت حد تک شہر آشوب کی ذیل میں آتی ہے۔ اس کے پہلے بند میں وہ کہتے ہیں:

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوشابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ اُن صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

اس کے بعد تاریخی حوالوں سے دنیائے اسلام کے تباہ ہونے والے علاقوں کی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ کن کن اہلِ درد مورخین نے ان مقامات کی تباہی کی داستان لکھی ہے اور اب صقلیہ کی دردناک اور غم انگیز حالت لکھنے کے لیے تقدیر نے مجھے چن لیا ہے۔

اس کے بعد علامہ اقبالؒ کی نظم ''بلادِ اسلامیہ'' بھی دردناک تباہی کی تصویر دکھاتی ہے۔ آغاز دہلی کی سرزمین سے ہوتا ہے جس کے ہر ذرے میں مسلمان اسلاف کا خون موجود ہے۔ فرماتے ہیں:

سرزمیں دلی کی مسجودِ دلِ غم دیدہ ہے
ذرے ذرے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے

پاک اس اُجڑے گلستاں کی نہ ہو کیونکر زمیں
خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سرزمیں

سوتے ہیں اس خاک میں خیر الاممؐ کے تاجدار
نظمِ عالَم کا رہا جن کی حکومت پر مدار

اسی طرح ہسپانیہ کے شہر قرطبہ کی تباہی و بربادی پر خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ یہ شہر بھی کبھی ''دیدۂ مسلم کا نُور'' تھا اور مغربی دنیا کے ظلمت کدہ میں شمعِ طور کی مانند روشن و تاباں۔ جس نے بجھتے بجھتے بھی اہلِ مغرب کی تہذیب کا چراغ روشن کر دیا۔

ہے زمینِ قرطبہ بھی دیدۂ مُسلم کا نُور
ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمعِ طُور

بجھ کے بزمِ ملتِ بیضا پریشاں کر گئی
اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی

اس کے بعد قسطنطنیہ کا ذکر کرتے ہیں جہاں سے اسلامی علوم ودانش کے سوتے پھوٹے اور اہلِ یورپ کے لئے زندگی بخش ثابت ہوئے:

خطۂ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار
مہدیٔ اُمت کی سطوت کا نشانِ پائیدار
اے مسلماں ملتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر
سیکڑوں صدیوں کی کُشت وخوں کا حاصل ہے یہ شہر

دراصل کوئی بھی شاعر جب شعر کہتا ہے تو وہ اپنے گردوپیش کے حالات اور واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب ملتِ اسلامیہ پر ابتلاء کا دور آیا اور وہ مراکش سے انڈونیشیا تک اور بلخ وبخارا سے یمن تک پابندِ سلاسل ہو کر حریت اور آزادی کی نعمت سے محروم ہوگئی، تو ہر زبان اور ہر ملک کا مسلمان شاعر تڑپ اٹھا۔ علامہ اقبالؒ کے اشعار میں بھی اس کے متعدد حوالے موجود ہیں۔ ہندوستان کا مسلمان اسیرِ فرنگ ہوا، تو خواجہ الطاف حسین حالیؒ نے نعت کی صورت میں وہ معرکتہ الآرا نظم لکھی جس کا حوالہ آج تک دیا جاتا ہے:

اے خاصۂ خاصانِ رُسلؐ وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تریؐ آکے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریبُ الغُربا ہے

یہی حال عہدِ حاضر کے نعت گو شاعر عبدالحفیظ تائب کا ہے۔ انہوں نے جہاں نعت گوئی میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سراپا نگاری کے ساتھ ساتھ سیر نگاری کو موضوع بنا کر نعت کو نیا انداز اور نیا رخ دیا، وہاں انہوں نے بعض اشعار میں ملتِ الامیہ کی زبوں حالی کا ذکر بھی کیا ہے۔

اس سلسلے میں حفیظ تائب نے صرف چند اشعار پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی بعض نعتیں مکمل طور پر ملتِ اسلامیہ کی پریشانی وبربادی، حالات کی دگرگونی اور زبوں حالی کی سچی تصویر کھینچتی ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی شہر کی ویرانی پر لکھی جانے والی نظم ''شہر آشوب'' کہلاتی ہے، تو پھر دنیا کے دگرگوں حالات کی تصویر کشی کرنے والی نظم کو کیا نام دیں گے؟ اہلِ علم ایسی نظم کو ''جہاں آشوب'' یا ''دَہر آشوب'' کا نام دیتے ہیں۔ اس طرح کسی نعت کی صورت میں امتِ مسلمہ کی زبوں حالی کا ذکر کیا جائے، تو اہلِ علم وادب اسے ''آشوبِ ملت'' یا ''آشوبِ اُمت'' گردانتے ہیں۔

جناب حفیظ تائب کا وہ نعتیہ شعر پیش خدمت ہے جس میں ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی کی تصویر کشی کو ''شہر آشوب'' قرار دیتے ہیں اور اس کے متبادل ''شہر افروز'' کی نہایت عمدہ اور دلکش ترکیب بھی پیش کی ہے۔ کہتے ہیں:

مَیں نے '' شہر آشوب'' لکھا ہے بہ اُمیّدِ کرم
اب تو ''شہر افروز'' دیکھوں مصطفیٰؐ یا مصطفیٰؐ

''کلیاتِ حفیظ تائب'' کے آغاز میں متعدد نظمیں بہ ظاہر حمدِ باری تعالیٰ اور مناجات میں بھی امت کی مشکلات کا ذکر کرنے اور ربِ کریم سے انعاماتِ الٰہی کے حصول کی دعا کرنے سے گریز نہیں کیا، بلکہ وہ بار بار ایسا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک جگہ عرض پرداز ہیں:

امت ترے حبیبؐ کی ہے مشکلات میں
وا اس پہ کر دے پھر درِ انعام اے کریم

ملت کے بال و پر کو بچا ہر گرفت سے
پھیلے ہوئے ہیں چاروں طرف دام اے کریم

دوسری مناجات میں بھی متعدد اشعار اسی موضوع پر ہیں:

اس پر ملّتِ بیضا کا غم
بنتا جاتا ہے جاں لیوا

سب اسلامی قوموں پر ہے
پردۂ امن میں ظلم ہمیشہ

مغربیوں کا دامِ معیشت
سخت بہت ہے ہوتا جاتا

دہشت گردی کے عفریت نے
خوف ہے ہر جانب پھیلایا

لُوٹ کھسوٹ کی یلغاروں سے
ساری معیشت ہے تہ وبالا

وار سے فرقہ واریت کے
قصرِ اخوت میں ہے لرزہ

امن و اماں ہے درہم برہم
مہنگائی کا بول ہے بالا

مغرب کی زد میں ہے ثقافت
شرم وحیا کا سانس ہے اُکھڑا

ان اشعار پر غور کیجئے' حفیظ تائب نے جو کچھ کہا' وہ حرف بحرف صحیح ثابت ہو رہا ہے۔ ''کلیاتِ حفیظ تائب'' کی ابتدائی دو نعتوں میں حفیظ تائب نہایت دردمندی سے ملتِ اسلامیہ کی موجودہ حالت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بعض لوگوں نے ''انتہا پسندی'' کو وصف سمجھ لیا ہے اور میانہ روی کو عیب۔ جو شعائرِ اسلامیہ کے یکسر خلاف ہے:

اِک ''وصف'' ہے انتہا پسندی
اِک ''عیب'' ہے اعتدال آقاؐ

دیکھا نہ چشمِ آدمی نے
اخلاص کا ایسا کال آقاؐ

اخلاص کا یہ کساد مولا
انصاف کا یہ زوال آقاؐ

جائیں کدھر کہ چار جانب
فتنوں کے بچھے ہیں جال آقاؐ

اُمت کو عروج پھر عطا ہو
غم سے ہے بہت نڈھال آقاؐ

آج کل پوری امتِ مسلمہ مغرب کی جانب سے ''انتہا پسندی'' اور ''بنیاد پرستی''

حفیظ تائب نے جب دیکھا کہ ملتِ اسلامیہ اپنی عظمت وحشمت سے محروم ہو کر زبوں حالی کے گڑھے میں گر چکی ہے اور اس کے انتشار کا یہ حال ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی منتشر بھیڑوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ' کمزور اور بے بس ہے' تو ''نویدِ مسیحا'' یعنی نبی اکرمؐ سے فریاد کرتے ہیں:

یا نویدِ مسیحاؐ تیری قوم کا حال عیسیٰؑ کی بھیڑوں سے ابتر ہُوا
اس کے کمزور اور بے ہنر ہاتھ سے چھین لی چرخ نے سروری یا نبیؐ

کام ہم نے رکھا صرف اذکار سے' تیری تعلیم اپنائی اغیار نے
حشر میں منہ دکھائیں گے کیسے تجھے' ہم سے ناکردہ کار اُمتی یا نبیؐ

گلشنوں' شہروں' قریوں پہ ہے پَر فشاں' ایک گمبھیر افسردگی یا نبیؐ
دے تبسّم کی خیرات ماحول کو' ہم کو درکار ہے روشنی یا نبیؐ

کے الزامات کے وار اور ''دہشت گردی'' کے ایک نئے اور بے سروپا الزام کی زد میں ہے اور دن رات اس کی سزا بھگت رہی ہے۔ اہلِ مغرب نے اپنے طاقتور میڈیا کے زور پر نہ صرف دہشت گردی کی برائی مسلمانوں ہی کے لیے مختص کر دی ہے' بلکہ اب تو دنیا کی تمام برائیاں ان کے کھاتے میں ڈال کر انہیں ''برائی کا محور'' قرار دے دیا گیا ہے۔

ایک اور جگہ حفیظ تائب کا دردمند دل تڑپ اٹھتا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کی ذلت و رسوائی کا قلق انہیں جینے نہیں دیتا اور وہ خوفزدہ ہیں کہ کہیں زمانے کی بادِ سموم اہلِ اسلام کی باقی ماندہ دولتِ ایمان ہی نہ اڑا لے جائے:

ہم بُھول کے پیغام ترا ہو گئے رُسوا
جینے نہیں دیتا یہ قلق ہادیٔ برحقؐ

ڈرتا ہُوں کہیں صرصرِ دوراں نہ اُڑا لے
باقی ہے جو ایماں کی رَمَق ہادیٔ برحقؐ

بے چینی اور اضطراب کے عالَم میں فریاد کرتے ہیں کہ امتِ مرحوم کے ''تنِ خستہ'' میں حضرت بلالؓ کی سی حُبِ رسولِ کریمؐ' توانائی اور وفاداری و ایمان کی روح پھونک دی جائے:

اُمت کے خستہ تن میں پھر
پھونک دے روحِ بلالیؓ آقاؐ

حفیظ تائب اس روحِ بلالیؓ کی بحالی کی درخواست کرتے ہیں جس کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے اپنی نظم ''شکوہ'' میں کہا تھا:

رہ گئی رسمِ اذاں' روحِ بلالیؓ نہ رہی
فلسفہ رہ گیا' تلقینِ غزالیؒ نہ رہی

یہاں پہنچ کر حفیظ تائب علامہ اقبالؒ کے ہم نوا اور ہم خیال ہو جاتے ہیں کیونکہ دونوں کا درد ایک ہے' دونوں کا غمِ ملت بھی ایک ہے' دونوں کا مدعا اور نصب العین بھی ایک ہے۔ دونوں دل و جان سے قوم کی خوش حالی اور ملت کی ترقی و عروج کے خواہاں ہیں۔

نعت کا شاعر محض الفاظ و معانی کی بندش کا شاعر ہی نہیں ہوتا' عمدہ تراکیب کا استعمال ہی اس کا کام نہیں' بلکہ وہ رسولِ پاکؐ کا امتی بھی ہوتا ہے اور ان کی ذات و صفات کا عاشقِ صادق بھی۔ وہ آپؐ کو محض اپنا آقا ہی تصور نہیں کرتا بلکہ انؐ سے بے پناہ محبت' اس کے ایمان و ایقان میں شامل ہوتی ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت کے مطابق رسولِ پاکؐ کا ارشاد ہے:

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ وہ مجھے اپنی ذات' اپنے عزیز و اقارب' اپنے جان و تن' اپنے مال و زر' اپنی اولاد' حتیٰ کہ اپنی عزیز ترین شے سے زیادہ عزیز اور زیادہ محبوب نہ سمجھے۔ (بخاری)

حفیظ تائب ایک جگہ عرض کرتے ہیں:

شانِ محبوبِؐ خدا کس سے بیاں ہو تائب
کیسے اِک ذرّے کا آفاق کا انداز ہو یا پھر

کشورِ ہست کے سلطان رسولِ عربی
قصۂ زیست کے عنوان رسولؐ عربی

کون ہے صاحبِ لولاک لَما تیرے سِوا
کُل جہانوں کی ہے تُو جان رسولِ عربیؐ

ایک اور جگہ حفیظ تائب نے حضور رسالت مآبؐ کی شان کو یوں بیان کیا ہے:

نبیؐ کو مظہرِ شانِ خدا کہیے' بجا کہیے
شہِ عالمؐ' امامِ انبیاء کہیے' بجا کہیے

ہماری اس ساری تمہید کا مقصد یہ ہے کہ نعت نگار چونکہ رسالت مآبؐ کی محبت سے سرشار ہوتا ہے' اس لئے وہ ہر اس چیز کو پسند کرتا ہے جسے

حضور پاکؐ نے پسند کیا اور ہر اُس چیز سے دکھی ہوتا ہے' رسولِ کریمؐ جس سے رنجیدہ خاطر ہوں۔ امتِ مسلمہ کے بارے میں حضور پاکؐ کے متعدد ارشادات موجود ہیں جن میں آپؐ نے اللہ تعالیٰ سے اپنی امت کی بخشش کی دعائیں نہ صرف اپنی زندگی میں مانگی ہیں' بلکہ روزِ محشر بھی شفاعت کرنے کا ذکر احادیث میں موجود ہے۔ اس سلسلے میں حضرت اویس قرنیؓ کا واقعہ ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ آپؐ نے حضرت عمر فاروقؓ سے فرمایا تھا: ''میری امت میں ایک شخص اویس قرنی ہوگا جب اس سے ملو تو اسے میرا اسلام کہنا' میری امت کی بخشش کے لیے دعا کرانا کیونکہ اس پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے۔ وہ اپنے پروردگار کے نزدیک بڑا پسندیدہ ہے۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی قسم کھائے' تو اللہ تعالیٰ اسے سچا کر دے اور اس کی ایک دعا سے بروزِ قیامت قبیلہ ربیعہ اور حصر کی بھیڑ بکریوں کی تعداد کے برابر میری امت کے افراد کی شفاعت اور بخشش ہوگی۔'' یاد رہے کہ ان دونوں قبیلوں کی بھیڑیں اور بکریاں اس قدر تھیں کہ ان کی تعداد ہی کسی کو معلوم نہ تھی' گویا اَن گنت اور بے شمار۔

حفیظ تائب نے بھی حضرت اویس قرنیؓ کا حوالہ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نعت نگار صرف اپنے گرد و پیش کے حالات و واقعات سے متاثر ہو کر ہی ''آشوبِ ملت'' کے اشعار نہیں کہتا بلکہ حضورِ اقدسؐ سے اس کی محبت کا تقاضا ہے کہ وہ آپؐ کی امت کی حالتِ زار بیان کرتے ہوئے اس کی مغفرت' اس کی ترقی و خوش حالی اور اس کے عروج و کمال کی دعا بارگاہِ ربِ کریمؐ میں بھی کرے اور رسالت پناہ کی خدمت میں بھی عرض پیش کرے۔ گویا یہ دعا کرنا سنتِ رسولِ کریمؐ کی پیروی ہے۔ حفیظ تائب مسلمانوں پر زمانے کی سختیوں اور پریشانیوں سے رنجیدہ ہیں اور ان کی زندگی کی آسانی کے لیے اللہ تعالیٰ اور رسولِ پاکؐ کے سامنے فریاد کرتے ہیں:

> حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر فاروقِ اعظمؓ کو حضرت اویس قرنیؓ کی نشانیاں بھی بتائی تھیں۔ یہ وہی اویس قرنیؓ ہیں جنہوں نے جنگِ اُحد کے بعد یہ خبر سن کر کہ رسولِ کریمؐ کا ایک دانت شہید ہو گیا ہے' اپنے تمام دانت توڑ ڈالے اور یہ معلوم کرنے کا تکلف نہ کیا کہ آپ کا کون سا دانت شہید ہوا تھا۔ اویس قرنیؓ سچے اور پکے عاشقِ رسولِ مقبول تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے رسولِ کریمؐ کی وفات حسرت آیات کے بعد دُور دراز کا سفر طے کیا' کسی جنگل میں حضرت اویس قرنیؓ سے جا ملے اور ان سے فرمانِ نبیؐ کے مطابق دعا کرائی۔ اس حدیث پاک کو علامہ جلال الدین السیوطیؒ نے اپنی کتاب جمع الجوامع میں اور شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے اپنی شرح مشکواۃ میں درج کیا ہے۔ ـــــ جلالِ مصطفیٰؐ: میجر امیر افضل خان

زیرِ دستوں پر مظالم' حق پرستوں کا مذاق
کیا نہیں دیکھا بنامِ ارتقاء یا مصطفیٰؐ

ایک نعت میں ''پستیٔ امت'' کو دیکھ کر یوں تڑپ اُٹھتے ہیں:

دل میرے کو تڑپانے لگی پستیٔ امت
جوں جوں مجھے یاد آنے لگی رفعتِ مولیٰؐ

اس شاہؐ کی امت ہوئی محتاجِ زمانہ
ہر نعمتِ کونین ہے جس شاہؐ کا صدقہ

جو دَہر میں فیضانِ رسالت کی امیں ہے
وہ قوم ہوئی صدق وعدالت سے مُعرّا

حفیظ تائب نے ان اشعار میں عرض کیا ہے کہ رسول پاکؐ کی

شان ومرتبہ کی بلندی کے احساس کے ساتھ مجھے یہ احساس بھی دامن گیر ہے کہ آپؐ کی ذاتِ عالیہ جس قدر بلند مرتبہ اور بلند شان ہے' آپؐ کی امت اسی قدر پستیوں اور زبوں حالی کا شکار ہے۔ وہ امت جو زمانے میں آخری شریعت اور آخری فرمانِ حق کی امانت دار ہے' وہ اسی فرمانِ عالی شان پر عمل پیرا نہ ہونے کی وجہ سے ذلیل اور خوار ہے' عرض کرتے ہیں:

عافیت کی ساری قدریں ہیں تہ وبالا حضورؐ
ہوگیا ہے سخت مشکل سانس بھی لینا حضورؐ

صورتِ احوال سے دل گرفتہ ہوکر اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوجاتے ہیں:

یہ حالِ زبوں اُمتِ مرحوم کا یارب
اب شاعرِ سرکارؐ سے دیکھا نہیں جاتا

فلسطین وکشمیر عرصہ دراز سے زیرِ ابتلا چلے آرہے ہیں۔ ہر سچے مسلمان کی طرح حفیظ تائب بھی ان حالات سے اثر قبول کرتے ہیں' اس طرح افغانستان میں جب مصیبت اور آزمائش کے ادوار آئے تو ان کا دل خون کے آنسو رویا:

افغانیوں پہ کوہِ الَم ٹُوٹ پڑا ہے
خوں ریز ہیں کوہسار کے منظر مرے آقاؐ

مسموم و شرربار ہیں کابل کی فضائیں
مغموم ہیں شمشاد و صنوبر مرے آقاؐ

ایک اور نعت میں سیّدِ عالَمؐ سے عرض کرتے ہیں:

مزاجِ زندگی ہے سخت برہم سیّدِ عالمؐ
دگرگوں ہیں بہت احوالِ عالَم سیّدِ عالمؐ

اسیرِ حادثاتِ نو بہ نو ہے امتِ آخر
کہ اس پر یُورشِ اعدا ہے پیہم سیّدِ عالمؐ

مِلت اسلامیہ کے اسی آشوب کا ذکر کرتے ہوئے ایک اور نعت میں کہتے ہیں:

خوں رُلاتا ہے مجھے اسلامیوں کا انتشار
ان پہ اندر اور باہر سے ہے یلغارِ فشار

بہہ رہا ہے چار جانب اُن کا خونِ ناروا
یا رسولؐ اللہ اُنظر حالَنا

تشنۂ تکمیل ہیں افغانیوں کی کوششیں
بن گئی ہیں سدِّ رہ طاغوتیوں کی سازشیں

کاروانِ حریّت ہے کشمکش میں مبتلا
یا رسولؐ اللہ اُنظر حالَنا

یہ نعت کئی بندوں پر مشتمل ہے۔ حفیظ تائب نے ہر بند میں ملتِ اسلامیہ کے ایک ایک مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے اور ''اُنظر حالَنا'' کہہ کر رسولِ پاکؐ کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ اس نعت میں کشمیر کا الگ سے ذکر بھی آیا ہے۔ اہلِ کشمیر پر بھارت کی طرف سے گزشتہ 66 سال سے ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے جارہے ہیں' حفیظ تائب دل گیر اور پریشان ہوکر کہتے ہیں:

جوشِ آزادی سے ہیں سرشار کشمیری عوام
ظلم اُن پر توڑتے رہتے ہیں مفسد صبح وشام

ذرّہ ذرّہ مضطرب ہے وادیِ کشمیر کا
یارسولؐ اللہ اُنظر حالَنا

اسے آشوبِ ملت کہیے یا آشوبِ اُمت' اس کا ذکر حفیظ تائب کے کلام میں بکثرت موجود ہے۔ یہ محض اتفاق یا حُسنِ اتفاق کا نتیجہ نہیں' بلکہ ان کے کلام کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ حفیظ تائب شعوری طور پر الفاظ وتراکیب کا انتخاب کرتے اور لفظ آشوب کو مختلف انداز میں استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ حضور پاکؐ کے امتی اور نعت نگار کی حیثیت سے وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ملتِ اسلامیہ کے مصائب و آلام' جن سے وہ دلی طور پر متاثر ہوتے اور تڑپتے بھی ہیں' کا ذکر بھی کیا جائے اور ان کے اسباب وعلل کا کھوج لگا کر ان کا مداوا تلاش کیا جائے تاکہ ستم رسیدہ اُمت اس نسخۂ کیمیا پر عمل کر کے اپنی حالت بہتر بنا سکے۔ حفیظ تائب اپنی ہر نعت اور نظم میں جہاں کہیں موقع ملتا ہے' اُمت کے لیے دعا کرتے ہیں اور اس کی خیر و برکت مانگتے ہیں۔ اپنی کتاب ''تعبیر'' میں ایک نظم میں پوری اُمتِ مسلمہ کی خیر کی دعائیں مانگتے ہیں:

اِک آگ میں ہے ملتِ بیضا گھری ہوئی
یارب حرم کی خیر ہو' اہلِ حرم کی خیر

بستے رہیں اماکنِ اسلامیہ تمام
طَیبہ کی خیر' مکہ کے جاہ و حشم کی خیر!

دنیا بھر میں ملتِ بیضا پر ہونے والے مصائب کے ہر نئے حملے اور آنسو رُلا دینے والے ہر نئے آشوب سے حفیظ تائب نہ صرف گہرا اثر قبول کرتے ہیں بلکہ والہانہ انداز میں رسولِ کریمؐ ہی کی طرف سوز و گداز کے ساتھ رجوع کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بعد ہمارے اصل اور حقیقی ملجا و ماویٰ ہیں اور ملت کے غم خوار اور غمگسار:

اُمت حضورؐ کی ہے عجب اِبتلاؤں میں
پیہم ہے اس پہ یُورشِ غم' صاحبِ حرمؐ

دستِ دعا اُٹھایئے' مِلت کے واسطے
ٹُوٹے حصارِ کرب واَلم' صاحبِ حرمؐ

تائب ہُوا ہے طالبِ رحمت جنابؐ سے
ہو اب تو سدِّ بابِ ستم' صاحبِ حرمؐ!

اسی طرح نہایت دل سوزی کے ساتھ نبی پاکؐ سے براہِ راست مخاطب ہو کر ایک بار پھر عرض پرداز ہیں:

پھر سرافراز ہو' اُمتِ آخریں
ختم ہو یُورشِ ابتلاء یا نبیؐ

اور مایوسیوں کی شبِ تار ہو
مِہرِ اُمید ہو رُونما یا نبیؐ

زندگی حق پرستوں پہ آسان ہو
پھر ہو ترویجِ مہر و وفا یا نبیؐ

طویل بحر کی ایک اور عمدہ نعت میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نالہ کُناں ہیں کہ ملتِ اسلامیہ پر آشوبِ حالات اس قدر حاوی وطاری ہے کہ وہ ہوش وحواس کھو بیٹھی ہے حتیٰ کہ آپؐ کی راحت انگیز یادوں کے چہرے بھی دھندلا گئے' گویا وہ آپؐ کی تعلیمات سے غافل ہو گئی ہے۔ آشوبِ حالات کا اندازہ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ آپؐ کا بے نوا شاعر جس کا اصل کام نغمہ گری ہے' وہ مجبور ہو کر نوحہ گری پر اُتر آیا ہے گویا اب پانی سر سے گزر چکا ہے' اس لیے یارسول اللہؐ ' نظرِ کرم فرماتے ہوئے ہماری امداد فرمایئے:

یا نبیؐ اب تو آشوبِ حالات نے تیری یادوں کے چہرے بھی دُھندلا دیئے
دیکھ لے تیرے تائب کی نغمہ گری بنتی جاتی ہے نوحہ گری یا نبیؐ

حفیظ تائب ایک نعت میں ''حضورؐ'' کی مشکل ردیف اختیار کرتے ہیں اور ملّتِ اسلامیہ میں اخلاقی اقدار کی پامالی کا ذکر کرتے ہوئے اپنی بے بسی کا حال بیان کرتے ہیں کہ گردوپیش مسائل کی بھرمار ہے اور وہ اکیلے ان سے نمٹنے کا حوصلہ اور سامان نہیں رکھتے:

عافیت کی ساری قدریں ہیں تہ و بالا حضورؐ
ہوگیا ہے سخت مشکل سانس بھی لینا حضورؐ

آج پامالِ ستم ہے فکر بھی میرا حضورؐ
اب مسائل سے نمٹنے کا نہیں یارا حضورؐ

مشکلات و مصائب کی شدت، مسائل کی حِدت اور خاص کر دورِ ابتلاء کی طوالت سے گھبرا کر وہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کیا وجہ ہے دورِ ابتلا ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی بے بسی اور بے کسی سے ان کا دل بھی ٹوٹنے اور ڈوبنے لگتا ہے، اور وہ افسردہ ہو کر خود کو یہ کہنے پر مجبور پاتے ہیں:

جانے کیا احوالِ اُمت کے بدلنے میں ہے دیر
جانے کیا حائل دعا کے پُراثر ہونے میں ہے

حفیظ تائب کو احساس ہے کہ ہم حضورِ اکرمؐ کے انعامات و اکرام کے مستحق اور قابل نہیں، لیکن پھر بھی فریاد کرتے ہیں:

گو ہم غلام نہیں قابلِ انعام
پھر بھی ترا انعام ہو آقائے دو عالمؐ

تجھ کو یہ گوارا ہے تری اُمتِ مظلومؐ
صیدِ غمِ ایام ہو، آقائے دو عالمؐ؟

مشکلات و مسائل کی سیاہ رات اور طویل سفر کے باوجود حفیظ تائب بالکل مایوس نہیں ہوتے، جی نہیں ہارتے۔ جانتے ہیں کہ آپؐ کے دستِ شفقت میں ''مسیحائی'' موجود ہے، اس لیے آپؐ سے دستِ شفقت طلب کرتے ہیں:

اپنی اُمت کے برہنہ سر پہ رکھ شفقت کا ہاتھ
پونچھ دے انسانیت کی چشمِ تر خیر البشرؐ

حفیظ تائب کو یقین ہے کہ آپؐ کی دعائے مبارک، اللہ تعالیٰ کے ہاں ضرور قبول ہوتی ہے۔ آپؐ کو شفاعت کو توفیق بخشی گئی ہے، اس حوالے سے رسولِ کریمؐ سے یوں عرض پرداز ہیں:

اپنی اُمت کے لیے ہوں گے نہ کیوں وہ فکر مند
جب خدائی کی محبت آپؐ کو بخشی گئی

آشوبِ ملت اور آشوبِ عالَم کی فراوانی اور شدت سے پریشان ہو کر وہ وجوہات اور اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے ان تمام آشوب ہائے دین و دنیا کا علاج بھی تجویز کرتے ہیں:

تیریؐ طاعت میں ہے آشوبِ زمانہ کا علاج
مجھ کو ہے کامل یقیں یا رحمۃ لِلعالمینؐ

علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا:

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

اسلام کی تعلیمات کے ''آبِ نشاط انگیز'' سے بڑھ کر ملتِ اسلامیہ کی بیماری کا کوئی شافی علاج نہیں۔ یہی گزارش ہے حفیظ تائب کی!

ادبی مُعمہ

انعام الحق

روزنامہ ''پاکستان'' لاہور میں جناب ناصر زیدی اپنے منفرد کالموں کے ذریعے مختلف کتابوں کا تیاپانچا کرتے ہوئے بتایا کرتے تھے کہ فلاں شعر کی اصل عبارت یہ ہے اور فلاں شعر فلاں شاعر کا نہیں' بلکہ فلاں کا ہے۔ یہ ایک ایسا جان جوکھوں کا کام ہے جس کو صرف وہی لوگ ہاتھ ڈال سکتے ہیں جن کے حوصلے ہوں زیادہ کیونکہ اساتذہ کے اشعار جن تذکروں کے ذریعے ہم تک پہنچے ان میں بھی کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس میں راویوں کی غلط روایت' مؤلفین کی ذہنی جدت پسندی اور خوشنویسوں' کمپوزکاروں اور پروف خوانوں کی ''کرامات'' بھی شامل ہیں جو کتابت کی غلطیاں ڈالنے کے علاوہ بعض اوقات شعراء اور مؤلفین ومرتبین کی اصلاح کا فریضہ بھی سرانجام دے دیا کرتے تھے۔ مشاعروں اور طرحی غزلوں نے بھی اس میں حصہ ڈالا اور شکوک وشبہات کی کتاب در کتاب یہ غلطیاں صدقۂ جاریہ کی طرح پھیلتی چلی گئیں اور اب بعض جگہ ان غیر منقولہ جائیدادوں کے اصل مالکان کو تلاش کرنا اگر ناممکن نہیں' تو دشوار ضرور ہو چُکا ہے۔

یہ تو اس دور کی بات ہے جب پریس اتنا عام نہ تھا' جب کہ آج بھی صورت حال یہ ہے کہ بعض غلط فہمیوں کی بنا پر بعض اشعار یا مصرعے اصل کی بجائے دوسرے شاعروں کے نام سے مشہور ہو چکے ہیں مثلاً دلاور فگار کا ایک مشہور قطعہ ہے:

حاکمِ رشوت سِتاں فکرِ گرفتاری نہ کر
کر رہائی کی کوئی آسان صورت' چُھوٹ جا

مَیں بتاؤں تجھ کو تدبیرِ رہائی مُجھ سے پُوچھ
''لے کے رشوت پھنس گیا ہے' دے کے رشوت چُھوٹ جا''

درج بالا قطعے کا چوتھا مصرعہ (جو کہ اس قطعے کا مرکزی جوہر ہے) حضرت دلاور فگار کا نہیں' بلکہ جناب رئیس امروہوی کا ہے۔ روزنامہ ''جنگ'' میں ان کے چھپنے والے قطعات کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں اور ان میں یہ موجود ہے۔ شہنشاہِ ظرافت حضرت دلاور فگار نے اس مصرعے کو تضمین کے طور پر استعمال کیا تھا' لیکن ظاہر ہے کہ مشاعروں میں پڑھتے وقت وہ اپنے کلام میں واوین نہیں لگا سکتے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ان کا دیوان چھپا' تو اس میں بھی واوین نہیں تھے جس کے باعث حضرت رئیس امروہوی اس سین سے آؤٹ ہو گئے۔ اسی طرح ایک بہت مشہور شعر ہے:

چمن میں رنگ وبُو نے اس قدر دھوکے دیے مجھ کو
کہ مَیں نے ذوقِ گل بوسی میں کانٹوں پر زباں رکھ دی

اِسے راولپنڈی کے سِکہ بند اُستاد شاعر جناب اختر ہشیار پوری مرحوم نے اپنے ایک مجموعے کے پہلے صفحے پر اپنے معروف شعر کے طور پر جلی حروف میں درج کیا۔ جناب ناصر زیدی نے تحقیقی ریکارڈ درست رکھنے کی خاطر اس حوالے سے ایک تحقیقی کالم لکھ کر ثابت کیا کہ یہ شعر اختر ہوشیار پوری کا نہیں ہے۔ کِسی نے کہا کہ یہ حفیظ ہوشیار پوری کا ہے جبکہ منتخب اشعار کی ایک سے زائد کتب میں یہ شعر سیماب اکبرآبادی اور نخشب جارچوی کے نام سے بھی درج ہے۔ اس کی وجہ یہی دکھائی دیتی

ہے کہ اس زمین میں بہت سے شُعراء نے طبع آزمائی کی اور پھر ''کُو بہ کُو پھیل گئی بات شناسائی کی''!

اسی طرح ایک اور شعر ہے جو تین مستند کتابوں میں تین طرح ملتا ہے:

شکست وفتح نصیبوں سے ہے امیر ولے
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

(نواب یار محمد خان امیر)

شکست وفتح مقدّر سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

(میر تقی میر)

شکست وفتح میاں اتفّاق ہے، لیکن
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

(نواب یار محمد خان امیر)

حُسن الدین احمد کی کتاب ''زباں زد اشعار'' (مطبوعہ: ولا اکادمی، حیدر آباد، بھارت۔1982) کے صفحہ 9 پر یہ شعر

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

صفی اورنگ آبادی کے نام سے دیا گیا ہے، جب کہ یہ شعر اکبر الٰہ آبادی کا ہے۔ اسی طرح اس کتاب کے صفحہ 13 پر یہ شعر

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

حالی کے نام سے دیا گیا ہے، جب کہ یہ مولانا ظفر علی خان کا شعر ہے اور ان کے اخبار ''زمیندار'' کے سرورق پر برسوں چھپتا رہا ہے۔

اسی طرح ذرّہ حیدر آبادی کی کتاب نے انکشاف کیا کہ درج ذیل شعر میرؔ کا نہیں مہاراج بہادر برق کا ہے اور اصل میں یُوں ہے:

وہ آئے بزم میں، اتنا تو برق نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

الغرض اس طرح کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں جہاں شعر بدل گئے ہیں یا شاعر، جس کے باعث حقیقت تک رسائی کے آثار خاصے دُھندلے دکھائی دیتے ہیں۔ اس ''کارروائی'' میں قوالوں اور معروف گلوکاروں نے بھی حسبِ توفیق بھرپُور حصہ ڈالا ہے، چنانچہ اکثر محققین پوچھتے پھر رہے ہوتے ہیں کہ غالب، بہادر شاہ ظفر یا فیض کی فلاں غزل میں جو یہ شعر گایا گیا ہے، یہ ان کے کس دیوان میں ملے گا؟ ان کی پریشانی جائز بھی ہوتی ہے کیونکہ وہ تمام دستیاب دیوان کھنگال چکے ہوتے ہیں۔

عام آدمی کو شعر سے غرض ہوتی ہے، شاعر سے نہیں، چنانچہ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ کیا کہا گیا ہے، جبکہ علمائے ادب کے نزدیک یہ بات انتہائی اہمیت رکھتی ہے کہ اصل شاعر کون ہے اور شعر کے اصل الفاظ کیا ہیں۔

اپنی بات کی تصدیق کے لئے یہاں مَیں نشاندہی بھی کیے دیتا ہُوں تا کہ پڑھنے والے اندازہ کر سکیں کہ یہ کس قدر تکلیف دہ کام ہے اور اتنی محنت اور غواصی کے باوجود اکثر اوقات غلطی کی صورت برقرار رہتی ہے۔ مثلاً

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ
سُن رکھو تم، فسانہ ہیں ہم لوگ

رجب علی بیگ سرور نے ''فسانۂ عجائب'' کے شروع میں دیا ہُوا ہے، اس لیے اکثر کتب میں یہ اُن کے نام سے ہی درج ہے، اور تو اور مرزا غالب نے میر تفتہ کے نام خط میں بھی اسے رجب علی بیگ سرور کے نام سے لِکھا ہے۔ بنارس یونیورسٹی کے سابق پروفیسر اور نامور محقق حنیف نقوی کی

مفصل تحقیق کے مطابق یہ شعر مصحفی کے شاگرد نُور الاسلام منتظر نقوی کا ہے۔ علاوہ ازیں اکثر کتابوں میں اس کا مصرعہ ثانی ''یاد رکھنا' فسانہ ہیں ہم لوگ'' لکھا ہوا ملتا ہے۔ غالب نے بھی اسی طرح نقل کیا تھا جبکہ اصل مصرعہ وہی ہے جو اوپر شعر میں دیا گیا ہے۔

شیخ ابراہیم ذوق کا یہ شعر

پُھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بِن کِھلے مُرجھا گئے

اسی طرح معروف ہے حالانکہ اس کا اصل مصرع اولیٰ یُوں ہے:

کِھل کے گُل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے

لیکن چونکہ یہ مصرعہ رواں دواں نہ تھا اور شعر کے ضرب المثل بننے میں رکاوٹ تھا' چنانچہ عوام نے اسے اپنے رندے سے درست کر دیا۔

خدا کی دَین کا موسیٰؑ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مِل جائے

یہ شعر بالعموم نواب آصف الدولہ سے منسوب ہے' لیکن قاضی عبدالودُود کی تحقیق کے مطابق یہ آغا علی خان مہر لکھنوی کے رسالے کی صورت میں شائع شدہ طویل سلسلۂ اشعار سے تعلق رکھتا ہے جن کے قوافی ''پری'' اور ''ہری'' وغیرہ ہیں اور ردیف ''ہو جائے'' ہے۔

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میر
یاد آئی مِرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

یہ شعر میر تقی میر سے منسوب ایک مشہور غزل کا مقطع ہے' لیکن حنیف نقوی کی تحقیق کے مطابق یہ شعر میر تقی میر کے صاحبزادے میر عسکری عرف میر کلُو عرش کا ہے۔ اُن کے مطبوعہ دیوان میں شامل ہے اور اس کی اصل صورت یہ ہے:

زندگی بھر نہ ملا' قبر پہ آیا آخر
کی مِرے درد کی عیسیٰ نے دوا میرے بعد

اس تحریر سے مقصد دوسروں کی غلطیاں پکڑنا نہیں' صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ خاصی الجھی ہوئی صورتِ حال ہے اور اس سلسلے میں حقیقت تک پہنچنے کی حتی الوسع کوشش ہی کی جا سکتی ہے جو بعض صورتوں میں ناکام اور بعض صورتوں میں غلَط بھی ہو سکتی ہے۔

اسی طرح مندرجہ ذیل اشعار آپ کو غلَط محسوس ہوں گے یا شاعر کا نام نادرست اور اجنبی' مگر صورتِ احوال یہ ہے کہ یہ درست ہیں اور جو مستعملِ عام ہیں وہ غلَط! (ایڈیٹر)

قتلِ حُسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد
(مولانا محمد علی جوہر)

پُھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر
(بھرتری ہری)

مکتبِ عشق کا دستور نرالا دیکھا
اُس کو چُھٹی نہ مِلے جس کو سبق یاد رہے
(میر طاہر علی رضوی طاہر)

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا' خدا مغفرت کرے!
(ذوق)

رنگ لاتی ہے حِنا پتھر پہ گھِس جانے کے بعد
سُرخرو ہوتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد
(غلام محمد مست کلکتّوی)

آپ ہی اپنے ذرا جَور و ستم کو دیکھیں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی
(میر وزیر علی صبا)

اہلِ دُنیا ہیں تمام اپنی غرض کے بندے
پڑ گئی جب کوئی مشکل تو خدا یاد آیا
(میر دوست علی خلیل)

اے شمع! صبح ہوتی ہے، روتی ہے کس لیے
تھوڑی سی رہ گئی ہے، اِسے بھی گزار دے
(حکیم آغا جان عیش)

اے صنم وصل کی تدبیروں سے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے
(مرزا محمد رضا برق)

اب بُوئے گُل، نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس[1] ہے کہ لُو کی دعا مانگتے ہیں لوگ
(نواب شبّیر حسن خاں)

دفعتاً ترکِ تعلق میں بھی رُسوائی ہے
اُلجھے دامن کو چُھڑاتے نہیں جھٹکا دے کر
(آرزو لکھنوی)

راہِ دورِ عشق میں روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیئے ہوتا ہے کیا
(میر تقی میر)

خط میں لکھے ہوئے غیروں کے سلام آتے ہیں
کس قیامت کے یہ نامے مِرے نام آتے ہیں
(داغ)

صرف اُس کے ہونٹ کاغذ پر بنا دیتا ہُوں مَیں
خود بنا لیتی ہے ہونٹوں پر ہنسی اپنی جگہ
(انور شعور)

داوَرِ حشر مِرا نامۂ اعمال نہ دیکھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں
(محمد دین تاثیر)

کہاں کے تھے، کہاں رکھّا ہُوا ہے
مگر خوش ہیں، جہاں رکھّا ہُوا ہے
(شوکت فہمی)

گاہے گاہے کی ملاقات ہی اچھی ہے امیر
قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا
(امیر مینائی)

مِری نمازِ جنازہ پڑھی ہے غیروں نے
مَرے تھے جن کے لیئے، وہ رہے وضو کرتے
(آتش)

وقت نے اُس کے مقدّر میں لکھی تاریکی
جِس نے چڑھتے ہوئے سُورج کی طرف داری کی
(محسن چنگیزی)

یہ چار دن کی رفاقت بھی کم نہیں اے دوست
تمام عمر بھلا کون ساتھ دیتا ہے
(غلام ربانی تاباں)

بیٹھ جاتا ہُوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریبُ الوطنی ہوتی ہے
(حفیظ جونپوری)

یہ مجھے چَین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا؟
(جون ایلیا)

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغِ آخرِ شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے
(ظہیر کاشمیری)

1۔ حبس کی ح اور ب پر زبر ڈال کر جو تلفظ بنتا ہے، وہ غلَط ہے۔

اردو کی اوّلیں ڈاکٹر

نُور السعید

خلائی سفر ہو، میدانِ جنگ یا علم و ادب کی دنیا، آج خواتین زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہی ہیں۔ اسلام میں بھی شریعت کے دائرے میں عورتوں کو بے حساب اور بے مثال مراعات حاصل ہیں۔ اسلامی تاریخ اس ضمن میں نہایت روشن ہے۔ اسی اسلامی شعور اور جدید افکار سے آگہی نے برِصغیر پاک و ہند کی مسلم خواتین میں بھی ہنر مندی، علمیت اور قابلیت کے جوہر دکھانے کا حوصلہ پیدا کیا۔ 1940ء کے بعد مسلمان خواتین میں علمی، ادبی اور قومی بیداری کا جذبہ اُبھرنے لگا۔ وہ جہالت، پس ماندگی، جبر و استبداد اور بے حسی کے اندھیروں سے باہر آنے لگیں۔ کلکتہ (حالیہ کولکاتا) کے سربرآوردہ سہروردیہ خاندان کی ایک معزز خاتون نے بھی علم و ادب کے حصول کے لیے اپنی روایات پر کاربند رہ کر زندگی کے مختلف میدانوں میں کامیابیاں حاصل کرنے کی مثال قائم کی۔

شائستہ اختر بانو 22 جولائی 1915ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئیں۔ گھر کے بعد ان کی ابتدائی تعلیم کلکتہ کے معروف سکولوں میں ہوئی۔ ان کی مذہبی تعلیم کی بنیاد بہت پختہ تھی۔ ان کے والدِ محترم نے انہیں دینی روایات کا پابند بنا دیا تھا کیونکہ نو برس کی عمر سے پردہ کی پابندی کرنا پڑی تھی، وہ گھر میں ہونے والی تقریبات کو بھی پردے کی آڑ سے دیکھا کرتی تھیں۔ یہاں سے شائستہ اختر بانو نے پردے کی آڑ سے دنیا کو دیکھنے کے آداب سیکھ لیے تھے۔ وہ اپنی کتاب ''پردہ سے پارلیمنٹ تک'' میں لکھتی ہیں: ''اس میں فنی مہارت کی کیا ضرورت ہوتی ہے؟ بس آپ دیکھ سکیں مگر آپ کو کوئی دیکھنے نہ پائے۔''

والدِ محترم نے انہیں دینی تعلیم اور اسلامی اقدار سے اچھی طرح واقف کر دیا تھا اور ان اقدار پر باعمل رہنے کی تلقین بھی کی تھی۔ انہیں کلاسیکی اردو سیکھنے کے لیے معیاری اساتذہ نامزد کیے گئے تھے۔ ان اساتذہ نے موصوفہ کو اردو، فارسی اور عربی زبان و ادب کی خاطر خواہ تعلیم دی۔ والد نے نہایت جرأت، عزم اور استقلال کے ساتھ شائستہ بیٹی کو 1927ء میں انگریزی سکول، لوریٹو ہاؤس، میں داخل کیا تھا۔ یہیں سے انہوں نے میٹرک کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور بعد ازاں کلکتہ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں بی اے آنرز کی ڈگری حاصل کی۔

تحریکِ آزادی کے دوران متحدہ ہندوستان میں سیاست محض مردوں کی میراث نہیں رہ گئی تھی، اس میں خواتین نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ شائستہ اختر بانو پر اپنے اسلاف کا اثر تھا، لہٰذا متحدہ ہندوستان میں جب تک قیام پذیر رہیں، سیاست میں حصہ لیتی رہیں۔ انہوں نے 1931ء میں خواتینِ ممالکِ متوسط کے روبرو اپنی اوّلیں دفاعی تقریر کی اور ان کا حوصلہ بلند کیا۔

1933ء میں والدین نے شائستہ اختر بانو کی شادی برار کے سپوت اکرام اللہ آئی سی ایس سے کر دی۔ شادی کے فوراً بعد اکرام اللہ کا تقرر دہلی میں ہو گیا تھا۔ یہاں پہلی مرتبہ شائستہ اکرام اللہ کو دہلی کے آداب و اطوار سے سابقہ پڑا اور دہلی میں قیام کے دوران انہیں تحریکِ آزادی کے

سرکردہ ارکان کو دیکھنے کا موقع ملا۔ 1937ء میں اکرام اللہ کا تبادلہ دہلی سے لندن ہوگیا۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل کے لیے سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز لندن میں پی ایچ ڈی کے لیے داخلہ لے لیا۔ شائستہ صاحبہ نے اپنے منتخبہ موضوع "A critical survey of the development of Urdu novel & short story" پر دو سال تک انتھک محنت کی اور 1939ء میں اپنا مقالہ لندن یونیورسٹی میں داخل کر دیا۔ یوں موصوفہ کو 1940ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل گئی۔ اس اعزاز کے ساتھ بیگم شائستہ اکرام اللہ برِصغیر پاک و ہند میں اردو ادب کی اوّلیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری یافتہ خاتون بن گئیں۔ یہ اعزاز موصوفہ کے لیے قابلِ فخر تھا کہ انہوں نے اپنا مقالہ انگریزی میں تحریر کیا تھا۔ یہ تحقیقی مقالہ کتابی شکل میں دو بار شائع ہو چکا ہے۔

جب دوسری جنگِ عظیم زوروں پر تھی، یورپی ممالک یکے بعد دیگرے جرمنی کے مطیع ہوتے جا رہے تھے، نازی ہٹلر کا جوش و خروش روز افزوں تھا، تو اسی عرصے میں ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ اپنے شوہر کے ہمراہ دہلی لوٹ آئیں۔ یہاں انہیں دہلی کے سیاسی اور سماجی ماحول میں تبدیلی نظر آئی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ برِصغیر پاک و ہند کی دو قوموں میں اتحادِ باہمی پاش پاش ہو چکا ہے اور دونوں میں رقابت کے آثار نمایاں ہیں۔ اس کے بعد موصوفہ کی ملاقات مسلم لیگ کے اہم لیڈروں سے ہوئی۔ ان ملاقاتوں سے ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ کے دل میں خود اعتمادی کے ساتھ مسلمانوں کے لیے حقوق طلبی کا جذبہ اُبھر آیا۔ وہ مسلمانوں میں خود اعتمادی کا جذبہ ابھارنے کی خواہش مند تھیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد اکرام اللہ کو کراچی میں دفترِ خارجہ کھولنے کے لیے نامزد کیا گیا۔ اکرام اللہ کی ہجرت کے ایک ماہ بعد ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ دہلی سے کراچی پہنچیں۔ انہوں نے تمام تر توجہ مہاجروں کی رہائش، روزمرہ کی ضروریات، تعلیمی مسائل اور مسلمانوں کی قدیم اقدار کے تحفظ کی طرف رکھی۔ انہوں نے مہاجروں کو روزی روٹی، میٹل ورکس، بُنائی اور دستکاری جیسے کاموں کی طرف رغبت دلائی اور ضروری سہولتیں مہیا کیں۔

ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ نے 1943ء میں قائدِ اعظمؒ کی موجودگی میں بڑی جوشیلی تقریر کی تھی۔ اس تقریر سے متاثر ہو کر قائدِ اعظمؒ نے اُنہیں مسلم لیگ کی رکن بنا لیا۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ کی تربیت اور رہنمائی میں ''مسلم ویمن سٹوڈنٹس فیڈریشن'' قائم کی۔ مسلم لیگ میں خواتین کے داخلے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحبہ 1946ء میں بنگال اسمبلی کی رکن نامزد ہوئیں لیکن کوئی سرکاری عہدہ قبول نہ کیا۔ 1947ء میں برِصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے دوران اکرام اللہ تقسیمِ ہند کمیٹی کے رکن نامزد ہوئے تھے۔ یہاں وہ غیر سرکاری طور پر علمی، آئینی و قانونی حوالوں سے اُن کا ہاتھ بٹاتی رہیں۔

ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ پاکستان قانون اسمبلی اور آئین ساز اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں، تو اسمبلی میں عورتوں کے بنیادی حقوق کے تحفظ کے لیے کوشاں رہ کر پاکستان کے دونوں حصوں کو برابر کے حقوق اور انصاف دلاتی رہیں۔ ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ کئی مرتبہ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں پاکستانی مندوب کی حیثیت سے بھی شامل ہوئیں اور عالمی حقوقِ انسانی کے لیے 1969ء تک سرگرم رہیں۔ 1964ء تا 1969ء مراکش میں پاکستان کی سفیر رہیں۔ انہوں نے مراکش کے معاشی حالات سدھارنے کے ساتھ ساتھ خواتین کی فلاح و بہبود کے کئی کارنامے انجام دیئے جنہیں مراکش کے علمی، سیاسی اور صحافتی حلقے آج بھی یاد کرتے ہیں۔

1958ء میں اردو لُغت بورڈ قائم ہوا تو ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ اپنی نمایاں علمی و ادبی خدمات کے باعث لغت بورڈ کی کمیٹی میں بطور رکن نامزد ہوئیں۔ بھرپور زندگی گزار کر کراچی میں سپردِ خاک ہوئیں۔

الفاظ کی جادوگری

لفظ ایک-تلفُّظ الگ- معانی مختلف

اَبا	والد	اَقدام	قدَم کی جمع	جِدّ	کوشش
اِبا	انکار	اِقدام	آغاز کرنا	جَدی	خط استوا کے جنوب میں فرضی متوازی خط
اَحرام	حرم کی جمع	اَمارَت	دولت مندی، امیری	جَدّی	آبائی
اِحرام	حج کا لباس	اِمارت	ریاست، حکومت	جُرم	قصور
اَتَم	مکمل، کامل	اِمارات	حکومت کی جمع	جِرم	جسم، مادی وجود
اُتم	اونچا	اَملاک	ملک کی جمع اثاثے	جَست	ایک دھات
اَسرار	سِر بمعنی راز کی جمع	اِملاک	ملکیت میں دینا	جَست	چھلانگ
اِسرار	بھید	آخِر	بعد کا	جُست	تلاش
اَشفاق	طلف وعنایت	اَخیر	سب سے پچھلا	جَگ	دنیا
اِشفاق	مہربانی کا برتاؤ	آذَر	شمسی سال کا نواں مہینہ	جَگ	پانی کا برتن (انگریزی)
اَشکال	صورتیں	آذَر	حضرت ابراہیم کے والد یا چچا کا نام	جُگ	زمانہ
اِشکال	دشواری	ثَقَل	سامان	جَگت	عالَم
اَعراب	عرب کے لوگ	ثِقل	بھاری پن	جُگت	ہنرمندی، طنز
اِعراب	زیر زبر وغیرہ لگانا	جَدّ	دادا	جَھک	فضول بات

جِھک	بےمقصد بحث	خِفاء	پردہ داری	سُدھارنا	درست کرنا		
جھّول	ڈھیلا پن	خَلَف	بیٹا	سِدھارنا	روانہ ہونا		
جُھول	پالان	اَخلاف	بیٹے، پوتے	صَدِیق	دوست، رفیق		
چَٹ پَٹ	فوراً	خَلف	پیچھے	صِدِیق	نہایت سچّا		
چُٹ پُٹ	متفرق چھوٹی موٹی اشیاء	خَنّاق	پھانسی لگانے والا	صَفَر	سال کا دوسرا مہینہ		
چنٹ	چالباز	خُنّاق	بچوں کے گلے کی بیماری	صِفَر	عددِ بے قیمت		
چُنّٹ	سلوٹ	خَیّام	خیمہ دوز	ضَلال	گُمراہی		
حَبّ	گولی، دانہ	خِیام	خیمہ کی جمع	ذُلال	نتھرا ہُوا		
حُب	محبت	دَہاڑ	شیر کی گرج	عَرض	چوڑائی		
حُسین	حضرت فاطمہؓ کے صاحبزادے کا نام	دھاڑ	ٹولا، گروہ	عَرض	درخواست، التجا		
حَسِین	خوبصورت	دھاڑا	ڈاکا	عَقد	نکاح		
حَصِین	مضبوط	ذَبح	حلال کرنا	عِقد	ہار		
حَکَم	ثالث، منصف	ذِبح	قربان شُدہ جانور	عَیّار	بدمعاش		
حُکم	فرمائش	رَسد	اشیاءضرورت کی دستیابی	عِیار	کسوٹی		
حِکَم	حکمت کی جمع	رَصَد	دُوربین کے ذریعے افلاک کا مشاہدہ	عَمد	اِرادہ		
خَبث	آلائش	زور	طاقت	قتلِ عَمد	جان بوجھ کر مارنا		
خُبث	کینہ	زُور	جھوٹ، فریب	عُمَد	بستی کے اہم لوگ		
خَفا	ناراض	زَخّار	لبالب	عَمائد	عُمد کی جمع		

عِیال	بال بچے	کِشت	کھیتی	لُغوی	لُغت یا لفظ سے متعلق
اَیال	گھوڑے کی گردن کے بال	کَندَن	کھودنا	لَیلیٰ	علَم، مجنوں کی محبوبہ کا نام
غَیض	کچا بچہ	کُندَن	سونا	لِیلا	تماشا
غَیظ	غضب، غُصہ	کُومَل	نقب	لَیلَہ	رات
فاسِخ	عہد شکنی کرنے والا	کومَل	نرم و نازک	مال	دولت، سامان
فاسِق	بداعمال	کھَرا	صاف، خالص	مآل	نتیجہ
فَرّار	تیز دوڑنے والا	کھرّا	لمبی چوڑی تحریر	مادَہ	جانوروں کی مؤنث
فِرار	بھاگ جانا	کُھرّا	ناہموار، کھُردرا	مادّہ	محسوس شے
قُوت	غذا	کُھرا	فرش پر بنی نہانے کی جگہ	مائدا	تھکا ماندا
قُوتِ یَمُوت	اتنی خوراک جو زندہ رکھ سکے	کُھرا	پاؤں کا نشان	ماندہ	بچا ہُوا
قُوّت	زور	گَذِیدَہ	ڈسا ہُوا	مَباحِث	موضوعات
کَرَم	مہربانی	گَذِیدہ	چُنا ہُوا	مُباحَثَہ	کسی مسئلے پر باہمی گفتگو
کِرم	کیڑا	لِسان	زبان	مُثبَت	موافق
کَثرت	زیادتی	لَسّان	بہت بولنے والا	مُثبِت	ثابت، قائم کرنے والا
کَسرَت	جسمانی ورزش	لَیس	آراستہ، تیار	مُثَبّت	نقش شدہ
کُشت	قتل	لیس	چپچپاہٹ	مَثَل	کہاوت، ضرب المثل
کُشت وخون	خون خرابہ	لیس	انگریزی میں جھالر	مَثَل	مثال
		لَغو	بے معنی	مِثل	بدل، نمونہ

محکمہ	شعبہ
محکمات	قرآن پاک کی آیات
مَدار	محور
مُدارا	خاطر تواضع
مَسکَن	جائے قیام
مُسکِّن	تسکین بخش
مُصنِّف	کتاب لکھنے والا
مُصنَّفہ	تصنیف کردہ
مُغنی	بے نیاز کرنے والا
مُغنّی	گانے والا
مَکاتِب	مکتبہ کی جمع
مَکاتیب	مراسلات
مَنش	آدمی
مَنِش	مزاج (آزادمنیش)
مَنثُور	نثری، منظوم کی ضِد
مَنشُور	نشر کردہ، رسمی اعلان
مُعَجّل	فوری
مُوَجَّل	ملتوی کردہ

مَلَکہ	مہارت، مشاقی
مَلِکہ	بادشاہ کی بیگم
مَیل	صاف کی ضد
مَیل	رغبت، رجحان
میل	موافقت، ملاپ
مِیل	1760 گز کا فاصلہ
نَذیر	خوف دلانے والا
نَظِیر	مثال
نَسخ	منسوخ کرنا عربی خط کی ایک طرز
نُسخ	نُسخہ کی جمع
نَشا	پنپنا، اُگنا
نَشہ	شراب یا غفلت پیدا کرنے والی شے کا اثر
نَفَس	سانس
نَفس	ذات، جی، من
نَیل	حصول، یافت
نَیلِ مرام	مراد پانا
بے نیلِ مرام	بغیر مُراد پائے

نِیل	کپڑے نیلے کرنے کا پاؤڈر
نُقطَہ	صفر کا نشان
نُکتہ	پُر معنی بات
نِکات	نُکتہ کی جمع
وتَر	کاشت کیلئے سیرابی
وَتَر	مثلث کے زاویہ قائمہ کے مقابل کا ضلع
وِتر	عِشا کی نماز کے آخر کی تین نفلی رکعتیں
ہَڑک	باؤلے کتے کے زہر کا اثر کر جانا
ہُڑک	اچانک اُٹھنے والی طلب
ہوش	اوسان، شعور
ہُوش	بے وقوف
یَمن	راگ کی ایک شکل
یُمن	نیک بختی، برکت
یَوَن	غیر ملکی حملہ آور
یُوں	اس طرح
یاد	قوتِ حافظہ
یادُاللہ	ملاقات

یہ گرانقدر تحریر جناب شان الحق حقی کی ''فرہنگِ تلفُّظ''، مطبوعہ مُقتدرہ قومی زبان سے ترتیب دی گئی

بیانِ فطرت

کوئی دیکھے تو ہے باریک فطرت کا حجاب اتنا
نمایاں ہیں فرشتوں کے تبسّم ہائے پنہائی

— اقبالؒ

نشانِ عظمت

کائنات کی ایک ایک شے اللہ تعالیٰ کی عظمت و قُدرت کا نشان ہے' اس سے جو کیفیت دلوں میں پیدا ہوتی ہے' وہی صحیح ایمان کی بنیاد ہے' ملاحظہ کیجئے یہ ایمان افروز معلومات

ترتیب وتاریر: **سُمیّہ گُل**

کائنات کی وسعت وعظمت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی عظمت کا عکس ہے۔ اپنی عظمت کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمارے اپنے اندر کی دنیا اور باہر کی ساری کائنات کے مطالعے پر بہت زور دیا ہے۔ انسانی جسم اور کائنات کے بارے میں جو معلومات آج تک انسان نے حاصل کی ہیں' ان کا ایک مختصر سا جائزہ پیشِ خدمت ہے۔

انسانی جسم

انسان کا اپنا وجود اپنے جسم کے اعتبار سے اگرچہ بہت بڑا نہیں' مگر اس کی ساخت پر غور کیجئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس جیسی مشین آج تک کوئی نہیں بنا سکا' نہ کبھی بنا سکے گا۔ پھر اَربوں انسانوں میں سے کوئی ایک دوسرے کی مکمل کاپی نہیں ہوتا۔ ایک عجیب وغریب اور وسیع وعریض کائنات کو اس میں سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔

جسمِ انسانی چھوٹے چھوٹے خلیات سے مل کر بنتا ہے۔ ایک اوسط قد وقامت کے انسانی جسم میں اِن خلیات کی تعداد ایک کروڑ اَرب ہوتی ہے۔ یہ تمام اَربوں کھربوں خلیے ایک ہی خلیے سے بنے ہوتے ہیں۔ کروڑوں خلیے روزانہ ختم ہوتے ہیں اور دوسرے خلیے اسی وقت اُن کی جگہ لے لیتے ہیں۔

اندازہ ہے کہ ہر سیکنڈ میں خون کے دس لاکھ سرخ خلیات ختم ہو جاتے اور اِسی تعداد میں نئے خلیات جنم لیتے ہیں۔ ان تمام اَربوں' کھربوں خلیوں کا آپس میں اتنا اتفاق ہوتا ہے کہ ہر ایک اپنا کام بڑی ذمہ داری اور صحت کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ ہر خلیہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کس طرح اس نے سارے بدن کی بہتری کے لیے اپنے حصے کا کام کرنا ہے۔

یہ خلیے ایک مکمل بند شہر کی طرح ہیں۔ اس کی توانائی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے یہ بجلی گھروں کی طرح جنریٹر کا کام کرتے ہیں۔ اِن کی فیکٹریوں میں کیمیائی اجزاء تیار ہوتے ہیں۔ اس تیار شدہ سامان کو جسم کے تمام حصوں میں پہنچانے کا انتظام بھی ہے۔ خطرہ یا نقصان پہنچنے پر اس سے بچاؤ کے لیے دفاعی اقدامات کئے اور احکام جاری ہوتے ہیں۔

خلیے مختلف شکل' جسامت اور مختلف خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ اِن میں نازک خلیے بھی ہیں جن کی جسامت ملی میٹر کے دس لاکھویں حصے کے برابر ہے۔ ہر گیارہ ماہ بعد کھربوں خلیوں پر مشتمل تمام نظام بدل جاتا ہے۔ پھر خود خلیوں کے اندر ہزار ہا جین ہوتے ہیں۔ ہر جین ایک عجیب وغریب مالیکیول سے بنتا ہے جسے DNA کہا جاتا ہے۔ اس کے اربوں یونٹ ایک خلیے میں ہوتے ہیں۔ ہر فرد کی پوری زندگی کا مکمل لائحہ عمل' قد' رنگ' بالوں کا رنگ اور جسامت پہلے ہی سے DNA کی ٹیپ میں ریکارڈ ہوتا ہے۔ DNA جو ایک عام خُردبین سے دیکھا بھی نہیں جا سکتا' کی تفصیلات اگر تحریر میں لائی جائیں تو بڑے سائز کے ایک لاکھ صفحات میں سمائیں۔

ہمارے دماغ میں تقریباً ایک اَرب Nerve Cells ہیں۔ ہر Cell سے باریک تار نکل کر تمام جسم کے اندر پھیلے ہوتے ہیں جن کو Nerve Fibres

(عصبی ریشے) کہتے ہیں۔ان پتلے ریشوں پر وصول کرنے اور حکم بھیجنے کا ایک نظام انتہائی تیز رفتار سے دوڑتا رہتا ہے۔انہی اعصاب کے ذریعے ہم چکھتے' سُنتے' دیکھتے' محسوس کرتے اور عمل کرتے ہیں۔اس مواصلاتی نظام پر دن رات کروڑوں خبریں اِدھر سے اُدھر دوڑتی رہتی ہیں جو دِل کو بتاتی ہیں کہ وہ کب دھڑکے۔مختلف اعضاء کو حکم دیتی ہیں کہ وہ کب حرکت کریں۔پھیپھڑوں سے کہتی ہیں کہ وہ کیسے اپنا عمل کریں۔ساری دُنیا کا ٹیلیفون کا نظام بھی اس کے برابر کام نہیں کرسکتا۔اگر جسم کے اندر یہ مواصلاتی نظام نہ ہوتو ہمارا پُورا وجود منتشر چیزوں کا مجموعہ بن جائے جن میں سے ہر ایک اپنے الگ الگ راستے پر چل رہا ہو۔

ہمارا دِل تقریباً ایک پاؤ وزنی ہوتا ہے' اِس میں دو پمپ ہوتے ہیں۔ایک پھیپھڑوں کو خون بھیجنے کے لیے تاکہ وہاں سے آکسیجن جذب کر سکے' دوسرا اِس صاف شدہ خون کو سارے بدن میں دوڑانے کے لیے۔ایک آدمی کی اوسط زندگی میں دل تین لاکھ ٹن خون پمپ کرتا ہے۔اس کے علاوہ اپنی بجلی خود ہی پیدا کرتا ہے۔آدمی اگر ستّر سال زندہ رہے' تو دل تین اَرب دفعہ دھڑکتا ہے۔

انسان کی اوسط زندگی میں پھیپھڑے پچاس کروڑ مرتبہ پُھولتے اور سکڑتے ہیں۔انسان کی بنائی ہوئی کوئی مشین نہ ایسی مشقت مسلسل برداشت کرسکتی ہے اور نہ ہی بغیر مرمت اتنے لمبے عرصے تک اپنا کام جاری رکھ سکتی ہے۔

ہماری آنکھ میں روشنی قبول کرنے والے ایک کھرب سے زیادہ ریشے اور تیرہ کروڑ Nerve Fibres ہوتے ہیں جو تصویری مجموعے دماغ کو بھیجتے ہیں۔نیز آنکھ کے مَسل دن میں ایک لاکھ سے زیادہ دفعہ حرکت کرتے ہیں۔

انسانی جسم تیس کروڑ سے زیادہ کیمیائی اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے۔اس کی مثال یوں ہے کہ اگر آپ ان اعداد وشمار پر مشتمل اجزاء کو لفظوں میں لکھنا چاہیں تو اس سے دس ہزار موٹی کتابوں کی ایک لائبریری بن جائے گی۔

ہماری زبان میں دس ہزار ذائقہ خانے (taste buds) ہیں جن میں سے ہر ایک اپنے علیحدہ عصبی تار کے ذریعے دماغ سے جڑا ہُوا ہے۔اِنہی کے ذریعے وہ ہر قسم کے ذائقوں کو محسوس کرتا ہے۔

ہمارے کان میں ایک لاکھ کی تعداد میں سماعتی خانے ہوتے ہیں۔انہی سے ہمارا دماغ ایک نہایت پیچیدہ عمل کے ذریعے سنتا ہے۔

ہماری تمام جلد میں حسیاتی ریشوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔اگر گرم چیز جلد کے سامنے لائی جائے تو تقریباً تیس ہزار گرم خانے اِس کو محسوس کر کے فوراً دماغ کو اس کی خبر دیتے ہیں۔گرمی کی خبر دماغ کو ملتے ہی پسینے کے غدود پسینہ خارج کرنا شروع کر دیتے ہیں جو تحلیل ہو کر جسم کو ٹھنڈک مہیا کرتا ہے۔اسی طرح جلد میں اڑھائی لاکھ خانے ایسے ہیں جو سرد چیزوں کو محسوس کرتے ہیں۔جب کوئی سرد چیز جسم سے چھوتی ہے تو دماغ اِس کی خبروں سے بھر جاتا ہے۔جسم کانپنے لگتا ہے' جلد کی رگیں پھیل جاتی ہیں اور فوراً مزید خون اِن رگوں میں دوڑ کر آتا ہے تاکہ زیادہ گرمی پہنچائی جاسکے۔

عصبی نظام کی کئی قسمیں ہیں۔ان میں سے ایک Autonomic Branch ہے۔یہ ایسے کام انجام دیتی ہے جو خود بخود جسم کے اندر ہوتے رہتے ہیں' مثلاً ہضم کرنا' سانس لینا اور دل کی حرکت وغیرہ۔پھر اس عصبی شاخ کے بھی دو حصے ہیں:

ایک کا نام Sympathetic System ہے جو حرکت پیدا کرتا ہے اور دوسرا Parasympathetic System ہے جو روک تھام کا کام کرتا

ہے۔اگر جسم تمام تر پہلے نظام کے قابو میں چلا جائے مثلاً دل کی حرکت اتنی تیز ہو جائے کہ موت آ جائے اور اگر بالکل دوسرے کے اختیار میں آ جائے تو دل کی حرکت ہی رک جائے۔دونوں شاخیں نہایت درستگی کے ساتھ مل کر اپنا اپنا کام کرتی ہیں۔ اسی طرح نیند کے وقت Parasympathetic کا غلبہ ہوتا ہے' جبکہ جسمانی حرکتوں پر سکوت طاری کر دیتا ہے۔

نظامِ کائنات

ہماری زمین جس نظامِ شمسی میں شامل ہے'اس کی وسعت کا یہ حال ہے کہ زمین سورج سے صرف پندرہ کروڑ کلومیٹر دُور ہے جبکہ پلوٹو سیارے کا سورج سے فاصلہ پندرہ اَرب کروڑ کلومیٹر ہے۔

ہماری زمین کا قُطر 12784 کلومیٹر ہے۔سورج کا قُطر چودہ لاکھ کلومیٹر ہے'یعنی زمین سے 109 گُنا بڑا۔قُطر کی یہ وسعت تو کچھ بھی نہیں' ہماری کہکشاں کا قُطر ایک لاکھ اکہتر کھرب کلومیٹر ہے۔اس کہکشاں میں ایک کھرب ستارے پائے جاتے ہیں۔ اب تک ایسی کھرب سے زائد کہکشائیں دریافت ہو چکی ہیں۔

سائنسدانوں کا خیال ہے کہ کائنات کے درمیان ایک کہکشاں ایسی ہے جس کے گرد تمام کہکشائیں چکر کاٹ رہی ہیں۔اِن کا ایک چکر پچیس کروڑ سال میں پورا ہوتا ہے۔

سورج کا وزن دس کھرب 19889x کھرب ٹن ہے یعنی زمین سے تقریباً سوا تین لاکھ گُنا زیادہ ۔ درجہ حرارت تقریباً ڈیڑھ کروڑ ڈگری سنٹی گریڈ ہے۔اس میں چالیس لاکھ ٹن ہائیڈ روجن گیس فی سیکنڈ استعمال ہوتی ہے اور اس کی سطح کا درجہ حرارت چھ ہزار ڈگری سینٹی گریڈ ہے۔ سورج کی حرارت ابھی مزید پانچ ارب سال کے لیے کافی ہے۔

> سورج ہماری زندگی کا سرچشمہ ہے' اِس کی حرارت اتنی زیادہ ہے کہ بڑے بڑے پہاڑ بھی اس کے سامنے جل کر راکھ ہو جائیں مگر وہ ہماری زمین سے اتنے مناسب فاصلے پر ہے کہ یہ کائناتی انگیٹھی' ہمیں ہماری ضرورت سے ذرا بھی زیادہ گرمی نہ دے سکے۔اگر سورج دُگنے فاصلے پر چلا جائے تو زمین پر اتنی سردی پیدا ہو جائے کہ ہم سب لوگ جم کر برف بن جائیں اور اگر وہ آدھے فاصلے پر آ جائے تو زمین پر اتنی حرارت پیدا ہوگی کہ تمام جاندار اور درخت جل بھن کر راکھ بن جائیں گے۔

ہماری کہکشاں کا وزن سورج سے چار کھرب گُنا زیادہ ہے اور اِس کا فاصلہ کائنات کے مرکز سے اڑھائی لاکھ ضرب دس کھرب کلومیٹر ہے۔

سب سے روشن کہکشاں کی مجموعی روشنی سورج سے تین ہزار کھرب گُنا زیادہ ہے۔

سب سے لمبی کہکشاں کی لمبائی تقریباً ایک ارب ضرب دس کھرب کلومیٹر اور موٹائی دس کھرب ضرب پانچ کروڑ تیس لاکھ کلومیٹر ہے۔اس کی روشنی بیس کھرب سورجوں کی روشنی کے برابر اور اس کا قُطر ہماری کہکشاں سے اسّی گُنا زیادہ ہے۔روشنی ایک شمسی سال میں تقریباً تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے پچانوے کھرب کلومیٹر فاصلہ طے کرتی ہے' اسے نوری سال کہا جاتا ہے اور یہ کہکشاں ہماری زمین سے ایک اَرب سات کروڑ نوری سال دُور ہے۔

اگر تمام ستارے ایک جیسے فاصلے سے دیکھے جا سکیں تو Eta Carinae سب زیادہ روشن ہوگا۔اس کی روشنی سورج سے 65 لاکھ گنا زیادہ ہے۔

1989ء میں فلکیات دانوں نے خلاء میں عظیم دیوار (Great Wall) کی دریافت کا اعلان کیا۔یہ کہکشاں کا مجموعہ ہے۔اس کی لمبائی دس کھرب ضرب ساڑھے سات ارب کلومیٹر ہے۔اس کی چوڑائی دس کھرب ضرب 2.6 ارب

کلومیٹر ہے اور اس کی گہرائی دس کھرب ضرب بائیس کروڑ کلومیٹر ہے۔

اب تک جو کائنات معلوم ہوئی ہے' اسے اگر مکعب کلومیٹر میں ناپا جائے (ایک مکعب کلومیٹر ایک کلومیٹر لمبائی' ایک کلومیٹر چوڑائی اور ایک کلومیٹر اونچائی ہے) تو پوری معلوم کائنات کا گھیرا نکالنے کے لیے ایک کے آگے 69 صفر لگانے پڑیں گے تب حساب پورا ہوگا۔ اس کے باوجود کائنات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ مسلسل انتہائی تیز رفتاری سے مزید پھیل رہی ہے۔

اندازہ ہے کہ ایک کہکشانی نظام ایسا ہے کہ اس کی جو شعاعیں اس کہکشاں سے چار ارب نوری سال پہلے روانہ ہوئی تھیں' وہ آج ہم تک پہنچی ہیں۔ یعنی اس کہکشاں کی روشنی نے زمین تک پہنچنے کے لیے چار ارب ضرب پچانوے کھرب کلومیٹر فاصلہ طے کیا ہے۔

ہماری قریب ترین کہکشاں Andromedo Galaxy M31 ہے۔ اس کا ہماری کہکشاں سے فاصلہ 22 لاکھ ضرب 95 کھرب کلومیٹر ہے۔ اس کا وزن تین کھرب سورجوں کے برابر اور اس کا قُطر 13000 ضرب 95 کلومیٹر ہے۔ اس کا حجم ہماری کہکشاں سے دُگنا ہے۔ اس میں تقریباً چار کھرب ستارے ہیں۔

بعض کہکشاؤں کا قُطر دو ہزار سے آٹھ لاکھ نوری سال' وزن دس لاکھ سے ایک سو کھرب سورجوں کے برابر اور روشنی دس لاکھ سے ایک کھرب سورجوں کی روشنی کے برابر ہے۔

کہکشائیں کیا سب سے بڑی چیزیں ہیں؟

جی نہیں! کہکشائیں مل کر Cluster بناتی ہیں۔ Cluster میں سینکڑوں سے لے کر ہزاروں کہکشائیں ہو سکتی ہیں۔ ہماری کہکشاں جس Cluster میں ہے' یہ تیس کہکشاؤں کا مجموعہ ہے جبکہ Spiral Galaxy M100 تقریباً 2500 کہکشاؤں کا مجموعہ ہے۔ Super Cluster درجنوں Clusters پر مشتمل ہوتا ہے۔ ابھی تک دِکھائی دینے والی کائنات میں تقریباً دس لاکھ Super Cluster ہیں۔

ایک Cluster کی کہکشاؤں کا آپس میں فاصلہ 10 لاکھ x95 کھرب کلومیٹر سے 20 لاکھ ضرب 95 کھرب کلومیٹر تک ہے۔ Cluster کے درمیان آپس کا فاصلہ اس سے سوگُنا زیادہ ہے۔ Spherical Cluster میں دس ہزار کہکشائیں ہیں۔

Quasars کائنات کے اب تک دریافت شدہ روشن ترین اجسام ہیں۔ زیادہ ہونے کی وجہ سے یہ بھی چھوٹے ستاروں کی طرح نظر آتے ہیں۔ ان کی روشنیاں جو آج ہم تک پہنچی ہیں' یہ دراصل دس ارب سال پہلے وہاں سے چلی تھیں۔ ہمارے نظامِ شمسی جتنا Quasar دس کھرب سورجوں سے زیادہ روشن جبکہ ہماری کہکشاں کی مجموعی روشنی سے سوگنا زیادہ ہوتا ہے۔ Quasar3cg دس سے سولہ ارب نوری سال کے فاصلے پر ہے۔

اگر ہم سات ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کریں تو کائنات عبور کرنے میں تین ہزار کھرب سال لگیں گے' وہ بھی اگر کائنات محدود ہو تو' جبکہ کائنات لامحدود ہے۔

زمین اپنے محور کے گرد ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے لٹو کی مانند گھوم رہی ہے۔ اگر زمین کی رفتار ایک سو میل فی گھنٹہ ہوتی تو ہمارے دن اور رات موجودہ دن اور رات سے دس گُنا زیادہ لمبے ہوتے۔ زمین کی تمام ہریالی اور ہماری فصلیں سو گھنٹے کی مسلسل دھوپ میں جھلس جاتیں اور جو بچ رہتیں' وہ لمبی سرد رات میں سردی کی نذر ہو جاتیں۔

اگر زمین کی اوپری پرت صرف دس فٹ اور موٹی ہوتی تو ہماری فضا میں آکسیجن کا وجود نہ ہوتا' جس کے بغیر زندگی ناممکن ہوتی۔ اسی طرح اگر

سمندر چند فٹ اور گہرے ہوتے تو وہ کاربن ڈائی آکسائیڈ اور آکسیجن جذب کر لیتے اور زمین کی سطح پر کسی قسم کی نباتات زندہ نہ رہ سکتیں۔ اگر آکسیجن 21 فی صد کی بجائے 50 فیصد یا اس سے زیادہ مقدار میں فضا کا جزو ہوتی، تو سطحِ زمین کی تمام چیزوں میں آتش پذیری کی صلاحیت اتنی بڑھ جاتی کہ ایک درخت کے آگ پکڑتے ہی سارا جنگل بھک سے اُڑ جاتا۔

زمین کا کرّہ فضا میں سیدھا نہیں کھڑا بلکہ تئیس درجے کا زاویہ بناتا ہُوا ایک طرف جھکا ہُوا ہے۔ یہ جھکاؤ ہمیں ہمارے موسم دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں زمین کا زیادہ سے زیادہ حصہ آبادکاری کے قابل ہو جاتا ہے اور مختلف نباتات اور پیداوار حاصل ہوتی ہیں۔

چاند ہم سے تقریباً 384,400 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس کی بجائے اگر وہ صرف پچاس ہزار کلومیٹر دور ہوتا تو سمندروں میں مدّوجزر کی لہریں اتنی بلند ہوتیں کہ تمام کرۂ ارض دن میں دو بار پانی میں ڈوب جاتا اور بڑے بڑے پہاڑ موجوں کے ٹکرانے سے رگڑ کھا کر ختم ہو جاتے۔ چاند کی اس مناسب کشش کی وجہ سے سمندروں کا پانی متحرک رہتا ہے، اسی وجہ سے پانی صاف ہوتا رہتا ہے۔

سورج اپنی غیر معمولی کشش سے ہماری زمین کو کھینچ رہا ہے اور زمین ایک مرکز گریز قوت کے ذریعے اس کی طرف کھنچ جانے سے اپنے آپ کو روکتی ہے۔ اس طرح وہ سورج سے دور رہ کر فضا کے اندر اپنا وجود باقی رکھے ہوئے ہے۔ اگر کسی دن زمین کی یہ قوت ختم ہو جائے تو وہ انتہائی تیز رفتاری سے سورج کی طرف کھنچنا شروع ہو جائے گی اور چند ہفتوں میں سورج کے اندر اس طرح جا گرے گی جیسے کسی بہت بڑے الاؤ کے اندر کوئی تنکا گر جائے۔

زمین کے گرد ہوا کا غلاف اس انداز سے رکھا گیا ہے کہ زمین پر اس کا دباؤ مناسب رہے تاکہ انسان سانس لینے میں دُشواری محسوس نہ کرے اور باہر سے آنے والے شہابِ ثاقب رگڑ سے ہی جل جائیں۔ شہابِ ثاقب ہر روز اوسطاً دو کروڑ کی تعداد میں چھ سے چالیس میل فی سیکنڈ کی رفتار سے کرۂ ہوائی (ہوا کے غلاف) میں داخل ہوتے ہیں۔ اگر یہ غلاف موجودہ کی نسبت لطیف ہوتا تو شہابِ ثاقب زمین کے اوپر ہر آتش پذیر مادے کو جلا دیتے اور سطحِ زمین کو چھلنی کر دیتے۔ اگر زمین کے اوپر سے ہوا کا یہ غلاف کھینچ لیا جائے تو تمام جاندار آکسیجن نہ ہونے کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں۔

اگر زمین کا حجم کم یا زیادہ ہوتا تو اِس پر زندگی محال ہو جاتی۔ مثلاً اگر زمین کا قُطر موجودہ کی نسبت چوتھائی ہوتا تو کششِ ثقل کی اس کمی کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ پانی اور ہوا کو اپنے اوپر روک نہ سکتی، جیسا کہ جسامت کی اِس کمی کی وجہ سے چاند میں واقع ہُوا ہے۔ چاند پر اس وقت نہ تو پانی ہے اور نہ کوئی ہوائی کرّہ ہے۔ ہوا کا غلاف نہ ہونے کی وجہ سے وہ رات کے وقت بے حد سرد ہو جاتا ہے اور دن کے وقت تنور کی مانند جلنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس اگر زمین کا قطر موجودہ کی نسبت دُگنا ہوتا تو اس کی کششِ ثقل دُگنی ہو جاتی جس کے نتیجے میں ہوا، جو اس وقت زمین کے اوپر پانچ سو میل کی بلندی تک پائی جاتی ہے، وہ کھنچ کر بہت نیچے تک سمٹ آتی۔ اس کے دباؤ میں فی مربع انچ پندرہ تا تیس پونڈ کا اضافہ ہو جاتا، جس کا ردِعمل مختلف صورتوں میں زندگی کے لیے نہایت مہلک ثابت ہوتا۔ اگر زمین سورج جتنی بڑی ہوتی تو اس کی کششِ ثقل ڈیڑھ سو گُنا بڑھ جاتی۔ ہوا کے غلاف کی موٹائی گھٹ کر پانچ سو میل کی بجائے صرف چار میل رہ جاتی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ہوا کا دباؤ ایک ٹن فی مربع انچ تک جا پہنچتا۔ اس غیر معمولی دباؤ کی وجہ سے زندہ اجسام کی نشوونما ممکن نہ رہتی۔ ایک پونڈ وزنی جانور اور اِس میں کسی

قسم کی ذہنی زندگی ناممکن ہو جاتی کیونکہ انسانی ذہانت حاصل کرنے کے لیے بہت کثیر مقدار میں اعصابی ریشوں کی موجودگی ضروری ہے اور اس طرح پھیلے ہوئے ریشوں کا نظام ایک خاص درجے کی جسامت ہی میں پایا جاسکتا ہے۔

دعوتِ غور فکر

اس کائنات اور انسان کے اپنے وجود کے اندر خالقِ کائنات نے اپنی جواَن گنت نشانیاں پھیلا دی ہیں' ان پر غور وفکر اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج پر عمل ہی حصولِ ایمان کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے یہ ناممکن نہ تھا کہ ہماری غذا کے لیے براہِ راست آسمان سے روٹی برستی۔ پھر یہ کیوں ضروری ہوا کہ ہوائیں چلیں' بادل اُٹھیں' مینہ برسے' کھیتوں میں ہل چلیں' گندم بوئی جائے، خوشے نمودار ہوں' پھر اِن میں دانے بیٹھیں' پھر گرم وخشک ہوائیں چلیں جو اِن دانوں کو پکائیں اور اِس طرح کئی ماہ کے گرم وسرد مراحل سے گزر کر گندم کا دانہ کھیت سے کسان کے گھر پہنچے۔

یہ دُنیا بالکل سادہ اور بے رنگ بھی تو ہوسکتی تھی۔ ہمارے آگے قسم قسم کے پھل پھول' سمندر' ستارے اور بیج سے لے کر درخت بننے تک کے مرحلے سب انسان کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ انسان کائنات کے جس گوشے پر نظر ڈالتا ہے' اگر آنکھیں کھلی اور دل بیدار ہو تو معرفتِ الٰہی کا ایک دفتر کھل جاتا ہے۔ ایک ایک شے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے نجانے کتنے بھیس بدلتی ہے تاکہ ہم اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو دیکھیں اور ان سے سبق حاصل کریں۔

کائنات کی اِن تمام حقیقتوں پر غور وفکر کے نتیجے میں خالقِ کائنات کی عظمت وقدرت کا جو احساس اور جو پہچان حاصل ہوتی اور جو کیفیت قلب میں پیدا ہوتی ہے' وہ صحیح ایمان کی بنیاد ہے۔ اپنے رب کو پہچان کر اُس کا قرب محسوس کر کے ایسا سکون محسوس ہوتا ہے جس کے مقابلے میں دنیا بھر کی نعمتیں ہیچ نظر آتی ہیں۔ یہ ایمان دلوں کو سکون سے بھر دے گا اور ''کیا اللہ اپنے بندے کیلئے کافی نہیں؟'' کی صدا اپنی شہ رگ سے آتی محسوس ہوگی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> بے شک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں اور جہازوں میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں انسانوں کے نفع کی چیزیں لے کر اور (بارش) کے پانی میں جس کو اللہ نے آسمان سے برسایا اور پھر اس سے زمین کو تروتازہ کیا اس کے خشک ہونے کے بعد اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلانے میں اور ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں' عقل مندوں کے لئے اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔ (سورۃ البقرۃ- آیت:164)

استفادہ

انسانی جسم اور کائنات کے متعلق یہ ایمان افروز حقائق مندرجہ ذیل کتب اور CDs سے لیے گئے ہیں:

مصنف نامعلوم' مطالعۂ فطرت اور ایمان۔ فضلی سنز لمیٹڈ' کراچی' 1985

Guiness Book of World Records,1996

Microsoft Encarta, 1999

History of Universe, 2002

Groliers Encyclopedia, 2001

Encyclopedia Britanica, 2009

اللہ کی شان

سیّد قطب شہید کی تفسیر میں شامل ایک باب کا ترجمہ پڑھئے اور اپنے رب کی شان کے تصوّر سے ایمان تازہ کیجئے

پرندوں میں وطن لوٹنے کی خصوصی مہارت اور صلاحیت پائی جاتی ہے' ایک خاص چڑیا جو دروازوں پر گھونسلے بناتی ہے' خزاں کے موسم میں جنوب کی طرف ہجرت کر جاتی اور اگلے سال بہار میں اپنے اسی مقام کی طرف لوٹ آتی ہے۔ ستمبر کے مہینے میں امریکہ کے اکثر پرندے جنوب کی طرف جاتے ہیں۔ وہ سمندروں اور صحراؤں پر سے پرواز کرتے ہوئے ہزاروں میل سفر کرتے ہیں' جب ان کو پیغام دے کر چھوڑا جاتا ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حیران ہو کر چکر لگاتے اور اس کے بعد سیدھے اپنے وطن کی طرف پرواز کرتے ہیں' کبھی راہ نہیں بھٹکتے۔ شہد کی مکھی اگر کسی طرف جائے اور اس کے پیچھے نشاناتِ راہ کسی طوفان کی وجہ سے مٹ جائیں تو بھی وہ راہ نہیں بھولتی' سیدھی چھتے میں آ جاتی ہے۔ البتہ انسان کے اندر اس صلاحیت کی کمی ہے۔ اس کمی کو وہ آلات اور عقل کے ذریعہ پورا کر لیتا ہے۔ باریک کیڑے مکوڑے بھی نہایت ہی چھوٹی اور خُرد بینی آنکھیں رکھتے ہیں۔ یہ ہر طرح سے مکمل آنکھیں ہوتی ہیں۔ باز اور عقاب وغیرہ کی آنکھیں دوربین کی طرح ہوتی ہیں' انسانی آنکھ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کمی کو بھی عقل و تجربے نے پورا کیا ہے۔ چنانچہ ان دوربینوں کے ذریعے انسان سیاروں تک کو دیکھ لیتا ہے' اس نے ان کے دیکھنے کے لیے انسانی نظر کو بیس لاکھ گُنا تیز کیا۔ انسان نے ایسی خردبینیں ایجاد کیں جن کے ذریعے وہ بیکٹیریا اور دوسرے نظر نہ آنے والے کیڑے مکوڑے بھی دیکھ سکتا ہے۔

کبھی بوڑھے گھوڑے کو راستے پر چھوڑ دیں۔ جس قدر بھی اندھیرا ہو' وہ راستہ نہ بھولے گا۔ اگرچہ بہت واضح نہ سہی' سخت تاریکی میں بھی دیکھ سکتا ہے۔ وہ راستے میں اور اس کے دونوں جانب درجہ حرارت کا احساس بھی کر سکتا ہے۔ یہ درجہ حرارت اس کی آنکھیں انفراریڈ شعاعوں کے ذریعہ معلوم کر لیتی ہیں۔ اُلّو گرم چوہے کو سرد گھاس کے نیچے چلتا پھرتا دیکھ لیتا ہے' بے شک سخت اندھیرا ہو۔ انسان نے تو بجلی کے قمقموں کے ذریعے تاریک رات کو دن بنا دیا ہے۔

شہد کی مکھیوں کی دنیا بھی عجیب ہے۔ کارکن مکھیاں چھتے میں مختلف قسم کے کمرے بناتی ہیں۔ یہ تربّیت کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ چھوٹے کمرے کارکنوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور بڑے کمرے نر مکھی اور ملکہ کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ یہ ملکہ مکھی جب غیر بارآور انڈہ دیتی ہے' تو اسے نر مکھی کی کمرے میں رکھ دیتی ہے۔ جب بارآور انڈہ دیتی ہے' تو اسے اس کمرے میں رکھ دیتی ہے جس میں مؤنث کارکن مکھیاں ہوتی ہیں جو آگے جا کر ملکہ مکھی بننے والی ہوتی ہیں۔ کارکُن مکھیاں جو مزدور ہوتی ہیں' ایک عرصے تک نسل تیار کرنے کا کام کر لیتی ہیں تو ان کو بدل دیا جاتا ہے۔ یہ کارکن مکھیاں اپنے بچوں کے لیے غذا تیار کرنے کا کام بھی کرتی ہیں۔ یہ شہد اور پھولوں کو چبا کر ہضم کے قابل بناتی ہیں۔ بچوں کے اندر نر اور مادے کا ظہور ہو جاتا ہے تو یہ مذکورہ بالا طریقے سے غذا ہضم کے لیے تیار کرنے کا عمل ترک کر دیتی ہیں۔ اس کے بعد ان کو شہد اور پھولوں کا بُور

دیا جاتا ہے۔ بچوں میں سے مؤنث اس طریقے سے تربیت پاتی ہیں' وہ بعد میں کارکن مکھیاں بن جاتی ہیں۔ جو مؤنث مکھیوں کے کمروں میں ہوتی ہیں' ان کو شہد اور پھولوں کے بورے کو ابتدائی طور پر قابلِ ہضم بنا کر غذا دینے کا سلسلہ جاری رکھا جاتا ہے' اور جن مؤنث مکھیوں سے ایسا سلوک کیا جاتا ہے بعد میں وہ ملکہ مکھی بن جاتی ہیں۔ صرف ملکہ ہی ایسے انڈے دیتی ہیں جن سے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے لیے خاص قسم کے کمروں' خاص قسم کے انڈوں اور خاص قسم کی غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔

غذا میں تبدیلی کا اثر بھی عجیب ہوتا ہے۔ اس قسم کی ٹیکنالوجی کے لیے مکھیوں کو طویل عرصہ تک انتظار کی ضرورت پڑی ہوگی جنہوں نے ان اصولوں کے اندر تمیز کر کے ان کو نافذ کیا ہوگا۔ غذا کے اثرات معلوم کیے ہوں گے اور اُن اثرات کو اجتماعی طور پر نافذ کیا ہوگا جو اُن کے وجود کے لیے ضروری ہوگا۔ مکھیوں نے جب اجتماعی زندگی کا آغاز کیا ہوگا' تب ان کو یہ اصول معلوم ہوئے ہوں گے' کیونکہ مکھی کے وجود اور زندگی کی بقا کے لیے ان اصولوں کی دریافت ضروری تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شہد کی مکھی نے غذا کے اثرات کے سلسلے میں انسان سے زیادہ تحقیق کی ہے۔

مغربی فکر میں ڈوبا ہوا مصنف یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اللہ تعالےٰ نے جب مکھی کو پیدا کیا تو یہ سب کچھ سکھا دیا۔ ان کے دماغوں پر ڈارون کا فلسفۂ ارتقاء ہی بیٹھا ہوا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید صاف فرماتا ہے کہ ''اللہ نے آدم کو تمام نام سکھا دیئے''۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مکھی کو بھی تمام بنیادی تعلیم دے دی تھی۔

کتے کو ایک اضافی ناک دی گئی ہے جس کے ذریعے وہ اُن تمام جانوروں کی بُو سونگھ لیتا ہے جو کبھی اس راستے سے گزرے ہوں۔ انسان کی قوتِ شامہ (سُونگھنے کی حس) کتوں کے مقابلے میں کمزور ہے۔ آج تک انسان نے کوئی ایسا آلہ بھی ایجاد نہیں کیا جو اُس کی قوتِ شامہ کو ترقی دے' لیکن ہماری یہ کمزور قوتِ شامہ بھی اس قدر چھوٹے ذرات کو محسوس کر لیتی ہے' جنہیں مائیکروسکوپ کے ذریعے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔

مکڑیوں کی ایک قسم ایسی ہے جو پانی کے اندر غبارے کی طرح ایک گھونسلا تیار کرتی ہے' یہ تارِ عنکبوت سے بنایا جاتا ہے اور اسے پانی کے نیچے کسی چیز سے باندھ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ مکڑی اپنے جسم کے بالوں کے ساتھ پانی کا ایک بلبلہ باندھتی ہے اور اسے لے جا کر اس گھونسلے سے باندھ دیتی ہے' یہاں تک کہ گھونسلے کے گرد ہوا کے بلبوں کا حصار بن جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ گھونسلے کے اندر بچے دیتی ہے کہ وہ ہوا کے طوفان سے محفوظ رہیں۔ اس گھونسلے کی ساخت میں ایک تو باریک بننے کا عمل ہے' اس کے بعد دقیق انجینئرنگ اور ہوا بازی کا گہرا ادراک ہے۔

سالمن مچھلی' جو چھوٹی سی ہوتی ہے' سمندر میں کئی سال تک گھومتی پھرتی ہے' پھر اس دیار کی طرف واپس آ جاتی ہے' جہاں اس کی پیدائش ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قوت اُس کی جائے پیدائش تک رہنمائی کرتی ہے؟ اپنی جائے پیدائش کی طرف بڑھتے ہوئے کسی غلط دریا کی طرف چلی جائے تو اسے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ دریا اس کی جائے پیدائش نہیں ہے۔ چنانچہ وہ دریا میں بہتے پانی کے بہاؤ کی مخالف سمت میں چل کر اپنی منزل تک پہنچ جاتی ہے۔

پانی کے سانپوں کا معاملہ تو بہت ہی عجیب ہے۔ ان کا قصہ سالمن مچھلی کے برعکس ہے۔ اس مخلوقِ خدا کی عمر جب پوری ہوتی ہے تو یہ مختلف تالابوں اور دریاؤں سے سفر کر کے گہرے سمندروں کی طرف جاتے ہیں۔ اگر یورپ میں ہوں تو یہ ہزاروں میل کا سفر طے کر کے جنوبی برمودا کی گہرائیوں کی طرف چلے جاتے ہیں' وہاں انڈے دے کر مر جاتے ہیں۔ ان کے جو بچے پیدا ہوتے ہیں' وہ تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ نہایت گہرے پانیوں میں ہیں' لیکن یہ بچے اسی راستے سے ساحل کی طرف

جاتے ہیں جس طرح ان کی ماں ساحل سے پانی کی طرف آئی تھی اور ساحل سے پھر یہ کسی دریا' نہر یا حوض اور تالاب کی طرف چلے جاتے ہیں۔ پانیوں کی قسم بحری سانپوں کے لیے موزوں ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے بڑی بڑی موجیں' طوفان اور سمندری تلاطم دیکھے ہوتے ہیں اور ان کا مقابلہ کیا ہُوا ہوتا ہے۔ یہ ساحلوں پر چلتے اور جب مکمل ہو جاتے ہیں تو قانونِ قدرت ان کو حکم دیتا ہے کہ وہ پھر واپسی کا سفر کریں اور گہرے سمندروں میں چلے جائیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ جذبہ ان کے اندر کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی شکاری یا مچھیرے نے یورپی سمندروں میں امریکی بحری سانپ پکڑا ہو' یا کسی امریکی مچھیرے کے جال میں یورپی سانپ آ گیا ہو۔ یورپی بحری سانپ کو چونکہ گہرے سمندروں تک لمبا سفر کرنا پڑتا ہے' اس لیے قدرت نے اسے ایک سال کی لمبی عمر عطا کی یا اس سے بھی زیادہ تاکہ وہ مرنے سے قبل اپنی منزلِ مقصود کو پہنچ سکے کیونکہ یورپی بحری سانپ کو امریکی بحری سانپ سے زیادہ فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ ذرا دیکھیں تو سہی کہ جب بحری سانپ مچھلیوں کی شکل میں جمع ہوتے ہیں تو ان کے اندر اس قسم کی قوتِ ارادی پیدا ہو جاتی ہے جو ایسے دُور دراز سفر کراتی ہے جب مادہ پروانہ ہوا کے دباؤ میں کسی روشن دان سے اندر آ جاتی ہے تو وہ اپنے نر کو ایک سگنل بھیجتی ہے۔ چاہے وہ جتنا بھی دُور ہو' بعض اوقات وہ بہت دُور ہوتا ہے' وہ یہ سگنل وصول کر لیتا اور اس کا جواب دیتا ہے۔ اس کو گمراہ کرنے کی انسان جس قدر بھی کوشش کرے' ممکن نہیں ہوتا کہ وہ غلطی کرے۔ کیا ان کے پاس کوئی ریڈیو سٹیشن ہے یا اس نر کے پاس کوئی وائرلیس یا مشین ہے جو یہ سگنل وصول کرتی ہے۔ ایریل کا ہونا تو بڑی بات ہے' کیا اس کے پاس کوئی ایتھر ہے جس کے ذریعے وہ ارتعاش پیدا کرتی ہے؟

ہم زخموں کو مندمل کر سکتے ہیں' لیکن ہمارے سرجن ابھی تک یہ بات نہیں

> جھینگا مچھلی کا ایک بازو اگر کٹ جائے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے جسم کا ایک حصہ ضائع ہو گیا ہے۔ اس کے خلیے اور جینز اس عضو کو دوبارہ بنانا شروع کر دیتے ہیں اور جب وہ عضو مکمل ہو جاتا ہے' تو خلیے یہ کام بند کر دیتے ہیں کیونکہ ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا کام مکمل اور ڈیوٹی ختم ہو گئی ہے۔ پانی کا وہ کیڑا جس کے کئی پاؤں ہوتے ہیں' جب ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے' تو ان میں سے ایک ٹکڑے کی مدد سے اپنے آپ کو مکمل کر لیتا ہے۔ اگر اس کیڑے کا سر کاٹ دیا جائے' تو وہ دوسرا سر بنا لیتا ہے۔

جانتے کہ وہ خلیوں کو کیسے متحرک کریں اور ایک نیا بازو بنا ڈالیں یا گوشت پوست' ناخن اور اعصاب بنا دیں۔ ایک عجوبہ یہ ہے کہ اگر کوئی خلیہ ابتدائی ایام ہی میں دو مکمل حصوں میں تقسیم ہو جائے تو اس سے دو مکمل حیوان تیار ہو جاتے ہیں۔

شاہ بلوط بھورا بیج زمین پر گراتا ہے۔ اس کا بھورا چھلکا اسے محفوظ رکھتا ہے' اور یہ گرتا پڑتا زمین پر کسی درز میں اٹک جاتا ہے۔ موسمِ بہار میں اس کے اندر کا خلیہ جاگتا ہے۔ وہ اس چھلکے کو پھاڑ دیتا ہے' یہ اس مغز سے خوراک حاصل کرتا ہے جو اس چھلکے کے اندر جمع کر دی گئی ہوتی ہے جس کے اندر اس کے موروثی جینز ہوتے ہیں۔ اس کی جڑیں زمین میں جاتی ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ پودا نمودار ہوتا ہے' چھوٹا درخت اور پھر پورا درخت بن جاتا ہے۔ اس کے اندر کئی ملین جینز ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ اپنی جڑوں' چھلکے' پھل' تنوں اور شاخوں میں بھی اس درخت کے مماثل ہوتا ہے جس سے وہ بیج نکلا تھا۔ کروڑوں سال پہلے بلوط کا جو درخت پیدا ہوا تھا' اس کے پھل آج تک اپنے ذرات کی ترتیب اسی طرح رکھتے ہیں جس طرح بلوط کے پھل نے رکھا تھا۔

ہر خلیہ جو کسی زندہ مخلوق میں پیدا ہوتا ہے' اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ

کواس طرح ڈھالے کہ گوشت کا حصہ ہو یا چمڑے کا حصہ اور فنا ہو جائے یا دانت کی چمک بن جائے یا آنکھ کا سیال مادہ بن جائے یا ناک اور کان بن جائے۔ ہر خلیہ اپنے آپ کو ایسی شکل میں ڈھالتا ہے کہ وہ اپنا فرضِ منصبی پوری طرح ادا کرے۔ یہ بات نہایت ہی مشکل ہے کہ کوئی تعین کرے کہ کون سا خلیہ دائیں ہاتھ کا ہے اور کون سا بائیں ہاتھ کا' لیکن از رُوئے فطرت یہ بات متعین ہے کہ یہ خلیہ دائیں کان کا ہے اور یہ بائیں کان کا ہے۔ غرض ہزار ہا خلیات چلائے جاتے ہیں کہ وہ ہر صحیح کام کریں' صحیح وقت پر کریں اور صحیح جگہ پر کریں۔

مختلف قسم کی مخلوقات میں سے بعض ایسے کام کرتی ہیں جو دانش مندی کے اعلیٰ پائے کے ہیں' جن کی کوئی تشریح ہم نہیں کر سکتے' مثلاً بھڑ ٹڈے کو شکار کرتی ہے' زمین میں ایک مناسب جگہ ایک گڑھا کھودتی ہے اور اسے دفن کر دیتی ہے۔ یہ شکار کرتے وقت اس کے ایسے مخصوص مقام پر ڈنگ مارتی ہے کہ وہ بے ہوش ہو جاتا ہے لیکن اس کا گوشت صحیح وسالم زندہ رہتا ہے۔ اب مادہ بھڑ اس کے قریب ایک مقررہ مقام پر انڈے دیتی ہے۔ اسے شاید یہ بھی معلوم نہ ہو کہ جب اس کے بچے پیدا ہوں گے تو اس ٹڈے کا گوشت کھائیں گے' لیکن اسے قتل نہ کریں گے کیونکہ یہ گوشت ان کی غذا ہے اور گوشت خراب ہو کر زہریلا بن جائے گا۔ لازماً بھڑ نے ابتدا سے یہ کام شروع کیا ہو گا اور ہمیشہ وہ اسے دہراتی ہو گی' ورنہ دنیا میں سے بھڑوں کا وجود ہی ختم ہو جائے۔

چیونٹیوں میں سے بعض کی ڈیوٹی ہوتی ہے کہ سردیوں کے موسم میں اپنی کالونی کو خوراک مہیا کرنے کے لیے حیوانات جمع کریں۔ وہ ایک سٹور قائم کرتی ہیں جہاں یہ خوراک پیس کر رکھی جاتی ہے۔ پھر بعض چیونٹیاں ایسی ہوتی ہیں جن کو قدرت نے پیسنے کے لئے جبڑے دیئے ہوتے ہیں۔ ان کا کام صرف خوراک کو پیسنا ہوتا ہے۔ سردیوں کی آمد پر تمام غلہ پیسا جا چکا ہوتا ہے' تو اس کی سپلائی یوں ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد کو فائدہ پہنچایا جا سکے تا کہ سپلائی جاری رہ سکے۔ اب چونکہ اگلی نسل میں مزید پیسنے والی چیونٹیاں پیدا ہوں گی' اس لیے چیونٹیوں کی فوج ان پیسنے والیوں پر حملہ آور ہوتی ہے اور ان کو قتل کر دیتی ہے۔ شاید ان کا ضمیر مطمئن ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے حصے کی خوراک پیسنے کے دوران میں کھالی ہے انہوں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا تھا!

بعض چیونٹیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی عقل ان کو کھانوں کے باغ بنانے پر آمادہ کرتی ہے اور یہ چیونٹیاں انتہائی چھوٹے کیڑوں اور پودوں کے چھلکوں پر پائے جانے والے بڑے کیڑوں سے ایسا محلول بنا لیتی ہیں جو شہد کی طرح ہوتا ہے اور یہ چیونٹیوں کی خوراک کا کام دیتا ہے۔

چیونٹیاں بعض دوسری چیونٹیوں کو غلام بھی بنا لیتی ہیں' جب یہ اپنے گھروندے بناتی ہیں تو پتوں کو مناسب حجم میں کاٹتی ہیں۔ جب کارکن چیونٹیاں ان پتوں کو ایک طرف سے پکڑ کر اپنے مقام پر رکھتی ہیں تو اس وقت یہ ان بچوں سے بھی کام لیتی ہیں جو ابھی ارتقائی دور میں ہوتے ہیں' لیکن ان کے ریشمی مواد سے یہ پتوں کو جوڑتی ہیں' یوں یہ بچہ اپنے لیے گھروندا بنانے سے محروم رہتا ہے لیکن چیونٹیوں کی نسل کے لیے انتہائی مفید کام کر چکا ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جن ذروں سے چیونٹی بنتی ہے' ان ذروں میں یہ کام کرنے کی صلاحیت کس طرح پیدا ہو جاتی ہے؟

اس میں شک نہیں ہے کہ خالق ہے جس نے اپنی تمام مخلوقات کو ہدایات دیں' خواہ وہ بڑی مخلوق ہو یا چھوٹی ہو' اور یہ وہ خالق ہے "جو برتر ہے' جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا' جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھائی۔"

یہ قابلِ مشاہدہ کائنات جس کے ایک معمولی حصے کو ہم جانتے ہیں' اس سے آگے عالمِ غیب کے جہان پوشیدہ ہیں۔ ہمیں تو اپنی بشری قوتوں کے مطابق بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ یہ چند اشارات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہماری محدود قوت ادراک کے لیے واضح کر دیے ہیں۔

زلزلہ

حامد افتخار شیخ

کرۂ ارض کی اوپری چٹانی پپڑی یعنی Crust اندرونی مادے (Mantle) پر پھسلتی رہتی ہے۔ چٹانی پپڑی جس پر ہم رہتے بستے ہیں' سات ٹکڑوں میں بٹی ہے اور ہر ٹکڑا ایک چٹانی پلیٹ ہے۔ یہ پلیٹیں جب ٹکراتی ہیں اور چٹانوں کی دراڑوں پر' جو فالٹ کہلاتے ہیں' کوئی حرکت ہوتی ہے تو اسے زلزلہ کہتے ہیں۔

ہمارا ملک انڈین پلیٹ کی شمالی سرحد پر واقع ہے جہاں اسے یوریشین پلیٹ کا سامنا ہے۔ سلسلہ ہائے کوہِ ہمالیہ دونوں پلیٹوں کے ٹکرانے سے ہی وجود میں آئے ہیں۔ انڈین پلیٹ کے آگے بڑھتے رہنے اور یوریشین پلیٹ کے نیچے دھنسنے کا عمل لاکھوں سال سے جاری ہے۔ ہماری پلیٹ اوسطاً ایک سال میں ڈیڑھ انچ شمال کو بڑھتی ہے' لیکن یہ صرف ایک اوسط ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ سو پچاس سال تک اس پلیٹ پر کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ صرف اس پر دباؤ بڑھتا رہتا ہے' لیکن جب دباؤ ایک حد سے آگے بڑھ جاتا ہے تو پھر ایک جھٹکے سے چٹانیں کئی فٹ کھسک جاتی ہیں اور جمع ہونے والی توانائی خارج ہوتی ہے۔ توانائی کا اخراج چٹانوں میں لہروں کی شکل میں اپنے مرکز سے دائرے کی صورت پھیلتا ہے اور یہ لہریں چٹانوں اور ان پر واقع آبادیوں اور عمارتوں کو جھٹکے اور ہچکولے دیتی ہیں۔

دنیا میں اسّی ممالک ایسے ہیں جہاں کبھی زلزلہ آیا ہے' ان میں سے صرف دو درجن ممالک میں تواتر سے زلزلے آتے ہیں۔ یہ ممالک چٹانی پلیٹوں کی سرحدوں پر واقع ہیں اور دو پلیٹوں کے ٹکراؤ سے براہِ راست جھٹکے کی زد میں رہتے ہیں۔ ایک سرحد تو انڈین اور یوریشین پلیٹ کے ٹکراؤ کی لکیر ہے جو برما سے لے کر آسام' بہار نیپال' کشمیر' گلگت سے ہوتی ہوئی افغانستان' ایران' ترکی اور یوگوسلاویہ سے اٹلی تک پھیلی ہے۔ زلزلے کی دوسری پٹی پر واقع ممالک میں چین' جاپان' انڈونیشیا اور فلپائن ہیں جو بحرالکاہل پلیٹ کی سرحد کے ممالک ہیں۔ تیسری پٹی جہاں زلزلے کثرت سے آتے ہیں' وہ جنوبی اور شمالی امریکی پلیٹوں کے مغربی سرحد ہے جس پر واقع چلّی' پیرو' میکسیکو اور امریکہ کی ریاستیں کیلیفورنیا اور الاسکا زلزلے کی زد میں رہنے والے علاقے ہیں۔

پلیٹوں کی سرحد سے ہٹ کر بعض وقت پلیٹوں کے بیچوں بیچ بھی زلزلے آ سکتے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہوتی ہے جہاں سے پلیٹ اپنے ہی وزن اور سائز کی وجہ سے کمزور ہو اور ایک نئی دراڑ پڑ جائے۔ ایسا بھارت کے صوبے گجرات میں ہو رہا ہے جہاں سے رن آف کچھ والی دراڑ ہمارے صوبہ سندھ کے جنوبی حصوں میں نگر پارکر' بدین اور ٹھٹھہ سے ہوتی ہوئی کراچی کے قریب تک پہنچتی ہے۔ 2001ء کا بھوج کا زلزلہ اور 1891ء کا کچھ کا زلزلہ اسی فالٹ پر چٹانوں کے چٹخنے کی وجہ سے واقع ہوا۔

زلزلہ ایک قدرتی عمل ہے اور کائنات کے نظام کا حصہ ہے۔ سورج' زمین اور چاند اپنے اپنے راستوں پر ہیں لیکن جب سورج اور زمین کے درمیان چاند آ جاتا ہے تو پھر ہمیں بھری دوپہر میں سورج نظر نہیں آتا' اندھیرا پڑنے

لگتا ہے اور سورج گہنا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح چٹانی پلیٹیں حرکت میں ہیں اور ایک مدت تک دباؤ کے جمع ہونے سے اور پھر ایک حد کے بعد کھسک جانے سے زلزلے آتے ہیں۔

ان سے بچاؤ کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہم چٹانوں میں دباؤ کو جمع نہ ہونے دیں اور ہمارے پاس کوئی ایسا طریقِ کار ہو کہ اس جمع ہونے والی توانائی کو آہستہ آہستہ خارج ہونے کا کوئی راستہ دیں تو پھر زلزلے یا کم از کم بڑے زلزلے آنا رُک جائیں گے۔ اس وقت ہمارے پاس وہ ٹیکنالوجی نہیں کہ ہم انڈین پلیٹ کو یوریشین پلیٹ سے ٹکرانے والی قوت سے لڑ سکیں۔ بچاؤ کا دوسرا طریقہ وہی ہے جو سورج گرہن کے نقصانات سے بچاؤ کا ہے یعنی احتیاطی تدابیر۔

علاوہ ازیں کچھ اور اہم اقدامات یہ ہیں:

- زلزلوں سے مدافعت کا پہلا قدم یہ ہے کہ ہمیں معلوم ہو کہ ہمارے ملک کے کس حصے کو زلزلے سے کتنا نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔ ہماری جو آبادیاں انڈین پلیٹ کی آخری شمالی سرحد پر ہیں' شمالی علاقہ جات اور کشمیر' وہاں تواتر سے اور شدید نوعیت کے زلزلے آتے رہے ہیں اور آئندہ بھی آئیں گے۔ یہ ہمارا اونچے درجے کا رسک زون ہے اور ہم اسے زون فور کہتے ہیں۔ پوٹھوہار کا علاقہ جس پر اسلام آباد' راولپنڈی' جہلم اور چکوال کے شہر واقع ہیں' وہاں زلزلے آئیں گے لیکن نسبتاً کم شدت کے۔ اسے ہم زون تھری کہیں گے۔ یہ واضح کر دینا بے جا نہیں کہ کوئٹہ' چمن' لورالائی اور مستونگ انڈین پلیٹ کی مغربی سرحد پر واقع ہیں' اس لئے یہ بھی ہائی رسک زون یا زون فور ہے۔ اس سے ملحقہ علاقے زون تھری میں شمار ہوں گے۔ ہمارے ملک کے بڑے حصے میں درمیانے درجے کے زلزلے کے خدشات ہیں۔ شمالی پنجاب' اپر سندھ اور خاران زون ٹُو میں رکھے جاتے ہیں اور یہ وہ علاقے جہاں زلزلے کا اندیشہ بہت کم ہے۔ یہ زون ون کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ تھر اور چولستان کے ریگستان اور اس سے ملحقہ آبادیاں ہیں۔ گویا زلزلے کے اعتبار سے پورے ملک کو چار زون میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ نقشہ سیسمک رسک زون آف پاکستان کہلاتا ہے جس پر کوئی بھی ادارہ یا فرد اپنے شہر کو دیکھ سکتا ہے کہ وہ کس زون میں آتا ہے۔
- بچاؤ کا دوسرا قدم یہ ہے کہ جو شہر جس رسک زون میں ہو' وہاں کی عمارتیں ہمارے انجینئر یوں ڈیزائن کریں کہ وہ اس درجے کے متوقع زلزلے کو گزرے بغیر سہار لیں۔ اسے بلڈنگ کوڈ کی تعمیل کہتے ہیں۔ کوئٹے کی عمارتوں کا بلڈنگ کوڈ بڑا سخت ہونا چاہیے کہ یہ زون فور کا شہر ہے۔ ہزارہ' کشمیر اور گلگت و چترال میں بھی قوانین کی پابندی درکار ہے' لیکن زون تھری کے شہر اسلام آباد' راولپنڈی کا بلڈنگ کوڈ قدرے مختلف ہوگا۔ اگر عمارتیں اپنے کوڈ کے مطابق ڈیزائن ہوں یعنی منزلوں کی تعداد محدود ہو' ستونوں میں سریے کی مقررہ تعداد ڈالی جائے اور سریوں کو اسی ہنرمندی اور احتیاط سے باندھا جائے جو بلڈنگ کوڈ میں دیا گیا ہے' تو پھر یہ عمارتیں زلزلہ پروف نہ بھی ثابت ہوں تو زلزلہ کی مدافعت ضرور کریں گی اور چاہے دراڑیں پڑ جائیں' پلاسٹر اُکھڑ جائے' لیکن چھتیں نہ گریں گی اور جانوں کا زیاں کم سے کم ہوگا۔
- بچاؤ کی تیسری تیاری یہ ہے کہ ہر فرد کو معلوم ہو کہ زلزلہ آ جائے تو اسے کیا کرنا چاہئے۔ حکومتی اداروں میں بھی ایسا مربوط نظام پہلے سے طے ہو اور کسی کی ذمہ داری ہو کہ زلزلہ آتے ہی ان اداروں کو ہدایت دے کہ ریسکیو اور ریلیف کے کام میں کس طرح منہمک ہو جانا ہے۔
- ہمارے خطے کے ممالک میں جب زلزلہ آتا ہے تو اموات ہزاروں میں ہوتی ہیں۔ ایران کے 2012ء زلزلے میں چالیس ہزار' ترکی کے 2011ء کے زلزلے میں بیس ہزار' چین کے 2010ء کے زلزلے میں

ایک لاکھ اور پاکستان میں 8 اکتوبر 2005ء کے زلزلے میں ایک لاکھ سے زائد اموات کی اطلاعات ہیں۔ یہی زلزلے سو پچاس سال سے پہلے جاپان میں سوا لاکھ اور اٹلی میں ایک لاکھ پندرہ ہزار افراد کی جان لے چکے ہیں' لیکن اب جاپان کے بدترین زلزلے میں پانچ ہزار اور امریکہ کی ریاستوں میں اتنی ہی شدت کے زلزلے میں صرف تراسی افراد ہلاک ہوئے۔ یہ قوانین پر پابندی اور احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا نتیجہ ہے کہ ترقی یافتہ قومیں قدرتی آفت کی زد میں ہیں لیکن اس کے خوف اور نقصانات سے باہر آ چکی ہیں۔

8 اکتوبر 2005ء کو صبح آٹھ بج کر پچاس منٹ پر آزاد کشمیر اور صوبہ سرحد (اب خیبر پختونخواہ) میں ریکٹر سکیل پر 7.6 کا زلزلہ آیا جس نے اٹھائیس ہزار کلومیٹر رقبے کو متاثر کیا' جتنے وسیع رقبے کو اس زلزلے نے نقصان پہنچایا ہے' اس لحاظ سے یہ ایک صدی کے دوران دنیا کا سب سے بڑا زلزلہ ہے۔

یہاں ایک یا دو منزلہ مکان مقامی روایات اور دستیاب میٹریل یعنی لکڑی' مٹی اور پتھروں کے بنے تھے۔ سکولوں کی عمارتیں اور سرکاری دفاتر کنکریٹ کے تعمیر شدہ تھے' لیکن بیشتر میں زلزلے کے فیکٹر کو شامل نہیں رکھا گیا تھا۔ اس لئے سب سے زیادہ اموات سکول کے بچوں اور بچیوں کی ہوئیں جو اس زلزلے کا افسوسناک ترین پہلو ہے۔ اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے بار بار کہا تھا کہ یہ سانحہ سونامی کے سانحے سے بھی بڑا ہے۔ آٹھ اکتوبر 2005ء کی صبح کے زلزلے کے بعد بھی بے شمار جھٹکے محسوس ہوئے۔ ان میں سے کئی جھٹکے ریکٹر سکیل پر چھ تک تھے۔ مظفر آباد کے زلزلے کے بعد جو توانائی خارج ہونے سے رہ گئی' وہ چھوٹے جھٹکوں کی صورت میں نکلتی رہی۔ اس زلزلے کے نتیجے میں چٹانی تودے گرنے کے متعدد واقعات ہوئے جو کبھی گرد و غبار کے بادلوں کی شکل اختیار کرتے

> زلزلوں کے جھٹکوں سے کوئی نہیں مرتا۔ اموات زلزلے کے جھٹکوں اور ہچکولوں کی وجہ سے کچے پکے مکانوں اور عمارتوں کے ڈھے جانے سے ہوتی ہیں۔ اگر ہم اپنی عمارتوں کو یوں تعمیر کریں کہ وہ زلزلے کے جھٹکوں کو سہار لیں تو ہم جانی نقصان سے بھی محفوظ رہیں گے اور جائیدادوں کا زیاں بھی کم ہوگا۔

جیسا کہ الائی میں ہُوا' کبھی ندیوں اور دریاؤں میں گر کر پانی کو گدلا اور پینے کے ناقابل بنا دیتے ہیں جیسے کہ دریائے نیلم۔ اور اب کچھ احتیاطی تدابیر کے حوالے سے

زلزلے سے احتیاطی تدابیر کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

وہ احتیاطی تدابیر جو افراد کو اپنے گھر اور خاندان کے لئے کرنا چاہئیں اور وہ تدابیر جو حکومتی اداروں کا فرض اور ذمہ داری ہیں۔

- زلزلے کی صورت میں خوفزدہ نہ ہوں' اوسان بحال رکھیں۔ خصوصاً فلیٹوں سے باہر نکلنے کی کوشش میں بھگدڑ سے جانی نقصان بہت زیادہ ہو گا۔ البتہ گھروں سے خالی میدان میں باہر جانا بہتر ہو سکتا ہے۔ اگر کمرے میں ہیں تو کونے میں کھڑے ہو جائیں کیونکہ چھتیں درمیان سے گرتی ہیں۔
- ایک بڑا حادثہ رونما ہونے کی صورت میں افواہوں کا پھیلنا لازمی امر ہے۔ عام حالات میں بھی ایک چھوٹا سا واقعہ بڑھا چڑھا کر بیان ہوتا ہے۔ ٹیکنیکل اداروں سے شہری انتظامیہ کا رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے حقیقت عوام تک پہنچانا ممکن نہیں ہوتا۔ ضروری ہے کہ ٹیکنیکل ادارے میڈیا کو بروقت معلومات فراہم کریں تا کہ لوگوں تک صحیح اطلاع پہنچ سکے اور افواہوں کو پھیلنے کا موقع نہ ملے۔ محکمہ موسمیات اور جیولوجیکل سروے کی ذمہ داری ہے کہ معمولی جھٹکے محسوس ہونے پر بھی اس کی لوکیشن' شدت اور سبب کے بارے میں عوام کو ہر ممکن ذریعے سے آگاہ کریں۔
- آزاد حکومتِ جموں و کشمیر کی وزارتِ تعمیرات کے نیک نام

انجینئر خواجہ اعجاز نے زلزلے کے امکانات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے عمارات' پلوں اور سڑکوں کی تعمیر کے لئے عملی اور عام فہم تجاویز پیش کیں۔ قومی پریس اور پیشہ ورانہ مطبوعات میں انہیں بڑی پذیرائی ملی۔ ان تجاویز کی افادیت کے پیشِ نظر یہاں ان کا اعادہ بے جا نہ ہوگا۔

دیوار: ہمارے ہاں عمومی طور پر ایک ایک دیوار کر کے مکان کی تعمیر کی جاتی ہے جس میں مستری کے لئے کام کرنا آسان ہے۔ جب ایک دیوار مکمل ہوتی ہے تو دوسری دیوار کے کونے (عام لوگوں کی زبان میں ''دہڑے'') آپس میں جُڑ نہیں پاتے' مگر پلستر کرنے پر اندرونی طور پر علیحدہ دیوار میں بظاہر کوئی خلا نظر نہیں آتا۔ جن حضرات نے زلزلہ زدہ علاقوں کا دورہ کیا ہے' وہ اس بات کے شاہد ہیں کہ زیادہ تر دیواریں کونے سے ٹوٹی ہیں' اس لئے ضروری ہے کہ ایک کمرے کی کم از کم دو دیواریں اکٹھی بنائی جائیں۔ یہ ممکن نہ ہو تو کونوں پر ستون (پلر) بنائے جائیں۔

سیدھی اینٹ: تعمیر میں اینٹیں افقی سمت میں قطار میں لگائی جاتی ہیں جسے ''ردّا'' کہا جاتا ہے۔ اگر دو ردّوں کو آپس میں انٹرلاک کر دیا جائے تو دیوار انتہائی مضبوط ہوگی۔ یہ انتہائی آسان کام ہے۔ ہر قطار (ردّے) میں چار فٹ کے بعد ایک اینٹ سیدھی کھڑی لگائیں اس طرح کہ اینٹ اپنی لمبائی کے رخ کھڑی ہو۔ یوں بغیر اضافی خرچ کے ہر دیوار میں کالم بھی بن جائیں گے۔

سریا کا استعمال: سریا عموماً چھت یا DPC میں استعمال کیا جاتا ہے' لیکن اگر آپ سریے کا ایک ٹکڑا پورے کمرے کے عین وسط میں استعمال کریں یعنی جب دیوار نصف اونچائی تک پہنچ جائے تو درمیان میں ایک سریا رکھ دیں، تو یہ آپ کی دیوار کو باہر کی جانب پھٹنے سے روک دے گا۔ سریا مہنگا ہونے کے باعث استعمال نہیں کر سکتے تو جست کی پرانی تار استعمال کریں۔ صرف 3.5 ملی میٹر کی موٹائی والی تار اچھا کام کرتی ہے اور دیوار میں اس کی عمر سو سال سے زائد ہے۔

جالی کا استعمال: بنیادوں میں جالی کا استعمال سٹرکچر کو بیٹھنے سے بچاتا ہے۔ پرانی جالی کا ردّوں میں استعمال افقی سمت میں دیوار کو مضبوط بناتا ہے۔

سوراخ دار اینٹ: گیس پلانٹ پر تیار کردہ آر پار سوراخوں والی اینٹ اگرچہ بہت مہنگی ہے لیکن اس کی دیوار بہت طاقتور ہوتی ہے۔ بھٹہ مالکان کو اس بات پر قائل کیا جا سکتا ہے کہ اینٹ کی ہموار جانب بھی کچھ خلا رکھا جائے تاکہ سیمنٹ کی گرفت سے مزید مضبوطی آئے۔ اس کام میں اضافی محنت درکار ہوگی' لیکن دیوار کی مضبوطی میں کئی گُنا اضافہ ہوگا۔

شاک بیئرنگ پوائنٹ: اگر عمارت کا رقبہ دس مرلے تک ہو اور زیادہ تر حصے پر تعمیر ہوئی ہو تو تقریباً نصف پر یہ دو حصوں میں منقسم ہونا چاہئے' اس جگہ لکڑی کا استعمال کیا جائے۔ ایک انچ موٹائی کے تختے جھٹکا سہتے اور گرمی کے اثرات سے بچاتے ہیں۔ یہ تجربہ فیصل مسجد اسلام آباد میں کامیابی سے کیا گیا ہے۔

چیڑ کے پتے: جن علاقوں میں گارے سے چُنائی کی جا رہی ہے' وہاں اگر گارے میں چیڑ کے تنکا نما پتے شامل کر لئے جائیں تو مضبوطی کے لئے کافی مددگار ثابت ہوں گے۔ خاص طور پر پہاڑی علاقوں میں جہاں مٹی چکنی ہوتی ہے' یہ پتے بہت مضبوطی کا باعث بنتے ہیں۔

سیمنٹ کے بلاک: پہاڑی علاقوں میں تعمیرات کے لئے اینٹوں کی جگہ سیمنٹ کے بلاک استعمال ہوتے ہیں' لیکن یہ احتیاط کی جائے کہ چھت کا بوجھ بلاک کی دیوار کی بجائے ستون پر رکھیں۔ خصوصاً لینٹر والی چھت بلاک والی دیوار پر ہرگز نہ بنائی جائے۔

انتہائی ضروری بات: یہ سب احتیاطی اقدامات اپنی جگہ' لیکن عمارت کی تعمیر کا آغاز کرنے سے پہلے دعا کرنا نہ بھولیں کہ یارب ہم تیرے عاجز بندے ہیں۔ ہمیں آفات' حادثات' امتحان اور آزمائشوں سے بچا (آمین) یقین جانیں ربِّ کریم نے دعا کرنے والے بندوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑا۔

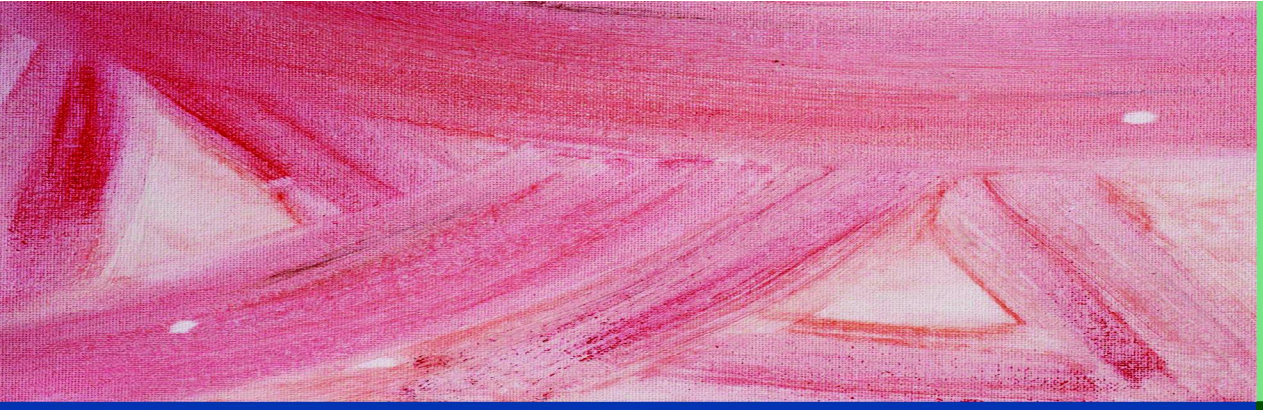

فسانے

اس کے زمانے عجیب، اس کے فسانے غریب
عہدِ کُہن کو دیا، اس نے پیامِ رحیل

—— اقبالؒ

زندہ باد

رفعت

اُس کے قدموں کی آہٹ دھیرے دھیرے میرے قریب آ رہی ہے۔ وہ آ رہا ہے جس نے ہمیں زندگی کے نئے رُخ سے آشنا کیا۔

وہ آیا تو برسوں پرانی جدِ وجُہد کو کامیابی نصیب ہوئی۔ اس کی اداؤں کی کاٹ بڑی ترچھی ہے۔ اس کے قدموں میں سیلِ خُوں رواں ہے جس میں آپ مَیں اور یہ سب ڈوبے ہوئے ہیں۔

یہ کُوئے محبوب' یہ مقتل' یہ سجدہ گاہ! یہ ماہِ آزادی جس کی چوکھٹ پر خون کے دھبے ہیں' جس کے سر پر ہزاروں عِفت مآب بیٹیوں کے تار تار آنچل لہرا رہے ہیں' ان آنچلوں پر کیسے کیسے نقش ونگار بنے ہیں۔

مَیں دیکھنا چاہتی تھی کہ خون کے ان چھینٹوں اور آنچلوں کے اِن نقوش کی زبان تو نہیں بدل گئی۔ ماہِ آزادی کے پرستاروں کی عقیدت کا اب کیا عالَم ہے؟

اس کے قدموں کی آہٹ دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی۔ عقیدت کی ایک لہر تھی کہ میری رَگ رَگ میں مچلتے جذبات میں نئی حرارت بھر رہی تھی۔

وہ آ رہا ہے! وہ۔۔۔آ۔۔گیا!

ذرا میں دیکھوں تو سہی آج اس کا استقبال کرنے کو کون کون سے چہرے اپنے دریچوں سے جھانک رہے ہیں؟ چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی سفید کرن نے میرا ہاتھ تھام کر کہا: ''آؤ! ان کی آنکھوں' ان کے چہروں' ان کے دلوں میں جھانکیں۔'' اپنے سینے میں مچلتی لہروں کو بمشکل سمیٹا اور اُس کے ساتھ چل دی۔ نیم وا دریچے سے جھانک کر دیکھا' کمرے میں جگمگ کرتی روشنی کی لہریں پھیلی تھیں اور سامنے ایک خاتون سولہ سنگار میں مشغول تھی۔

''تم اپنے محبوب کے لئے آراستہ ہو رہی ہو؟''

وہ چونکی' پھر دھیرے سے بولی: میرا محبوب زندہ ہوتا تو مجھے اپنے چہرے کو اِن مصنوعی طریقوں سے سجانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہ سب کچھ تو مجھے اپنے خاوند کے لئے کرنا پڑتا ہے۔ تم جانتی ہو جب میرا محبوب' آزادی کی صلیب پر کھینچا گیا تو اماں نے میرا جی بہلانے کو مجھے پرائے گھر دھکیل دیا جو میرے لئے آج بھی پرایا ہے کہ اس گھر میں نہ میرے وجود کو اہمیت دی جاتی ہے' نہ میرے احساسات کی کسی کو پروا ہے۔ اب دیکھو میرا جی چاہ رہا ہے کہ یومِ آزادی آ رہا ہے' تو مَیں اپنے اُس شہید محبوب کی یاد میں قدرے سوگوار رہوں جس نے اس آزادی کی جدِ وجُہد کی تھی' مگر خود اس کا پھل نہ چکھ سکا۔ مَیں اُسے یاد کروں جو میرا تھا' مگر میرا بَن نہ سکا۔ دکھ تو یہ ہے کہ مَیں اُس کی جُدائی پر آنسوؤں کا نذرانہ بھی پیش نہیں کر سکتی۔

میرا خاوند بڑے عجیب وغریب عقیدے کا انسان ہے۔ اسے تو کوئی احساس اور قدر ہی نہیں کہ اس ملک کی تعمیر میں کیسے کیسے جسم' دل' جذبات و احساسات کام آئے ہیں۔ جب آزادی کے متوالے سر پر کفن باندھ کر پروانہ وار نثار ہو رہے تھے تو یہ جلتے گھروں کا سامان اُٹھا اُٹھا کر اپنے گھر میں سجا رہا تھا۔ پھر جب گھر میں پرائے سامان کے انبار لگ گئے اور وہاں سانس لینا بھی دشوار ہو گیا تو ایک جلتے گھر کی آگ بجھاتے بجھاتے اس

کی پیشانی کی ساری تحریریں مٹا دیں جس میں پرانے مالکوں کے نام کَندہ تھے۔ میں جانتی ہوں یہ آگ صرف پیشانی داغنے کے لئے لگائی گئی تھی' ورنہ اندر کا سامان تو جُوں کا تُوں تھا۔ بعد ازاں یہاں دوسرے گھروں کے ملکیّتی سامان کے ساتھ ساتھ میرے وجود کا بھی اضافہ ہو گیا۔ پرائے گھروں کے سامان کو چوری چُھپے اپنے ہاں منتقل کرنے کا کام جاری ہے اور اب میرا خاوند بدنام ترین سمگلر ہے۔ شروع شروع میں مَیں اس کا ہاتھ تھام کر کہا کرتی تھی: ''اب بس کر دے' یہ سامان گھر میں نہ لا اور اب اپنے گھر کو اپنا گھر سمجھ' اسے یوں دوسرے کی جھولی میں مت ڈال۔ یہ سچ کہ تمہیں اسے پانے' اسے سجانے میں کوئی محنت' کوئی جدِ وجُہد نہیں کرنا پڑی' مگر اب وہ ہمارے گھر کا مال ہے' ہماری زندگیوں کا حصہ' بلکہ ہمارے بچوں کا مستقبل ہے۔''

وہ ہاتھ جھٹک دیتا اور کہتا: ''تُو کیسی باتیں کرتی ہے جاہلوں والی' مجھے پیسہ بنانا ہے کہ یہ دنیا صرف پیسے کی ہے۔ یہ مال' یہ اسباب وہ گھوڑے ہیں جس پر ہمیشہ انہوں نے کاٹھی ڈالی ہے جو انہیں جُل دے کر اس کی باگیں پکڑ لیتے ہیں۔''

پھر مَیں نے اپنے خاوند کی اتنی باتیں سُنیں کہ اس ملک کے کپڑے' جوتے' میک اپ کا سامان اور گھریلو مشینری کا استعمال ترک کر دیا۔ مجھے اس ملک سے اتنی سی دلچسپی ہے کہ یہاں ہم رہتے ہیں اور بات یہ ہے کہ ہم کہیں اور بھی رہ سکتے ہیں' بلکہ سوچتی ہوں ہمیں کسی اور ملک میں چلے جانا چاہئے کہ کبھی کبھی اپنا منگیتر شدت سے یاد آتا ہے جو' پاکستان-زندہ باد کے نعرے لگاتا ہمیشہ کے لئے ایک خونیں دھند میں چُھپ گیا۔ پھر اس کی یاد میری آنکھوں سے ٹپکنے لگتی ہے' میرے چہرے پر سوگواری بن کر چھا جاتی ہے۔ اس دن مجھے اپنے خاوند کے لئے سولہ سنگھار کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ وہ۔۔۔تو پھر بتاؤ میرا ٹھکانہ کہاں ہے؟

کرن نے اُداس ہو کر واپسی کا ارادہ کیا' مگر میری طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ دریچے پر پڑی بانس کی میلی چق کو سُتلی سے باندھتی ایک ماں پر نظر پڑی اور کرن اُدھر پھسل پڑی۔

''تم رات گئے یہ دریچہ کیوں بے نقاب کر رہی ہو؟''

''ہشت''۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ ''وہ سن لے گا۔ ٹھہرو' مَیں باہر چھجے پر آ جاتی ہوں کہ مجھے ان دنوں نیند نہیں آتی۔ یوں تو مَیں برسوں سے پوری نیند کبھی نہیں سوئی' مگر اگست کا مہینہ آتا ہے' چودہ تاریخ نزدیک ہو تو میری نیند کوسوں دُور بھاگ جاتی ہے۔ قیامتِ صغریٰ نے میرا سُکھ چَین چھین لیا ہے۔ تم جانتی ہو مَیں پانی پت کے معزز گھرانے کی بیٹی اور بیوی ہوں۔ جب وہ قیامت نازل ہوئی تو میری تین بچیاں' بڑی پندرہ برس کی' دوسری تیرہ برس کی اور ایک دس برس کی تھیں۔ تینوں لاپتہ ہو گئیں۔ مجھے بھی زخم آئے تھے' مگر میں بچ گئی۔ میرے منہ اور شانوں پر کرپانوں کی کاٹ کے زوایئے بنے ہیں' مگر میں بچ گئی۔ مَیں کہتی ہوں معزز اور بڑا ہونا بھی ایک لعنت ہے۔ تین برس بعد میری ریحانہ اٹھارہ برس کی بڑھیا کے روپ میں میرے سامنے تھی۔ میں نے اسے سینے سے لگا کر خون کے آنسو بہاتے ہوئے باقی دونوں بہنوں کا پوچھا تو اسے بھی اُن کا علم نہ تھا۔ اس کا کہنا تھا بہت سی ننھی بچیاں درندگی کا شکار ہوئیں' ان کی بے گور کفن لاشیں لوگوں نے جلا دی تھیں۔ ابھی ہم زخموں پر پھائے بھی نہ رکھ پائے تھے کہ معزز باپ اور غیور بھائی نے کہا کہ ہیں' ہیں!! کیا غضب کرتی ہو؟ ریحانہ کو یہاں اپنی بچی نہ کہنا' لوگ کیا کہیں گے۔ ہم بے غیرت نہیں' عزت دار لوگ ہیں۔ ریحانہ! تمہیں یہاں ہمارے ایک مرحوم چچا کی نشانی بن کر رہنا ہوگا۔ تمہیں والدین کی عزت عزیز ہے تو اپنی زبان بند رکھنا ہوگی۔ ریحانہ تڑپ کر اُٹھی' دو قدم چل کر گری۔ اُٹھی تو اس نے مجھے چچی کہنے سے بھی انکار کر دیا۔ اپنے ابا کے پاؤں پکڑ کر بولی کہ ''مجھے اپنے

گھر میں نوکر رکھ لو۔ اگر یہاں تمہیں ڈر ہے کہ شریف اور معزز خون کبھی جوش مار دے گا تو کسی دوست کے ہاں ملازم رکھوا دو۔ مَیں ساری دنیا سے کہوں گی کہ میرا سارا گھرانہ کٹ گیا تھا' تو شہید ابا کے دوست نے اپنے ہاں پناہ دی۔ مجھے اتنا تو بتا دو' میں تمہیں انعام چچا کہہ کر پکار لیا کروں تا کہ دنیا کو معلوم ہو جائے یہاں خون کا رشتہ نہیں' دنیاداری کا تعلق ہے۔'' میری اپنی بچی مجھے چچی ماں پکارتے پکارتے سکول میں پڑھ کر استانی لگ گئی' باقی دو کا پتہ ہی نہیں چلا۔ میرے دوسرے بچے عزت دار معزز باپ کے بچے ہیں۔ ریحانہ ایک گاؤں میں نوکری کرتی ہے۔ اسے وہیں ایک سکول ماسٹر سے بیاہ دیا ہے۔ خاوند نہیں چاہتا کہ وہ باپ کے دوست کے جوان بیٹوں کے سامنے آئے۔ اس نے اپنی دونوں بچیوں کے نام اپنی گم شدہ بہنوں کے نام پر زاہدہ اور شاہدہ اور بیٹے کا نام انعام رکھا تھا' اپنے غیور باپ کے نام پر' مگر اس کے شوہر نے اس کا نام فاضل رکھ دیا۔ تم اس کے سارے بچوں کو پیار کرنا اور ہو سکے تو مجھے بتانا کہ یہ تکلفات کی دیواریں مَیں کیسے گراؤں۔ میں ہر روز انہیں چاٹتی ہوں' مگر یہ ہر روز اور بھی اونچی ہو جاتی ہیں۔'' وہ دکھ سے سسک پڑی۔ اس کا سینہ پھٹ گیا تھا شاید۔

اسی گھر میں ابھی غیرت کا طوفان اُمڈ آئے گا' آؤ یہاں سے بھاگ چلیں۔ کرن نے میرا ہاتھ زبردستی تھام کر مجھے وہاں سے باہر کو کھینچا۔ میں نے اپنے گالوں پر بہتے آنسو خشک کرنے کی کوشش ہی نہ کی۔ ہمیں جلدی تھی کہ ہم یہاں سے دُور چلے جائیں۔ وہ گھرانہ ہمارا پیچھا نہ کرے۔

دھم دھا دھم' دھم دھا دھم۔۔۔ کرن نے ایک بند دروازے کو نہایت زور سے پیٹ ڈالا۔ وہاں زندگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ دھا دھم۔۔ کرن دروازہ پیٹ پیٹ کر ایک سوراخ سے اندر داخل ہو گئی۔

''یہ کون بدتمیز شور کر رہا تھا؟'' ایک بیزار خاتون کی آواز لپکی۔

''وہ جی وہ وہ یومِ آزادی آ رہا ہے اور۔۔''

''تو مَیں کیا کروں؟ تم میرے پُرسکون ٹھنڈے کمرے میں بغیر اجازت

عالمی شہرت یافتہ فلسفی' ناول نگار' شاعر اور مصوّر خلیل جبران 4 جنوری 1883ء کو لبنان میں پیدا ہوئے' 10 اپریل 1931ء کو نیویارک میں وفات پائی۔ وہ قوموں کی آزادی اور آزادی کی تحریکوں کے بے لوث حامی تھے۔ خلیل جبران کی عربی اور انگریزی تحریروں نے پوری دنیا کو متاثر کیا۔ ان کے چند اقوال:

- قابلِ رحم ہے وہ قوم جو عقائد کی دولت وافر مقدار میں رکھتی ہو' مگر دین کے بتائے ہوئے راستے پر نہ چلتی ہو
- قابلِ ہمدردی ہے وہ قوم جو وہ کپڑا پہنے جو اس نے خود نہیں بُنا' وہ غلہ کھائے جو اس نے خود نہیں اُگایا
- قابلِ افسوس ہے اس قوم کا روّیہ جو ظالم کو ہیرو جان کر اس کے لئے نعرۂ تحسین بلند کرے اور فاتح سے مرعوب ہو کر اس کے گُن گائے
- اظہارِ ہمدردی کے قابل ہے وہ قوم جو شدید جذباتی ہیجان سے کسی سے خواب میں نفرت کرے لیکن بیداری کی حالت میں اس کے آگے سر جھکا دے
- قابلِ رحم ہے وہ قوم جس کا سیاسی رہنما لومڑی کی خصوصیات رکھتا ہو' جس کا صحافی شعبدہ باز ہو' اور جو صرف نقالی اور پیوند کاری کا ہنر جانتی ہو
- افسوس ہے اس قوم پر جو آنے والے نئے حاکم کا ڈھول باجوں سے استقبال کرے اور مذاق و تمسخر کے نعروں سے اسے رخصت کرے تا کہ نئے آنے والے حاکم کو ڈھول باجوں سے خوش آمدید کہا جا سکے
- قابلِ افسوس ہے وہ قوم جس کے علماء اور دانشوروں کی زبانیں مفادات یا پھر خوف نے گونگی کر دی ہوں اور جن کے مردانِ حُر ابھی تک پنگوڑوں سے باہر نہ آئے ہوں
- رحم کے لائق ہے وہ قوم جو حصوں' ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہو اور ہر ٹکڑا اپنے آپ کو ایک علیحدہ قوم سمجھتا ہو

—— انتخاب و ترجمہ: کرنل محمد اعظم

کیوں آئیں۔تمہیں پتہ ہونا چاہئے یہاں میرا خاوند بھی میری اجازت لے کر داخل ہوتا ہے۔

''مگر' مگر''۔۔کرن نے کانپتے ہوئے کچھ کہنا چاہا' اس نے ڈانٹتے ہوئے کہا :نہیں مَیں اگر مگر سننے کی قائل نہیں' مجھے یومِ آزادی کے جلسہ کی صدارت کرنا ہے۔مَیں سوچ رہی تھی کون سی ساڑھی پہنوں جو قیمتی بھی ہو اور پُرکشش بھی۔اور بال کس بیوٹی پارلر سے جا کر سیٹ کرواؤں۔وہ پرانا بیوٹی پارلر مجھے اب اچھا نہیں لگتا۔وہ ہر بار مجھے کہتا ہے کہ بیگم صاحبہ اب جو بال بنے ہیں آپ کے' ایسا سٹائل کسی کا نہیں۔میں تو ہفتہ بھر سے آپ کے بالوں ہی کا سوچ رہا تھا' مگر جب میں فنکشن پر جاتی ہوں تو وہاں پہلے ہی دو چار خواتین اسی سٹائل کے بالوں والی مِل جاتی ہیں۔اب مَیں نئے بیوٹی کلینک پر جاؤں گی۔آخر یومِ آزادی کے جلسے کی صدارت کرنا ہے' کوئی مذاق ہے؟ اِسی دن تو ملک کی طرح ہماری شخصیتیں بھی دولخت ہوئی تھیں۔ہم لوگ نئے ملک میں آ کر اپنے شہید مالکوں کے کاغذات دکھا کر دس مربعہ اراضی کے مالک بن گئے تھے۔ہم نے پرانے طریقے بدل دیئے تھے۔ہم نے عہد کر لیا تھا کہ یہاں اپنے عزیزوں سے بھی نہ ملیں گے' اس لئے کہ یہاں ہماری اولاد آغا جی کے منشی کے بچے نہیں کہلاتے بلکہ آغا جی کے صاحبزادے کہلواتے ہیں۔ہم بہت پُرانے زمیندار ہیں۔ہم نے کچھ زمین بیچ کر جننگ فیکٹری بھی لگا لی ہے' اسی لئے مَیں بیگم خان بن کر یومِ آزادی کو زبردست خراج پیش کرنا چاہتی ہوں۔بس ذرا سی ایک خلش ہے۔جب میں 14 اگست کا ذکر کروں گی تو کہیں ذہن کے کسی گوشے سے آغا جی کے گھرانے کا کوئی فرد اُبھر نہ آئے۔تمہیں کیا بتاؤں مولوی لوگ کہتے ہیں کہ شہید زندہ ہوتے ہیں اور مجھے یہ لوگ نظر آتے ہیں۔مَیں شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹروں سے مشورے لے چکی ہوں۔ڈاکٹر کہتے ہیں کہ کوئی این جی او بنا لو۔سوشل کاموں کی سرگرمیوں کے باعث اعصاب مصروف رہتے ہیں۔کچھ کا خیال ہے ناقص غذائیں معدے میں گیس پیدا کرتی ہیں۔یہ دیکھو! میرے پلنگ کے قریب الماری میں بیش بہا دواؤں کے انبار لگے ہیں۔اپنے کمرے کے سارے روزن' سارے دریچے بند کرنے کے باوجود جیسے تم اندر آ گئی ہو' اسی طرح وہ مرحوم روحیں کبھی میرے اردگرد منڈلاتی رہتی ہیں۔اس ٹھنڈے کمرے میں بھی میرے سینے میں جلن رہتی ہے' اللہ کے لئے تم چلی جاؤ۔مجھے آزادی کے دن کی کوئی خبر نہ سناؤ۔مجھے خواب آور گولیاں کھا کر سو جانے دو۔جاؤ چلی بھی جاؤ کہ میں سونا چاہتی ہوں۔کل رات میں وہ تقریر یاد کروں گی جو میرے شوہر خان صاحب کسی سے لکھوا لائے ہیں۔یہ کم بخت لکھنے والے بھی بعض اوقات ایسے ایسے الفاظ لکھ دیتے ہیں کہ پڑھنے اور ادا کرنے بھی مشکل ہو جاتے ہیں' مگر مَیں کیا کروں میرے بچے تو میری زبان بھی بُھولتے جا رہے ہیں' وہ نئی زبان بولتے ہیں۔انہوں نے گھر کا ماحول بھی ایسا ہی بنا لیا ہے۔کہیں برابر والے کمرے میں میری بچی کسی انگلش ناول میں کھوئی ہوگی۔دوسری کمپیوٹر پر کوئی غیر ملکی فلم دیکھ رہی ہوگی۔باپ شہر کے کسی بڑے ہوٹل میں اپنے سرمائے کا مصرف تلاش کر چکا ہوگا اور بیٹا سُریلے ہارن بجاتا کیا پتہ کن علاقوں میں اپنی کار دوڑا بھگا رہا ہوگا۔میں اتنا بھرا پڑا گھر رکھتے ہوئے اکیلی ہوں۔اب تم بھی جاؤ' مجھے تنہا چھوڑ دو۔جاؤ بھی نا۔''

کرن سرک کر نیچے اُتر آئی' ایک سیلی سیلی اندھیری گلی کے میلے دروازے پر دھیرے سے آواز دی' تو دروازہ خود بخود کُھل گیا' جیسے بند ہی نہ کیا ہو۔چٹائی پر ایک بڑھیا اپنی بیٹی سے لپٹی پڑی تھی۔

''اماں! وہ آج کا دن ہی تھا جب غنڈوں نے ہمارے محلے پر حملہ کیا تھا' ابا ہمیں بچاتے بچاتے شہید ہو گئے تھے اور تیرے تین کڑیل جوان بیٹوں نے تیرے سامنے دم توڑ دیا تھا۔ان درندوں نے تیرے حلق میں تیرے

بیٹوں کا خون ٹپکایا تھا اور تیرے بال نوچ کر تجھے آنکھیں کھول کر دیکھنے پر مجبور کر کے مجھے ۔۔ ماں تُو ہر رات عین اُس وقت اُٹھ کر نفل پڑھتی ہے جب تیرے بیٹے اور تیرا خاوند شہید کر دیئے گئے تھے۔ تیرا کہنا ہے کہ تُو اس ملک کی سلامتی کے لئے نفل پڑھتی اور دعائیں مانگتی ہے جس کی تعمیر میں تیرے خاوند اور تیرے بیٹوں کا لہو اور تیری بیٹی کا تقدس کام آیا۔ تُو آج بھی نفل پڑھے گی ناں ماں؟''

''ہاں! اس لئے کہ اتنی قربانیوں کے بعد جو شے ملے وہ جان سے بھی پیاری ہوتی ہے۔ مجھے پاکستان کی ہواؤں سے اپنے بچوں کے لہو کی خوشبو آتی ہے۔ مجھے یہ ملک اور اسے آزادی دلانے والا یہ مہینہ بہت عزیز ہے۔ میرا جی چاہتا ہے مَیں اس چوکھٹ پر پورا مہینہ سجدہ کئے رہوں اور سجدے میں ہی دم توڑ دوں۔''

ہمیں ہمت ہی نہ پڑی کہ ماں بیٹی کی گفتگو میں مداخلت کریں بلکہ میرا جی چاہا میں بھی اس ماں کے ساتھ ایک سجدہ ادا کروں۔ میری ساتھی کرن مچل کر آگے بڑھ گئی۔

''بیگم صاحبہ! یومِ آزادی آ رہا ہے''۔ اس نے ایک این جی او کی صدر صاحبہ سے کہا جو اپنے پلنگ پر دراز کسی فیشن میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھے بغیر جواب دیا: ''اچھی بات ہے۔ مگر تم اس کا استقبال کیسے کرو گی۔ پہلے یہ بتاؤ کس پارٹی کی طرف سے منایا جائے گا۔ کیونکہ پارٹی بری ہو یا اچھی، ہمیں تو وہ پارٹی عزیز ہے جو ہمارے مفاد کا خیال رکھے۔ جلسہ کی صدارت کی قیمت ایک خوبصورت ساڑھی، میری ورکروں کو نعرے لگانے اور تالیاں پیٹنے کا انعام۔''

کرن گھبرا کر بولی: ''آپ سمجھتی کیوں نہیں صدر صاحبہ۔ مَیں تو آپ سے یومِ آزادی کا پوچھ رہی ہوں۔ اس کا تعلق ملک کے ہر فرد سے ہے۔ ہر دل سے، ہر ذہن سے ہے۔ آپ کے جذبے کی بات ہے۔''

''کیا حماقت ہے؟ میں کچھ نہیں جانتی۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ ہماری خواتین کو یورپی خواتین جیسے حقوق کی آئینی ضمانت دی جائے۔ اس یومِ آزادی

دلیرانِ گیاری

ایوالانچ کیسے آتی ہے؟ برف کا توازن بگڑ جائے تو یہ عمل جنم لیتا ہے۔ بھاری برف باری کے بعد ڈھلوانوں پر بوجھ میں اضافہ، درجہ حرارت میں تبدیلی اور تیز ہواؤں وغیرہ کی وجہ سے برف کی تہوں میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں جس کے نتیجے میں برف کا یک جان تودہ اپنی یکسانیت کھو بیٹھتا ہے اور غبار بن کر دُور دُور تک تیز رفتاری سے پھیلتا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کی رفتار کم ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے۔ دھماکے یا اونچی آواز سے فضا میں جو لہریں تحلیل ہوتی ہیں، ان کی وجہ سے بھی چٹانوں پر برف کے بڑے تودے کھسک اور لڑھک کر قیامت برپا کر دیتے ہیں۔

سات اپریل 2012ء کو سیاچن کے گیاری سیکٹر میں ایوالانچ نے پاک فوج کے ایک کیمپ کو لپیٹ میں لیا جس سے ایک سو انتالیس افراد شہید ہو گئے۔ سپاہی سے لیفٹیننٹ کرنل تک کے رینک کے مردانِ دلیران میں شامل تھے۔ پاک فوج اپنی مومنانہ جرأت و ایثار اور باہمی محبت کی روایات پر عمل کرتے ہوئے دُنیا کے سرد ترین، بلند ترین محاذِ جنگ پر اگلے ہی روز برف کے خوفناک پہاڑ سے بھڑ گئی اور اس کی بے رحم کوکھ سے شہیدوں کی میتیں نکالنے اور حیران کُن دلیری کا نیا باب لکھنے کا آغاز کر دیا۔ دلیرانِ باوفا نے اپنی جانوں پر کھیل کر وسط دسمبر 2012ء تک ایک سو اکیس شہیدوں کے جسدِ خاکی خونیں پہاڑ کی گہرائیوں سے نکال لیے۔ وفا کا سفر جاری ہے۔

نظر میں آگ سی بھر دے، شرارا برف باری کا
وفا کی داستانیں ہیں، ہے قصہ دل فگاری کا
بلندی برف زاروں کی، ہے دفتر جاں سپاری کا
شہیدِ باسعادت ہے، وہ پیارا ذاتِ باری کا
شجاعت اب حوالہ ہے، ''شہیدان گیاری'' کا

[مرسلہ: حُر رضا College of E&ME]

پرامتحانات منسوخ کئے جائیں۔''

کرن چیخ کر بولی:''سنیں! مَیں پوچھ رہی ہوں پاکستان کا برتھ ڈے تم کیسے مناؤ گی''۔

''اگر پارٹی کسی فائیو سٹار ہوٹل میں ہو یا میرے بتائے ہوئے گیسٹ ہاؤس میں، ٹی وی کوریج ہوگی تو میں پروَمس کرتی ہوں بہترین پرفارمنس دیں گی میری ورکرز۔ اپنے ملک کے لئے یہی میرا برتھ ڈے پریذنٹ ہوگا''۔

میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کرن مجھ سے زیادہ گھبرا چکی تھی، مگر وہ مایوس نہ تھی۔ ابھی وہ اور چہرے پڑھنا چاہتی تھی۔

کتنی جھنڈیاں، کاغذ کی، کپڑے کی تیار ملیں گی؟

''آرڈر بک کروا لیجئے۔ مگر خیال رہے مہنگائی نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، ان جھنڈیوں کی قیمت بھی''۔۔۔

''فکر نہ کرو، ہم دیں گے۔ بس جھنڈیاں تیار ملیں۔ جلسہ گاہ بُک ہو چکی ہے۔۔۔ پارٹی بیعانہ دے چکی ہے۔ تم زیادہ رقم لاؤ۔ بیعانہ منسوخ کر دیں گے۔ فرنیچر، دریاں، لاؤڈ سپیکر۔ یومِ آزادی پر بہت مانگ ہے۔ کرایہ بڑھے گا۔ یومِ آزادی پر ریٹ عام دنوں سے زیادہ ہوں گے۔''

پیسہ پیسہ پکارتے یہ لوگ! ان کے جذبے، ان کا جوش، ان کا ولولہ کہاں گیا؟ وہ ولولہ جو ملک سے، قوم سے پیار سکھاتا ہے، جس کا تعلق رُوح کی گہرائیوں سے ہوتا ہے۔ ہم یہ سب کچھ وہاں سے دیکھ سُن کر آگے چل دیئے۔ ایسی چیزیں زیادہ دیر دیکھنے کی تاب ہی کسے تھی۔

اب کرن اور مَیں ایک بڑا میدان عبور کر کے یومِ آزادی کے سلسلے میں شائع ہونے والے اخبارات کی طرف چلی گئیں۔ آرٹ ایڈیٹر ایک میز پر کاغذ پھیلائے حیران پریشان بیٹھا تھا۔ اشتہارات آتے جا رہے تھے اور مضامین نکالے جا رہے تھے۔ اخباری اشتہاروں کا ایک ہی نعرہ ہوگا:''ہم یومِ پاکستان پر اہلِ وطن کو مبارک باد دیتے ہیں۔''

ایک کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ صحافی دھیمی دھیمی روشنی میں بار بار لکھتا اور کاغذ کا گولا بنا کر پھینک دیتا۔ پھر انہماک سے لکھنے لگتا اور بُڑبڑانے لگتا: مَیں کیا لکھوں؟ مَیں کیوں لکھوں؟ مَیں کس کے لئے لکھوں؟ خونچکاں واقعات، سوگوار حادثات، ماضی کی داستانیں، لہو میں ڈوبی زندگیوں کی تصویریں۔ کیا کچھ نہیں لکھنا چاہتا؟ وہ پرانے البم سے تصویریں نکال کر آرٹ ایڈیٹر کے حوالے کر دیتا ہے تاکہ مضمون لکھنے سے چھٹکارا مل جائے۔

کرن اب مایوس ہو کر ٹھہر گئی، بولی:''تم جو میرے ساتھ ماری ماری پھرتی رہی ہو، تم اب اپنی ذمہ داریاں کیسے نبھاؤ گی''۔

''ہاں! یومِ آزادی کی ذمہ داریاں۔ تعمیرِ وطن کی ذمہ داریاں؟

مَیں نے کہا:''تم بھی بارہا دیکھ چکی ہو متروکہ املاک پر اکثر مقامی لوگوں کا قبضہ ہے، مگر اس کے باوجود مَیں اپنی ذمہ داریاں نبھاؤں گی، کہ ان سب چہروں کو ایک تحریر میں پرو کر ماہِ آزادی کی اُس چوکھٹ پر سجاؤں گی جس پر لکھا ہوگا: پاکستان-زندہ باد! اس کے دروازے انشااللہ جلد کُھلیں گے۔ وہاں سے رشوت، سفارش، بے ایمانی اور وطن دُشمنی کے ناسوروں کے خاتمے کی نوید سنائی دے گی۔ آزادی کے لیے اپنا گھر بار، عزت و ناموس اور جان تک قربان کر دینے والوں کی حوصلہ بخش تصویر دکھائی دے گی۔ منہ سے بولتی تصویر:'' اے اہلِ پاکستان! جہاں بھی ہو، جو کچھ بھی ہو، اپنا فرض ایمانداری سے نبھاتے چلو۔ رشوت، سفارش، لوٹ مار، بددیانتی اور منافقت کا خاتمہ ہونے کو ہے- پاکستان-زندہ باد!!

مجھے کاغذوں پر جُھکے پا کر کرن نہ جانے کدھر کو بھٹک گئی!

اچانک دل سے آواز بلند ہوئی: پاکستان - زندہ باد!!

وطن کی خدمت

نظر زیدی

بزرگ خاتون بان سے بُنے پلنگ پر تکئے کے سہارے اس شان سے بیٹھی تھیں جیسے کسی بادشاہ کی ملکہ تخت پر بیٹھی ہو۔ پلنگ کے قریب کرسی پر ان کا بیٹا تھا اور ذرا فاصلے پر تین خوب صورت گول مٹول بچے کھیل رہے تھے۔ یہ گاؤں کے ایک سادہ، لیکن صاف ستھرے گھر کا کشادہ صحن تھا جس میں امرود، آم اور جامن کے درخت اور پھولوں کے پودے بہار دکھا رہے تھے۔ درختوں پر ننھی منی چڑیاں گیت گاتی یہاں سے وہاں آ جا رہی تھیں۔ اس کچے گھر کی ہر چیز بہت پیاری لگ رہی تھی، لیکن خاتون کے بیٹے میاں آصف علی کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ خاتون کچھ دیر خاموش نظروں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھتی رہیں، پھر پیار بھری آواز میں بولیں: ''بیٹے! تمہارے چچا کے گھر کی بربادی کا خود ہمیں بھی بہت رنج ہے، لیکن کیا کیا جا سکتا ہے۔ یہ تو اصل میں ان کے غلط کاموں ہی کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے جیسے بیج بوئے تھے، ویسی ہی فصل تیار ہوئی''۔

''امی جان! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' میاں آصف نے چونک کر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ خاتون نے کہا: ''ٹھیک کہہ رہی ہوں بیٹے! انہوں نے جیسے کام کئے تھے، ویسا نتیجہ بھگتا''۔ بیٹے نے جواب میں کہا: ''یہ آپ کیا فرما رہی ہیں امی جان! اللہ تعالیٰ کے فضل سے چچا جان تو ملک کے بہت معزز لوگوں میں گنے جاتے تھے۔ ماشاء اللہ بڑی جائیداد کے مالک تھے۔ میرے نزدیک تو ان کی زندگی مثالی تھی۔ مَیں اکثر سوچتا تھا کہ کاش ابا جان بھی اُن کی طرح کوشش کرتے۔ کاش ہمارے پاس بھی اتنی دولت ہوتی جتنی اُن کے پاس ہے''۔ خاتون بولیں: ''اس کی وجہ یہ ہے بیٹے کہ تم اصلی اور نقلی عزت کے فرق پر غور نہیں کر رہے، سچی اور جھوٹی شان کے فرق کو نہیں سمجھ رہے، اللہ تعالیٰ اُنہیں معاف کرے، اُنہوں نے تو روپے پیسے کو خدا سمجھ لیا تھا اور اسے حاصل کرنے کے لئے بے حد لالچی اور بے رحم بن گئے تھے، اسی کے نتیجے میں اس برے انجام کو پہنچے۔ میرے نزدیک تو اُنہوں نے ایک طرح خودکشی کی جو بہت ہی بُری موت ہے۔'' آصف بولا: ''نہیں امی جان! نہیں، ہم اُن کی موت کو خودکشی نہیں کہہ سکتے۔ دل کا دورہ تو اس زمانے کی عام بیماری ہے اور اُن کا انتقال اس بیماری سے ہُوا''۔ خاتون نے جواب دیا: ''بہرحال جو کچھ بھی ہُوا، جو لوگ اس دنیا سے چلے جائیں، اُن کے برے کاموں پر بحث نہیں کرنی چاہئے۔ مَیں نے تو چند باتیں اس لئے کہہ دیں کہ تم اچھائی برائی کا فرق سمجھ لو''۔

آصف بولا: ''شکریہ امی جان! اگر چچا جان کی زندگی کا کوئی خاص راز ہے، تو مجھے بھی بتائیے۔ اچھائی بُرائی کا فرق معلوم نہ ہو، تو آدمی بُرائی میں پھنس جاتا ہے۔''

بیٹے کی یہ بات سن کر خاتون نے کہا: ''مجھے یہ کل کی بات لگ رہی ہے کہ 1947ء میں ہم سب ایک قافلے کے ساتھ پاکستان آئے تھے۔ اس وقت میری عمر پندرہ برس تھی۔ کچھ دن مہاجر کیمپوں میں مصیبتیں برداشت کرنے کے بعد تمہارے ابا نے اس گاؤں میں یہ گھر اور تھوڑی سی زمین الاٹ کرائی۔ گھر بس نام ہی کا گھر تھا۔ شاید ہم جیسے کسی غریب ہندو یا سکھ کا ہوگا جو بھارت چلا گیا تھا۔ تمہارے چچا نے زیادہ بھاگ دوڑ کی

اور گاؤں میں زمین، مکان اور دکان الاٹ کرانے کے علاوہ لاہور میں بھی ایک مکان اور دکان پر قبضہ کر لیا''۔ بیٹے نے سوال کیا: ''ابا جان نے ایسی کوشش کیوں نہ کی؟'' خاتون نے جواب دیا: ''اس لئے کہ تمہارے ابا اور چچا کی طبیعتوں میں بہت فرق تھا۔ تمہارے ابا حق اور انصاف کو ماننے والے پکّے مسلمان تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ نئے وطن میں ہم مال و دولت حاصل کرنے نہیں آئے، بلکہ اپنے دین کی حفاظت کرنے آئے ہیں۔ ہم اسے ایک ایسا ملک بنائیں گے جس سے اسلام اور مسلمانوں کی شان بڑھے گی''۔ بیٹے نے ایک اور سوال کیا: ''اور چچا جان؟'' خاتون بولیں: ''بیٹے! تمہارے چچا کا حال شروع ہی سے کچھ اور طرح کا تھا۔ نام ان کا مسلمانوں جیسا تھا، لیکن کام مسلمانوں جیسا نہ کرتے تھے۔ نماز روزے کی پابندی نہ کرتے تھے۔ ان کی اور تمہارے ابا کی زندگیوں میں اتنا فرق تھا کہ دونوں سگے بھائی لگتے ہی نہ تھے''۔ آصف بولا: ''اسی لئے وہ ابا جی کے ساتھ نہ رہے''۔ تمہارے ابا جی کے ساتھ کس طرح رہتے بیٹے، وہ تو یہاں آتے ہی رئیسِ اعظم بننے کی فکر میں لگ گئے تھے۔ اس زمانے میں لُوٹ مار کی گنجائش بھی بہت تھی۔ ایسے ایسے لوگ کوٹھیوں اور بنگلوں کے مالک بن گئے، جنہیں بجلی کا پنکھا چلانا اور بند کرنا نہ آتا تھا''۔ آصف نے کہا: ''اگر یہ حالت تھی تو ابا جی کو بھی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ کم سے کم اپنا حق تو لے لیتے۔ آپ ہی کہا کرتی ہیں کہ امرتسر میں ہماری بہت بڑی حویلی، مکان اور زرعی زمین تھی''۔ خاتون بولیں: ''بیٹے، ان کے خیالات ہی کچھ اور تھے۔ وہ تو ان لوگوں میں سے تھے جو لیتے کم اور دوسروں کو دیتے زیادہ ہیں۔ وہ ہجرت کر کے اس ملک کو بنانے اور سجانے سنوارنے کے لئے آئے تھے، انہوں نے یہی کیا۔ پہلے خود گارا مٹی ڈھو کر اس مکان کو رہنے کے قابل بنایا، اس کی چھتیں ٹھیک کیں، دیواروں اور دروازوں کی مرمت کی اور پھر سکول میں بچوں کو پڑھانے لگے''۔ آصف بولا: ''انہیں خیال نہیں تھا تو آپ ہی انہیں کم سے کم اپنا حق لینے پر آمادہ کرتیں''۔ خاتون نے جواب دیا: ''اول تو اس زمانے میں مجھے ایسی باتوں کا خیال ہی نہ تھا۔ دوسرے اللہ تعالیٰ کے خاص فضل سے میرے خیالات بھی تمہارے ابا جی جیسے ہی تھے۔ مَیں بھی ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ'' ہی کہتی تھی۔ ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی، بس دونوں ہی اپنے اس نئے وطن کی تعمیر میں لگ گئے۔ تمہارے ابا جی کے ساتھ مل کر پہلے اس گھر کو سنوارا اور پھر پاس پڑوس کے بچوں کو قرآن پڑھانے لگی۔ یہ اس گھر کے صحن میں جو درخت تم دیکھ رہے ہو، یہ مَیں نے ہی لگائے تھے۔ بس ایسے ہی ننھے ننھے پودے لگا دیئے تھے۔ یقین بھی نہیں تھا کہ پروان چڑھیں گے، لیکن تم دیکھ رہے ہو، اب یہ تناور درخت بن گئے ہیں۔ کتنا پھل آتا ہے ان پر''۔

آصف نے کہا: ''میں تو خیال کرتا ہوں امی جان، آپ دونوں سے تھوڑی سی بُھول ضرور ہوئی ہے۔ اگر آپ دونوں بھی ذرا سی کوشش کر لیتے تو چچا جان کی طرح بڑی جائیداد کے مالک ہوتے۔ کار اور کوٹھی والے ہوتے''۔ خاتون بولیں: ''اور شاید ہمارا انجام بھی اُنہی جیسا ہوتا۔ میرا تو رُواں رُواں کانپ اُٹھتا ہے جب اس طرف دھیان جاتا ہے کہ سب کچھ ہونے کے باوجود اُن کا گھرانہ کس طرح تباہ ہو گیا۔ ایک بیٹا نشے کا عادی ہو کر ناکارہ ہو گیا، دوسرا غبن کے کیس میں پکڑا گیا اور خود شاید اسی صدمے سے آناً فاناً مر گئے''۔

''امی جان، یہ تو ایک اتفاقیہ بات ہے۔ ایسے حالات تو بہت سے نیک لوگوں کے بھی ہو جاتے ہیں''۔

خاتون بولیں: ''نہیں بیٹے تمہیں معلوم نہیں۔ میرا دل تو یہی کہتا ہے کہ تمہارے چچا جان کو اُن کے گناہوں کی سزا ملی ہے۔ اُن کی اتنی بڑی جائیداد کا کوئی اصل وارث بھی نہیں رہا۔ تمہاری چچی ضرور زندہ ہیں، لیکن اُن کی حالت مُردوں سے بُری ہے، غم کی وجہ سے پاگل سی ہو گئی ہیں بے چاری''۔ آصف بولا: ''امی جان آپ کچھ بھی کہہ لیں، مَیں تو یہی محسوس کرتا ہوں کہ ابا جان نے اپنے ساتھ زیادتی کی۔ جب وہ آسانی

سے بہت کچھ بنا سکتے تھے تو انہیں بے پروائی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ آدمی اپنی زندگی میں کچھ بنا جاتا ہے تو اس کی نسلیں کھاتی ہیں''۔

بیٹے کی یہ بات سن کر خاتون کچھ دیر اس کی طرف دیکھتی رہیں، پھر رک رک کر بولیں: ''بیٹے! تمہارے دل میں ایسے خیالات اس وجہ سے آ رہے ہیں کہ تم ان جذبوں سے واقف نہیں ہو جن کی برکت سے یہ پاکستان حاصل ہُوا۔ اُس زمانے میں جس کے دل میں رائی برابر بھی ایمان تھا، وہ یہی سوچ کر اس ملک میں آیا تھا کہ اسے نمونے کا ملک بنائے گا۔ اسے لُوٹنے تو وہ لوگ لگ گئے تھے جن کے دل ایمان کے نور سے خالی تھے۔ کاش وہ اس ملک میں نہ آتے اور جو پہلے سے یہاں تھے، وہ یہاں نہ رہتے۔ ایسے ظالموں نے اس ملک کو بھی لُوٹ لیا اور خود بھی لُٹ گئے''۔

''چلیئے ایسے لوگوں کا جو حال ہُوا، سو ہُوا، لیکن نیکی کا راستہ اپنانے والوں کے ہاتھ کیا آیا؟ اپنے آپ ہی کو دیکھیئے، آج پینسٹھ برس بعد بھی اس کچے گھر میں بیٹھی ہیں اور آپ کا اکلوتا بیٹا اپنے باپ کی طرح گاؤں کے سکول میں بچوں کو پڑھا رہا ہے''۔

خاتون کی آواز میں اب کسی قدر غصہ تھا۔ ذرا دیر سوچ کر بولیں: ''میں تو تمہاری یہ باتیں سن کر حیران ہو رہی ہوں۔ یوں لگتا ہے تم بھی اُنہی لوگوں کی طرح سوچنے لگے ہو جنہوں نے اس ملک کو لُوٹا اور تمہارے چچا کی طرح خود کو برباد کیا۔ میری بات غور سے سنو! جب تم پیدا ہوئے تھے تو میں نے یہ خیال کیا تھا کہ اس باغ میں، جس کا نام پاکستان ہے، ایک ایسا نیا پودا اُگا ہے جو اس کی رونق اور شان بڑھائے گا۔ پھر میں نے تمہاری پرورش اس طرح کی جس طرح ایک نازک پودے کی کی جاتی ہے''۔

آصف بولا: ''تو امی جان اللہ کے فضل سے میں نے اپنے ملک کی شان بڑھائی ہے، اس کی خدمت کی ہے۔ آپ نے یہ کیوں خیال کر لیا کہ میں اس ملک کو لُوٹنے اور بدنام کرنے والوں جیسا بن گیا ہوں۔ یہ بات تو بس یونہی میری زبان پر آ گئی تھی''۔

''اور میں کہتی ہوں بیٹے! یہ بات ایسی فضول اور ناپاک ہے کہ یونہی بھی تمہاری زبان پر نہ آنی چاہیے تھی۔ جس چیز کو گناہ کہتے ہیں اور جو آخر کار انسان کو برباد کر دیتا ہے، اس کی ابتداء خیالات میں خرابی آ جانے ہی سے ہوتی ہے۔ جب انسان کے دماغ میں یہ خیال آ جاتا ہے کہ نیکی کے راستے پر چلنے والے گھاٹے میں رہتے ہیں، اصل کامیابی جھوٹ بولنے اور دھوکے بازی کرنے سے ہوتی ہے تو پھر دل میں ایسے کام کرنے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے اور آدمی گناہوں کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ میرے پیارے بیٹے! سچے دل سے توبہ کرو اور وعدہ کرو کہ ایسے برے خیالوں کو اپنے دماغ میں کبھی نہ گھسنے دو گے''۔

آصف ہنستے ہوئے بولا: ''امی جان! میں نے کہا تو ہے کہ میں ایسے لوگوں میں شامل نہیں ہوں جو اس ملک کو لُوٹ رہے ہیں۔ آپ کی دعاؤں کے طفیل مَیں اپنے عزیز وطن کی خدمت کر رہا ہوں اور یہی سمجھتا ہوں کہ ہماری ساری شان ہمارے اس وطن کی وجہ سے ہے جو ہم نے بڑی قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا۔ بے شک آپ یہ کہیں کہ یہ کامیابیاں چچا جان نے غلط راستے پر چل کر حاصل کیں، لیکن اس بات سے تو انکار نہیں کر سکتیں کہ وہ بہت امیر تھے اور شہر بھر میں ان کی بہت عزت کی جاتی تھی۔ میرا مطلب یہ نہیں امی جان، میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ جو آرام وعزت دوسرے لوگوں کو حاصل ہے، ہم اس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔ چلیئے چچا جان کو جانے دیجئے، اپنے دوسرے پڑوسی کو ہی دیکھیئے۔ آپ ہی نے بتایا تھا کہ امرتسر میں ہمارے پڑوسی تھے اور منیاری کی چھوٹی سی دکان کرتے تھے، اب بہت بڑے بزنس مین ہیں اور ہمارے چچا کی طرح ان پر کسی طرح کی مصیبت بھی نہیں پڑی۔ کیسے ہٹّے کٹّے ہیں۔ اولاد بھی خوب پُھول پھل رہی ہے۔ اللہ کا شکر ہے، ہمیں کسی طرح تنگی نہیں۔ اچھا کھاتے اور اچھا پہنتے ہیں، لیکن ان جیسی حالت تو نہیں ہے''۔

خاتون سنبھل کر بیٹھ گئیں اور سمجھانے کے انداز میں بولیں: ''بیٹے! مَیں

تمہاری اس بات کا جواب تو بعد میں دوں گی کہ عزت اور آرام ہمیں زیادہ حاصل ہے یا ہمارے پڑوسی اور ان جیسے دوسرے لوگوں کو۔ پہلے ایک اور بات سمجھانا چاہتی ہوں اور وہ یہ ہے کہ آدمی کو اپنا نقصان نظر ہی نہیں آتا' لیکن وہ ہوتا بہت بڑا نقصان ہی ہے۔ تمہارے چچا جیسے کم عقل لوگ برائی کا راستہ اختیار کر کے اپنا ایسا ہی نقصان کرتے ہیں۔ لُوٹ مار کے شوق میں انہیں یہ بات یاد نہیں رہتی کہ ان کے گناہوں کی وجہ سے ملک کمزور ہو رہا ہے۔ یہ چوری' ڈاکے' قتل و غارت کے واقعات' مہنگائی اور بے ایمانی' سب انہی کی وجہ سے ہے۔ ایک بات مثال کے طور پر بیان کروں تو یوں کہوں گی کہ پاکستان ایک جہاز ہے جس میں ہم سب سوار ہیں' یہ جہاز اس صورت میں اچھی حالت میں رہ سکتا ہے کہ جتنے بھی لوگ اس میں سوار ہیں' اس کی دیکھ بھال کریں۔ کوئی چیز ٹُوٹ جائے تو فوراً نئی لگا دیں' لیکن کئی کم بخت اس کی چیزوں کو خراب کر رہے ہیں۔ کوئی کیل نکال لیتا ہے' کوئی تختہ اُکھیڑ دیتا ہے' کوئی رنگ و روغن خراب کر رہا ہے اور یہی وہ نقصان ہے جسے مَیں نے بہت بڑا نقصان کہا اور جسے یہ بد بخت نقصان مانتے ہی نہیں''۔

آصف بولا: ''آپ کی یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ اللہ نہ کرے! پاکستان کمزور ہو گیا تو ہم سبھی خطرے میں پڑ جائیں گے''۔ خاتون بولیں: ''پیارے بیٹے! کوئی مانے یا نہ مانے' لیکن غلط کام کرنے کی صورت یہ ہوتی ہے جیسے کوئی کسی دیوار میں سے ایک اینٹ نکال لے۔ جس طرح زیادہ اینٹیں نکل جانے سے دیوار گر جاتی ہے' اسی طرح زیادہ گناہ کرنے والوں کے ملک تباہ ہو جاتے ہیں''۔

آصف بولا: ''بالکل ٹھیک امی جان۔ بالکل ٹھیک' میں تو سچے دل سے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آج تک کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے میرے پیارے وطن کو کسی طرح کا نقصان پہنچتا یا اس کی شان کم ہوتی۔ ایک غلط خیال دماغ میں آ گُھسا تھا جس کے لئے اللہ سے توبہ کرتا ہوں۔ آپ بھی دعا کیجئے کہ اللہ میرا یہ گناہ معاف کر دے اور اس راستے پر چلائے جو آپ نے اور ابا جی نے دکھایا ہے''۔

خاتون نے خوشی سے کہا: ''اللہ تعالیٰ کا شکر ہے تمہاری سمجھ میں یہ بات آ گئی ہے۔ اب سنو آرام اور عزت کی بات' اور وہ یوں ہے کہ سچا آرام اور سچی عزت آدمی کو نیکی کے راستے پر چلنے سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ ایک تو اسے اللہ پاک کی طرف سے مدد ملتی رہتی ہے' دوسرے اس خیال سے اس کا دل مطمئن رہتا ہے کہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا' بلکہ ایسے کام کئے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کے بندوں کو راحت پہنچتی ہے۔ اس کے مقابلے میں برائی کی راہ پر چلنے والے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم رہتے ہیں اور یہ خوف آگ کے انگارے کی طرح ان کے دل و دماغ میں رہتا ہے کہ ہماری برائی کا حال کُھل نہ جائے۔ ایسے مجرم پکڑے بھی جاتے ہیں۔ بزرگوں نے کہا ہے سو دن چور کے' ایک دن کوتوال کا۔ یعنی چور کبھی نہ کبھی پکڑا ضرور جاتا ہے اور اپنے کئے کی سزا پاتا ہے''۔

آصف بولا: ''گناہ کرنا تو سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ میں ایک بار پھر توبہ کرتا ہوں۔ ان شاء اللہ کبھی بُھول کر بھی کوئی ایسی بات نہ سوچوں گا جسے گناہ کہا جاتا ہے اور امی جان! مَیں اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہوں لوگ میری بھی تعریفیں کرتے ہیں اور ابا جی کی بھی۔ آپ دعا کیجئے اللہ تعالیٰ مجھے وطن کی خدمت اور سیدھے راستے پر چلتے رہنے کی توفیق دے''۔

خاتون خوشی سے بولیں: ''اور یہ توفیق بھی دے کہ تُو وقت آنے پر اپنے وطن پاکستان کے لئے جان بھی قربان کر دے۔ ادھر آ! مَیں تیری پیشانی پر بوسہ دوں''۔

آصف نے امی کی طرف سر جھکا دیا۔ انہوں نے اس کی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیئے اور اسے یوں لگا کہ نور کی ایک لہر اُس کے پورے وجود میں اُتر گئی۔

کشمیر کا تحفہ

الطاف فاطمہ

اپنا لیکچر ختم کر کے رجسٹر اور میز پر بکھرے چند ضروری کاغذات ابھی سمیٹ رہی تھی کہ عقب سے ایک ملائم سی آواز سنائی دی۔ چونک کر مڑی تو دیکھا کہ وہ اپنی اسائنمنٹ والی فائل ہاتھ میں پکڑے بلا تمہید مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میڈم! مَیں نے یہ مارچ تک کی اسائنمنٹ مکمل کر لی ہے۔ آپ اچھی طرح پڑھ لیں اور اپنے ریمارکس لکھ دیں پلیز!

یہ آواز پہلے کبھی سنی ہوئی لگتی تھی، نہ صورت آشنا تھی لیکن میں نے گھوم کر اس کی طرف غور سے دیکھا اور سوال کیا: ''مگر آپ ہیں کون؟''

میں چار سال آپ ہی سے پڑھتی رہی ہوں اور آپ کی کلاس بھی ہمیشہ اٹینڈ کرتی ہوں۔

''کل تک آپ دیکھ لیں گی؟''

''کیوں تم کو اتنی جلدی کیا ہے؟ اور یہ مارچ کی اسائنمنٹ ہے۔ مارچ تو ابھی دُور ہے۔ دیکھ لوں گی۔''

''نہیں مس! آپ جلدی دیکھ لیں۔ مارچ میں مَیں یہاں نہیں ہوں گی۔ مَیں نے لمبی چھٹی لی ہے اور اگلے ہفتے ہمیں جانا ہے ملک سے باہر۔''

تیسرے دن جب وہ اپنی فائل لینے واپس آئی تو میں نے مسکرا کر اس کی فائل اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا: ''میں نے ریمارکس لکھ دیئے ہیں۔ آپ واقعی کلاس بہت باقاعدگی سے اٹینڈ کرتی رہی ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ آپ بہت توجہ سے لیکچر سنتی اور نوٹس بناتی رہی ہیں۔''

کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے کہا: ''آپ نے مجھ سے پوچھا نہیں کہ مَیں کہاں جا رہی ہوں؟ مس! میں مقبوضہ کشمیر جا رہی ہوں۔''

''ارے نہیں!'' اب مجھے پھر اس کی پُراسراریت مشکوک نظر آ رہی تھی۔

''بھلا وہاں کوئی پاکستانی جا سکتا ہے؟ وہاں کا تو ویزا ہی نہیں ملتا۔''

''لیکن مس، جو کشمیری خاندان 1947ء میں یہاں آ گئے تھے خاص طور پر سری نگر وغیرہ سے اور ان کے خاندان کے اکثر لوگ وہاں رہ گئے، ان کو شادی بیاہ یا مرگ کے موقع پر ویزے مل جاتے ہیں۔ ہم کو ویزا اسی لئے مل گیا ہے کہ وہاں ہمارے خاندان میں اکٹھی چار پانچ شادیاں ہوں گی۔ بات یہ ہے کہ ایک بھائی وہاں ہے، دوسرا اِدھر؟ ایک سگی بہن اُدھر ہے تو دوسری اِس طرف، اس لئے وہ لوگ کئی شادیوں کی تاریخیں قریب قریب رکھ دیتے ہیں تاکہ یہاں سے جانے والے اپنے سب قریبی عزیزوں کی شادیوں میں شرکت کر سکیں''۔ اس نے اپنی فائل اٹھائی اور جاتے جاتے مڑ کر واپس آئی۔ ''مس! میں تو بھول ہی گئی تھی، آپ بتائیے کہ واپسی پر آپ کے لئے وہاں سے کیا لاؤں؟''

''ارے بھئی اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟ بس تم خیریت سے واپس

آ کر امتحان دینا اور اچھے نمبروں سے پاس ہو جانا۔ شاگرد کی طرف سے استاد کی لئے یہی بہترین تحفہ ہوتا ہے''۔ میں نے کہا۔

''نہیں مس! آپ بتائیں پلیز''

''اچھا، تو یوں کرنا کہ وادی میں پہنچ کر سرینگر' بارہ مولا' اسلام آباد' ڈل جھیل' شالامار باغ' غرض ہر ہر جگہ کو بہت غور سے اور شوق سے دیکھ کر آنا' تاکہ واپس آ کر کالج میگزین کے لئے ایک خوبصورت سا تاثراتی مضمون لکھ کر مجھے دے سکو۔''

''اچھا! مس آپ کشمیر کے بارے میں اتنا کچھ جانتی ہیں!'' ہم کچھ دیر توزکِ جہانگیری میں شامل کشمیر کے متعلق جہانگیر کے تاثرات پر بات کرتے رہے' پھر وہ اٹھ کر جاتے جاتے کہنے لگی: ''آپ جس جگہ کے بارے میں اتنا کچھ جانتی ہیں' وہاں کی کوئی سوغات بھی نہیں لینا چاہتیں؟ اچھا میں بتاؤں' میں آپ کے لئے کانگڑی لے آؤں گی۔''

''اچھا تم یوں کرنا کہ زعفران کے چند پھول لے آنا۔ ویسے جی تو چاہتا ہے کہ ان کو کھلتے ہوئے دیکھوں۔''

''اچھا مس' اللہ حافظ! بہت دنوں کے لئے۔''

''ہاں اللہ حافظ۔ اللہ تم کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔''

میں اسے دیکھ کر افسردہ ہو گئی۔ جہاں یہ لڑکی جانے والی ہے' سیّد علی شاہ گیلانی اور ان کے جان نثار' مردانِ جی وہاں پسِ دیوارِ زنداں ہوتے ہیں۔ ان پر تشدد ہوتا ہے اور زنداں سے باہر گڑی سولیاں ان پر چلنے والے مقدمات کے فیصل ہونے کی منتظر ہیں۔ آپ ہی آپ مجھے رہ رہ کر فلسطین کے حریت پسندوں پر ہونے والے تشدّد کا خیال آتا تھا۔

اسائنمنٹ کے طریقے اور سلیقے نے مجھے بہت بلکہ ضرورت سے زیادہ ہی متاثر کر دیا تھا۔ پھر کتنے ہی مہینے گزر گئے' بی اے فائنل کی وہ کلاس بھی کب کی جا چکی' وہ اب میرے دھیان سے اُتر چکی تھی۔ ایک دن میگزین کے آفس میں بیٹھی فائلوں میں گم تھی کہ محسوس ہُوا کوئی میرے قریب آ کھڑا ہُوا ہے۔ پہلی نظر میں پہچان ہی نہ پائی اور سرسری سوال کیا:

''ہاں' کیا بات ہے؟ کوئی چیز میگزین کے لئے دینا ہے کیا؟''

''مس! آپ پھر مجھے بھول گئیں؟''

چھوٹی سی نرم سی آواز شبنم کے ٹھنڈے قطرے کی طرح سماعت سے ٹکرائی' تو سب کچھ یاد آ گیا۔ ''ہائیں' اچھا اچھا' کب واپس آئیں اور امتحان کا کیا بنا؟''

''وہ تو اب سپلی ہی دوں گی مَیں۔''

''اچھا سناؤ کیسا رہا تمہارا ٹرپ۔ آؤ بیٹھو۔''

''مس! بڑا دلچسپ رہا اور اسی وجہ سے ہم جلد واپس نہ آ سکے۔ خاندان بھر کے لوگ اور عزیز جمع تھے۔ ہمارے بزرگوں نے تو ایک دوسرے کو پورے پینسٹھ برس بعد دیکھا۔ اور ہم لوگوں نے اپنے کزنوں اور عزیزوں کو زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا۔ عجیب سا احساس اور عجیب سی خوشی تھی۔''

''ہاں واقعی' تم لوگ تو پاکستان سے پہلی بار گئے ہو گے''۔

''صرف پاکستان سے نہیں' بلکہ لندن سے' کینیڈا' سعودی عرب' امریکہ سے کویت اور جاپان سے آئے ہوئے سارے ہی عزیز ایک دوسرے سے زندگی میں پہلی بار ملے اور لگ رہا تھا جیسے ہم سب ایک ہی گھر میں ایک ساتھ پلے بڑھے ہوں۔''

''اچھا' تو بڑوں کا کیا حال رہا؟'' میں نے سوال کیا۔

''مس! میرے پاس تو الفاظ ہی نہیں ان کا حال بیان کرنے کے لئے۔

کبھی ہنستے تھے' کبھی روتے اور پھر روتے روتے ہنسنے لگتے۔ پھر کہتے ہم ایک دوسرے سے بچھڑے تو سب کے سر سیاہ تھے اور اب سب کے سروں پر برفباری کا نور ہے''۔

کچھ دیر بعد اٹھ کر وہ جانے لگی۔ کمرے سے نکل کر دوبارہ اندر آئی اور بولی: ''مس! میرے پاس آپ کی ایک امانت ہے' ایک تحفہ ہے۔ وہی دینے آئی تھی۔''

''تم نے کمال کیا! میں نے تو اس تکلف سے منع کیا تھا۔ ہاں! میگزین کے لئے کچھ لوازمہ لانے کا ضرور کہا تھا۔''

''نہیں مس! میں وہ تو نہیں لائی۔ یہ آپ کو کچھ نوجوان طالب علموں نے بھیجا ہے۔ بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹا سا پیکٹ نکالا اور کہنے لگی کہ گزشتہ سال اس کے دو کزن آئے تھے انہوں نے میری وہ اسائنمنٹس اور نوٹس دیکھے تھے۔ انہوں نے مجھ سے خاص طور پر فرمائش کی تھی کی جب تم آنا تو آئندہ جو نوٹس اور اسائنمنٹس ہوں گی' وہ بھی ساتھ لیتی آنا۔ وہ ان کو پڑھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ وہ کہتے تھے یہ بہت ولولہ انگیز ہیں' ان میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن سے ہم کو لاعلم رکھا جاتا ہے اور ہم یہ سب جاننے کے لئے بے تاب رہتے ہیں۔

اس نے مجھے وہاں کے تعلیمی اداروں اور روّیوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔

''اچھا مس! آپ اپنا تحفہ تو کھول کر دیکھئے۔''

چھوٹے سے پیکٹ میں وادی میں کھلنے والے چند خوش رنگ اور خودرو خشک پھول اور تین پتھر تھے۔ میں تعجب سے ان پتھروں اور پھولوں کو دیکھ رہی تھی' تو وہ کہے جا رہی تھی: ''مس! جب میں نے ان کو بتایا کہ آپ کو کشمیر کے بارے میں اتنی معلومات ہیں اور اتنی دلچسپی ہے تو وہ بے حد متاثر ہوئے' انہوں نے ہمارا میگزین بھی دیکھا تھا۔ جسے میں لے گئی تھی ساتھ اپنے۔ یہ دیکھئے سرینگر کالج کا میگزین جو انہوں نے آپ کے دیکھنے کے لئے بھیجا ہے۔''

میں نے جلدی سے میگزین کھولا۔ اس کی تین حصے تھے۔ ایک انگریزی' دوسرا ہندی رسم الخط میں کشمیری زبان کا حصہ اور تیسرا اور آخری حصہ' چند صفحوں پر مشتمل اردو میں تھا۔ یہی ان نوجوانوں کا ایک معرکہ تھا کہ نہ جانے کس کس رکاوٹ کو عبور کر کے انہوں نے اردو کے ان چند صفحات کا اضافہ منظور کروالیا تھا۔

پھر اس نے کہا: ''مس! انہوں نے کہا تھا کہ تم اپنی مس کو ہمارا یہ پیغام دینا کہ اب ہمارے کھیتوں میں زعفران کے پھول نہیں مسکراتے۔ وہ ہندو کے کاروباری مقاصد کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ فی الحال ایک ٹوکن کے طور پر ہم آپ کو وادی کے یہ ننھے ننھے خودرو پھول اور چھوٹے چھوٹے پتھر بھیج رہے ہیں' ان شاءاللہ وہ دن بھی آئے گا جب آپ یہاں آ سکیں گی اور پھر ہم آپ کو زعفران کے مسکراتے ہوئے کھیت بھی دکھائیں گے۔''

''ارے! یہ کیسے ممکن ہے اور بھلا ہماری زندگی میں ایسا دن کیسے آئے گا!''

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

وہ بولی: ''مس' مجھے یقین ہے کہ ایسا دن آئے گا' اور ضرور آئے گا۔ میں نے ان لوگوں کو دیکھا ہے۔ اگر آپ ان کو دیکھ سکیں تو آپ بھی یہی کہنے لگیں گی۔ ایک لاوا ہے جو اُن کے سینوں میں پک رہا ہے' اُبل رہا ہے۔

میں نے گھر جا کر پیکٹ کھول کر ان ننھے ننھے سے پھولوں اور تین چھوٹے چھوٹے پتھروں کو غور سے دیکھا۔ اضطراری طور پر میں نے ان پھولوں اور پتھروں کو چوم لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے یوں محسوس ہوا تھا

جیسے میں نے ان دلیروں کے ماتھے چومے ہوں۔ دراصل اس لڑکی نے، جس کا نام پوچھنا میں پھر بھول گئی تھی، مجھ سے یہی کہا تھا: ''مس! وہ سب ایک ہیں۔ ناموں سے اور جدا جدا قالبوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ سب تنِ واحد ہیں۔ ان کا ذہن ایک ہے، دل ایک ہے اور ایک ساتھ دھڑکتا ہے۔''

انسان اپنے آپ میں اتنا مشغول ہے کہ اپنے دھندوں میں کیا کچھ نہیں بُھولا رہتا۔ ارے، ہم تو اپنے آپ کو اور اپنے اللہ تک کو بُھول جاتے ہیں اپنے چکروں میں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ جب وہاں کے حالات سنتی ہوں تو دل بے چین ہو جاتا ہے۔ خدایا! تیرے آسمانوں کی خیر ہو اور پتھر بھیجنے والوں کی بھی خیر رکھنا! کوئی بات نہیں، کچھ ہی دن کی بات ہے۔

ہر رات نو بجے کی خبروں میں ایسی باتیں سنتے سنتے ہم اسی طرح عادی ہوتے چلے جائیں گے جس طرح فلسطین کے حریّت پسندوں پر ہونے والا ہر جبر اور تشدد ہمارے لئے معمول کی خبر بن چکا ہے۔ پھر آج مَیں رنجیدہ بھی ہوں اور میرا دل بھی بہت بوجھل ہے کہ عالمی صورتِ حال پر خواتین کی کسی مختصر سی، بہت مہذب اور دانشورانہ سی تقریب میں ایک صوفے پر افسردگی سے دبکی ہوئی جو خاتون اُٹھ کر میرے قریب آئی تھی، اس کا چہرہ بہت زرد اور ملول تھا۔ آواز نرم اور ٹھہری ہوئی تھی۔ اس کا لباس بہت معمولی، مگر سبک سا تھا۔ اس نے دھیرے سے جھک کر اپنا نام بتایا اور کہنے لگی: ''میں سری نگر سے آئی ہوں۔ میرا خیال تھا اس تقریب اور اس محفل میں اپنے مسائل کا ذکر کروں گی مگر ان کی موجودگی میں...''

اس نے اس تقریب کی مہمانِ خصوصی اور لیکچر دینے والی امن کی آشا خاتون کی طرف اشارہ کیا: ''میں اپنے لب کھول کر اپنے موقف کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتی۔ ہمیں ان پر اعتبار نہیں۔''

نرم سے سرد ہاتھ نے میرا ہاتھ دبایا اور ہوا کے مغموم اور ویران جھونکے کی طرح وہ باہر نکل گئی۔

کون تھی، کیا تھی؟ ایک نام تو بتایا تھا مگر کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ لڑکی تو کہتی ہے ناموں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ فرق تو جدا جدا جسموں سے بھی نہیں پڑتا۔ وہ سب ایک ہیں، ان کے قلب اور ذہن ایک ہیں، وہاں کوئی نہیں مرتا اس لئے کہ شہید کا مقدّر موت نہیں ہوتی، جو مر گئے ہیں وہ بھی موجود ہیں۔ مَیں اُس دن سے یہی سوچے چلی جاتی ہوں کہ وہ سب جو ملک ملک، دیس دیس سے آ کر ایک گھر میں جمع ہوئے تھے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو باسٹھ تریسٹھ سال کے بعد دیکھا، اس طرح سے جیسے اصحابِ کہف نے گہری اور لمبی نیند سے بیدار ہو کر آنکھیں مل مل کر ایک دوسرے کو دیکھا تھا اور جنہوں نے اپنے ٹوٹے ناتوں اور رشتوں کو جوڑا اور تجدیدِ عہد کے لئے اپنی نئی نسلوں کو زوج زوج کیا تھا، اب کہاں ہوں گے؟ کیا اتنی آتش زنی کے بعد وہ گھر سلامت ہوں گے جہاں وہ کنبے اور خاندان آ کر جُڑے اور پھر بچھڑے ہوں گے؟ کیا وہ جنہوں نے ان مہمانوں کی میزبانی کی ہوگی، ان کے جسموں کو آگ کی لمبی زبانوں نے چاٹ نہ لیا ہوگا!

کھنچی ہوئی، تن سے جدا کی ہوئیں کھالیں، کٹے ہوئے اعضا اور پھوڑی ہوئی جوان آنکھیں جب خوابوں میں آتی ہیں تو پھر گھبرا کر اُٹھ بیٹھتی ہوں۔ اندھیری راتوں کو لرزتے دل سے دعا کرتی ہوں: ''میرے اللہ تیرے آسمانوں کے تاروں کی خیر! میرے ان بچوں کی خیر کرنا جن کی روشن پیشانیوں کا تصور کر کے میں نے وادی کے خودرو پھولوں اور پتھروں کو چوما تھا۔''

بیٹی

سلطان جمیل نسیم

جب میری چہیتی بیٹی رخصت ہوگئی تو میرج ہال میں تنہائی اور بے رونقی دیکھ کر قریب پڑی ایک کرسی پر ڈھے جانے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ مجھے اس طرح بیٹھے دیکھ کر میری بیوی نے آنچل سے اپنے آنسو صاف کئے' چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی میرے قریب آئی۔ پہلے دلاسا دینے کے لئے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا' پھر برابر والی کرسی پر بیٹھ گئیں اور بہت ہی مطمئن' ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنے لگیں: ''اللہ کا شکر ادا کیجئے کہ اس نے ہمیں ایک اور بڑے فرض سے سبکدوش کیا۔ وقار' مگر سادگی اور سلیقے کے ساتھ بیٹیوں کو وداع کرنے پر سارا خاندان فخریہ انداز میں آپ کی مثال دے رہا ہے اور آپ یوں اداس بیٹھے ہیں۔''

پھر بھی میری ہمت ٹوٹنے لگی جس کے سہارے ضبط کا بند باندھے بیٹھا تھا۔ ایک دم جی بھر آیا اور آنکھوں میں جمع ہونے والے آنسو بہہ نکلے۔ گھر کے تمام افراد کی چاہت سے دل آباد تھا۔ اب اتنا بے قابو ہُوا کہ ہچکیوں کے ساتھ رونے لگا۔ میرا بڑا بیٹا میرج ہال والوں کا حساب کتاب کرنے گیا تھا۔ سب سے چھوٹا ہمیں گھر لے جانے کے لئے کار میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ باقی دونوں بھی آبدیدہ ہوگئے۔ بیوی نے ہمت بڑھانے کے لئے کہا: ''کیا ہوگیا ہے آپ کو؟ دونوں بڑی بیٹیوں کو رخصت کرتے ہوئے تو آپ نے دل اتنا چھوٹا نہیں کیا تھا۔''

مَیں ان کی بات سن کر چپ رہا۔ تھوڑی دیر تک وہ میرے کندھے تھپتھپاتی رہیں' پھر بولیں: آپ تو اس کے رشتے کے لئے اُس وقت سے بے چَین تھے جب اس نے میٹرک پاس کیا تھا۔ اب جب کہ ایک اچھا رشتہ آ گیا اور وہ اپنے گھر کی ہوگئی ہے تو آپ جی ہلکان کئے جا رہے ہیں۔

مَیں جواب میں کہنا چاہتا تھا کہ اس لڑکی کا وجود تو پورے گھر پر چھایا ہوا تھا۔ سارے کنبے کی ایک ایک ضرورت جس کی نظر میں ہو' جو اپنی موجودگی سے گھر کو ایک پناہ گاہ بنا دے اور ایک چھت کے نیچے رہنے والوں میں یہ احساس پیدا کر دے کہ رُوئے زمین پر اگر جنت ہوسکتی ہے' تو وہ یہی گھر ہے جہاں زمانے کی گردشوں کا گزر نہیں۔ جس کی ذات والدین کے لئے ڈھارس ہو' بھائیوں کے لئے طمانیت کا سبب' اہلِ خاندان کے لئے اطمینان کا باعث ہو' اس کو پرائے گھر بھیجنے پر دل ٹھکانے کیسے رہ سکتا ہے؟ اب میری چھوٹی چھوٹی ضرورتیں بِن کہے کون پوری کرے گا؟ آپ جوڑوں کے درد کی مریض ہیں' آپ کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ بھائیوں کی خبر گیری کون کرے گا؟

مجھے اپنی بیٹی کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی اور میں ہر بات کو بیان بھی کر دینا چاہتا تھا' مگر مجھ سے بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ ایک اجنبی گھر کے لئے وداع کر دینے کا لمحہ' میرے گھر میں اس کی موجودگی کے اٹھارہ برس کی باتوں پر چھا گیا تھا۔ جذبات کے مدوجزر میں الفاظ اتھل پتھل ہو رہے تھے' اس لئے مَیں خاموش رہا۔

بیٹی مہمان ہوتی ہے۔ ہمارے گھر کی خوشبو اب اپنے گھر کو مہکائے گی۔ ہمارے گھر کا چراغ اب اپنے گھر کو روشن کرے گا اور۔۔۔

اور بے شمار مثالیں' لاتعداد مرتبہ کہی گئی باتیں' بیوی دُہراتی رہیں۔ مَیں سنتا رہا' مگر بیٹی کو اپنے گھر سے رخصت کر دینے کا غم نہ ختم ہونے والی سوچوں کے بھنور کی طرح میرے ذہن کو گھیرے ہوئے تھا۔ مَیں بظاہر میز پر کہنیاں ٹِکائے' ہتھیلیوں میں سر تھامے بیٹھا تھا' لیکن خیالات کا پہیہ مسلسل چکر کھا رہا تھا۔ بے اختیار مجھے وہ نواب صاحب بھی میرے ذہن میں آئے جنہوں نے اپنی بہن کو حرص و ہوس کی حویلی میں اس لئے قید رکھا تھا کہ جائیداد کے حصے بخرے نہ ہو جائیں اور نعوذ باللہ قرآن پاک سے ان کے نکاح کرنے کی کافرانہ رسم ادا کی۔ پھر یہ خیال بھی آیا کہ آج بھی ہماری دنیا میں ایسے علاقے ہیں جہاں بیٹیوں کو بیچ دینے کے ارادے سے پالا پوسا جاتا ہے۔

وہ لوگ جن کے دل میں اپنے ہی جگر گوشوں کے لئے محبت' عزت اور تکریم کا جذبہ نہیں ہے' کون ہیں؟ علم سے دُور' جہالت کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے افراد اور قبیلے' یہ ہدایت حاصل کیوں نہیں کرتے؟ میرا افسردہ ذہن پہلے ہی خیالات کے گرداب میں پھنسا ہُوا تھا' اچانک مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی ٹائم مشین میں بیٹھا ہوں۔

وقت بادلوں کے فرش کی طرح تیزی کے ساتھ میرے قدموں سے پھسلا جا رہا ہے اور میں مکمل شعور کے ساتھ حال سے ماضی کی طرف اُڑا چلا جا رہا ہوں۔ پل بھر میں وہ تیز رفتار خیال مجھے ایک ریگستان میں پہنچا کر ٹھہر گیا۔ اب میری حیثیت ایک چشم دید گواہ کی سی ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ جلی ہوئی سیہ پوش پہاڑیوں کے سلسلے میں گھرے ہوئے ریگستان کے ایک حصے میں بستی بسی ہوئی ہے اور بستی سے خاصے فاصلے پر ایک عورت بڑی دیر سے گم صم بیٹھی اس گڑھے کو دیکھے جا رہی ہے جو اس کا شوہر تھوڑی دیر پہلے کھود کر گیا ہے۔ اس تماشے کا مکمل منظر نامہ اپنی تمام تر

سراپا طاعت و خدمت گزار ہے بیٹی
سکونِ قلب ہے' صبر و قرار ہے بیٹی

حریمِ عفت و عصمت' شرافت و غیرت
کمالِ حلم و حیا' انکسار ہے بیٹی

جہاں ہو دھوپ کڑی اور نہ چھاؤں ہو کوئی
وہاں بھی ایک شجر سایہ دار ہے بیٹی

اگر نمونہ ہے زہراؓ کی پاک سیرت کا
فلاح و خیر سے پھر ہم کنار ہے بیٹی

نبیؐ نے نعمتِ عظمیٰ کا بخشا تاج اسے
منارِ عظمت و صد افتخار ہے بیٹی

اُجالا بنتی ہے تاریک رہگزاروں میں
اندھیرے گھر میں مہِ جلوہ بار ہے بیٹی

ہے قلب و روح میں جس کی ضیا سے نُور ہی نُور
وہ نُور پاش دُرِ شاہوار ہے بیٹی

مصیبتوں میں بنا کرتی ہے سہارا یہ
غم و الم ہو اگر' غم گسار ہے بیٹی

نہ ہو اگر یہ تو انسان گھُٹ کے مر جائے
سرابِ زیست میں اِک جُوئے بار ہے بیٹی

جزئیات کے ساتھ تماشائی کے سامنے پھیلا ہوا ہے اور وہ بغیر بتائے ہر بات سمجھتا چلا جا رہا ہے۔

ولادت کے دن قریب آنے پر عورت کے شوہر نے بستی سے لا کر اس چھوٹے سے خیمے میں ٹھہرا دیا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ بیٹے کی پیدائش پر وہ عزت و احترام کے ساتھ بستی میں لے جائی جائے گی۔ اونٹ اور دنبے ذبح ہوں گے، جشن منایا جائے گا، لیکن اگر لڑکی نے جنم لیا تو... !

شوہر کے واپس آنے کے بعد وقوع پذیر ہونے والے حادثے کے خیال نے عورت کے وجود میں صدمے کا دھواں بھر دیا ہے جس میں اس کی سانس ہی نہیں گھٹ رہی بلکہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی گم ہو کر رہ گئی ہے۔ زندگی کو غم کی دھند میں لپٹ جانے کے خیال نے عورت کے ہوش و حواس معطل اور خون خشک کر دیا ہے۔ اس کی ممتا کے دھارے بھی سُکھا دیئے ہیں۔ یہ احساس بھی جاتا رہا ہے کہ گود میں پڑی ہوئی نوزائیدہ بچی کب سے زندگی حاصل کرنے کے لئے کلبلا رہی ہے۔ اس کے مرد نے ریتلی زمین پر کھدے گڑھے کو مزید گہرا کر دیا۔ پھر کدال ایک طرف پھینک کر، حقارت بھری نظر اس پر ڈالی اور یہ کہتا ہُوا چلا گیا کہ وہ قبیلے والوں کو بلا کر لاتا ہے تا کہ ان کے سامنے اپنی غیرت و مردانگی کا مظاہرہ کر کے لڑکی پیدا ہونے کی نحوست کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس گڑھے میں دبا دے۔

عورت کھلے ریتلے میدان میں یوں ساکت و جامد بیٹھی ہے جیسے اس کا شوہر جاتے وقت کسی جادوئی عمل کے ذریعے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی ہڑپ کر گیا ہے۔ وہ اس بات سے بے نیاز ہے کہ اس کے دل کی دھڑکن پر قدم رکھ کر گزرنے والی ایک ایک ساعت، اپنے دوش پہ صحرا کے ذروں کو اُڑا کر چلنے والی ہوا، غروب ہوتے ہوئے آفتاب کو سر اُٹھا کر دیکھنے والے کھجور کے درخت اور جلے ہوئے پتھروں کی پہاڑیوں سے

یہ زندگی کے چمن میں بہاریں لے آئے
خلوص و مہر و وفا، پریم پیار ہے بیوی

وقارِ آدمؑ و حوا، طہارتِ مریمؑ
امینِ رحمتِ پروردگار ہے بیوی

ہے عزم و جرأت و ہمّت کا خوشنما پیکر
حریفِ گردشِ لیل و نہار ہے بیوی

بنا دے گھر کو نمونہ جو باغِ جنت کا
وہ باتمیز و سلیقہ شعار ہے بیوی

ہے پہلا مدرسہ آغوشِ عاطفت اس کی
خزینۂ صفتِ بے شمار ہے بیوی

پڑے جو وقت اُٹھا لیتی ہے یہ پرچم بھی
میانِ جنگ جری شہسوار ہے بیوی

جہادِ زیست میں رہتی ہے ساتھ ساتھ سدا
وفا پرستی کا وہ شاہ کار ہے بیوی

سمٹتی ہوئی دھوپ، سب اسے بتانا چاہتے ہیں کہ وقت کم رہ گیا ہے۔

بے حس و حرکت بیٹھی عورت اس وقت چونکی جب اس نے اپنے شوہر اور اس کے پیچھے کئی آدمیوں کو آتے دیکھا۔ آنے والوں میں سے بعض کو وہ پہچانتی تھی اور چند اجنبی تھے۔ ان لوگوں پر نظر پڑتے ہی عورت نے بچّی کو اپنے سینے سے اس طرح لگا لیا کہ ساری ممتا قطرہ قطرہ کر کے بچّی کے حلق میں اترنے لگی۔ جب اونٹنی پر سوار اس کا شوہر قریب پہنچا تو دیوانہ وار چیخی:

''مَیں اپنا جگر گوشہ تمہیں نہیں دوں گی''۔

عورت کی بات سُنی اَن سُنی کر کے اس کا شوہر اونٹنی سے اُترا اور چھوٹے چھوٹے مطمئن قدم اٹھاتا اپنی بیوی کے پاس پہنچا۔ چند لمحے بیوی کی ملتجی اور مجبور نگاہوں کی طرف دیکھتا رہا۔ ملک الموت کی طرح بڑھے ہوئے ہاتھوں نے کسی مزاحمت کے بغیر ماں کی گود سے بچّی چھین لی۔ اونٹنی کے پیچھے پیچھے پیدل آنے والے لوگ اب گھڑ سواروں اور اونٹوں پر سوار ہو کے آنے والوں کے قریب پہنچ کر نیم دائرے میں خاموش کھڑے ہو گئے تھے۔

بچّی کو دونوں ہاتھوں میں اُٹھائے مرد گڑھے کے قریب پہنچا۔ ایک نظر آسمان کی طرف اُٹھائی' پھر داہنے ہاتھ سے بچّی کے ڈھکے ہوئے منہ کو کھول کر دیکھا۔ انتہائی معصوم اور پاکیزہ چہرہ' دنیا کی حَسین ترین مخلوق! اس وقت مرد کا سارا وجود آنکھوں میں سمٹا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ لمحہ بھر وہ بچّی کے چہرے کو تکتا رہا' پھر اپنا چہرہ جھکا کے ڈاڑھی مونچھوں میں چھپے ہوئے ہونٹ بچّی کی ملائم پیشانی پر رکھ دیئے۔

یہ دیکھ کر ساتھ آنے والے قبیلے کے لوگ دف بجانے لگے اور نیم دائرے میں رقص کے انداز میں گھوم گئے۔ دف کی آواز سن کر بچّی کی ماں نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ اس کا شوہر والہانہ انداز سے بچّی کو چوم رہا تھا۔

یہ زندگی کی رخصت کا نظارا ہے یا موت کی آمد کا اشارہ؟ عورت نے سوچا' مگر ابھی اس میں اتنی ہمت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے اُٹھے اور بچّی کو شوہر کے ہاتھوں سے چھین لے۔ قبیلے والوں کے رقص کا حلقہ توڑ کر شوہر بچّی کو لے کر بیوی کے پاس پہنچا اور بہت احتیاط سے چاند کے ٹکڑے کو اس کی ماں کی گود میں لٹا دیا اور آہستہ آہستہ' مطمئن اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنے لگا: ''جب مَیں تیرے پاس سے گیا تھا تو میرا دل' میرا دماغ اپنے خاندان اور اپنے قبیلے کی روایت کے حصار میں تھا' لیکن جب ایک پاکیزہ ہستی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے آج صبح ملاقات ہو گئی' پھر تو جیسے مَیں روشنی میں نہا گیا۔ نُور ہی نُور' آنکھیں کُھل گئیں' روشنی میرے رُوئیں رُوئیں میں سما گئی۔ معلوم ہُوا کہ عقل جو صدیوں سے قید تھی' اسے آزاد کرا لیا گیا ہے۔ اب میں اس گڑھے میں اپنی بیٹی کے بجائے اپنے قبیلے کی بے رحم' کافرانہ اور بے ہُودہ روایات کو دفن کروں گا''۔

عورت کی نظر اپنے شوہر کے چہرے سے ہٹتی نہ تھی۔ شوہر اپنی بچّی کے چہرے کو محبت سے دیکھتا جا رہا تھا۔ چند ساعتوں کی خاموشی کے بعد جب وہ بولا تو اس کے لہجے کے دکھ اور شرمندگی کو پہچانا جا سکتا تھا۔

''ہماری وہ دونوں بیٹیاں' مَیں نے جن کا چہرہ دیکھے بغیر زمین میں گاڑ دیا تھا' ضرور ایسی ہی پاکیزہ اور بابرکت ہوں گی''

وہ اپنی بیوی کے پاس سے اُٹھا۔ چند قدم بڑھا کر اس گڑھے کے قریب پہنچا جس کے اطراف قبیلے والے جھوم جھوم کے دف بجا رہے تھے۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور مٹھیاں بھر بھر گڑھے کو ریت سے بھرنے لگا۔

''میرج ہال والوں کا حساب مَیں نے ادا کر دیا۔ ابا جان! آیئے اب گھر چلیں۔'' بیٹے کی آواز کے سہارے مَیں صدیوں کا سفر طے کر کے واپس اپنے وجود میں سمٹ آیا۔ پھر مَیں نے محبت کے ساتھ اپنا بازو چھڑایا اور یہ کہتا ہُوا اپنی جگہ سے اُٹھا: ''اللہ تعالیٰ نے آج بڑے فرض کو ادا کرنے کا انعام بخشا ہے۔ میں خود کو ہلکا پُھلکا محسوس کر رہا ہوں۔ الحمدللہ! اب کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ میری بیٹی اور داماد کو سلامت رکھے۔ اللہ تعالیٰ ہر بیٹی اور ہر بیٹے کا مقدّر اچھا کرے۔ انہیں قدر دانوں سے واسطہ اور رابطہ نصیب ہو' انہیں اپنے رب کے سوا کسی کا محتاج نہ کرے اور اُس ہستی کی نگاہِ عنایت میں رہیں جن کا ارشاد ہے کہ جس نے بیٹی کو پالا پوسا اور پھر رخصت کر دیا' قیامت کے روز وہ اور مَیں دو جُڑی ہوئی انگلیوں کی طرح ساتھ ساتھ ہوں گے۔ صلی اللہ علیہ وسلم! صلی اللہ علیہ وسلم!!

پہچان ہماری

نعمان منظور

نورین نے کچن کی کھڑکی میں سے غنی کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ جب تک غنی لاؤنج میں پہنچا' نورین روح افزا کا ٹھنڈا گلاس بنا کر لاؤنج میں پہنچ چکی تھی۔

''یہ اے سی تو ذرا تیز کرو۔'' غنی نے صوفے پر گرتے ہوئے کہا۔ نورین نے اے سی کا ریموٹ پکڑا اور ٹمپریچر 20 ڈگری پر کر کے کہا ''یہ لیں' ٹھنڈا شربت پی لیں''۔ غنی ایک ہی گھونٹ میں پورا گلاس حلق میں انڈیل کر بولا کہ توبہ' توبہ دو کلومیٹر کا فاصلہ اور ایک گھنٹہ لگا ہے ٹیکسی میں آتے ہوئے' پتہ نہیں یہ کب سدھریں گے؟ ہر چیز ہی خراب ہے اس ملک میں' سڑکیں ہیں تو تنگ تنگ' ٹریفک بے ہنگم' ان کو شعور ہی نہیں کہ سڑک پر گاڑی کیسے چلاتے ہیں۔ اور تو اور' کوئی ڈھنگ کی ٹیکسی بھی نہیں ملتی۔ نہ اے سی چلتا ہے اور نہ ہی گاڑی' کرایہ مانگتے وقت آنکھیں ماتھے پر رکھ لیتے ہیں۔

غنی اپنی رَو میں بولے چلا جا رہا تھا اور نورین اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھی حیران کُن نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

''ایسے کیوں دیکھ رہی ہے؟''

''دیکھ رہی ہوں کہ یہ وہی غنی ہے جو سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل بھی نہیں خرید سکتا تھا''۔

''ہاں ہاں' میں وہی غنی ہوں''۔ غنی نے مسکراتے ہوئے۔

''عاصم کہاں ہے' نظر نہیں آ رہا؟''

''اس کے دوست آئے ہوئے ہیں' ان کے ساتھ کارٹون مووی دیکھ رہا ہے اور رمشا سو رہی ہے''۔

''نورین! عاصم ابھی بچہ ہے' تم نے ابھی سے اسے فلموں پہ لگایا ہے''۔

غنی نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

''غنی! آپ تو سال کے سال چھٹی آتے ہیں' آپ کو کیا پتہ کہ بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش میں مجھے کیا کیا مصیبتیں جھیلنا پڑتی ہیں۔ عاصم اب بچہ نہیں رہا' چودہ برس کا ہو گیا ہے جب آپ صرف دو برس کے لیے سعودی عرب گئے تھے' تو وہ چار سال کا تھا اور رمشا صرف تین ماہ کی۔ دس برس ہو گئے ہیں اب آپ کو سعودی عرب گئے ہوئے اور ان دس برسوں میں وہ دو برس ابھی تک پورے نہیں ہوئے؟

''تو کیا مَیں اپنی خوشی سے رہ رہا ہوں سعودی عرب میں؟'' غنی نے غصے بھری آواز میں پوچھا۔

''نہیں' نہ آپ اپنی خوشی سے وہاں رہ رہے ہیں' نہ مَیں خوشی سے یہاں زندہ ہوں۔ ہم دونوں اپنے اپنے عذابوں کی آگ میں ایک دوسرے سے بہت دُور زندہ ہیں۔ زندہ لاشوں کی طرح!''

''تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کہانیاں لکھ لکھ کے' سارا دن یہاں فارغ رہتی ہو۔ گھر میں کام کرنے کے لئے دو نوکرانیاں رکھی ہوئی ہیں' صرف بچوں کو سکول لے کر جانے اور لانے کی ذمہ داری ہے تم پر۔ کتنی دفعہ میں نے منع کیا تمہیں کہ کہانیاں مت لکھا کرو۔ یہ لکھنے والے یونہی اونگی بونگی لکھ کے لوگوں کو پریشان کر دیتے ہیں۔''

نورین نے خاموش نگاہوں سے غنی کی طرف دیکھا اور آنکھوں کے گوشوں سے ٹپکتی ہوئی بوندوں کو جلدی سے دوپٹے کے پلُو سے صاف کرنے لگی۔

نورین کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھ میں دباتے ہوئے غنی بولا: ''اچھا نورین!

جو مرضی لکھا کرو۔ میں تو بس یونہی ذرا جلدی غصے میں آ جاتا ہوں' کل ویسے ہی میری فلائٹ ہے واپسی کی۔ مجھے ہنستے ہوئے رخصت کرنا۔''

''ہنستے ہوئے کیسے رخصت کرتے ہیں غنی؟ رخصتی تو چاہے کسی کی بھی ہو جدائیاں ساتھ لاتی ہے۔ جدائیوں کے بغیر تو رخصتی ہوتی ہی نہیں۔'' نورین نے بھولپن سے کہا۔

''تمہیں کس چیز کی کمی ہے؟ میں نے ان دس برسوں میں اپنے فرائض پوری محنت سے ادا کیے ہیں۔ گھر ہے تمہارے پاس، دو خوبصوت سے بچے' بینک بیلنس' گاڑی' ایک سے بڑھ کے ایک قیمتی کپڑا' زیورات۔ ابھی پرسوں ہی ڈیفنس میں پلاٹ لیا ہے۔ کوئی روک ٹوک نہیں ہے تمہیں' روکنے اور ٹوکنے والے تو بے چارے یہ خوشیاں دیکھنے سے پہلے ہی چل بسے! اسی لیے تو مَیں باہر گیا تھا' تمہارا کیا خیال ہے مَیں اپنی خوشی سے وہاں رہ رہا ہوں؟ تمہیں یاد ہے شادی کے پہلے پانچ برس کس تنگ دستی میں گزارے تھے ہم نے۔ ابو اور امّی کی بیماری' کرائے کا گھر اور ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل۔'' غنی نے یہ سب باتیں ایک ہی سانس میں کہہ کر گویا فرض ادا کر دیا تھا۔

نورین نے غنی سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا: ''آپ کو یاد ہے شادی کے پہلے پانچ برس مَیں آپ سے صرف جوتے لانے کا کہتی تھی۔ پچھلے دس برسوں سے تو مَیں نے کوئی فرمائش نہیں کی' سوائے آپ کی واپسی کے۔''

غنی کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ ابھی کل کی بات ہے سعودی عرب گیا تھا۔ امی اور ابو کی بیماری طول پکڑتی جا رہی تھی۔ ابو کو ہائی بلڈ پریشر اور امی کو سینے میں انفیکشن۔ دونوں علاج مہنگے اور آمدنی کم تھی۔ بی اے پاس کو اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ کی نوکری مل گئی تھی جو بہت غنیمت تھی۔ شادی پر بھی کمپنی سے قرض لیا' خرچے بڑھتے جا رہے تھے اور آمدن وہیں کی وہیں۔ دوست نے سعودی عرب کا ویزہ بھیجا اور چلا گیا۔ پہلے تین ماہ میں ہی گھر کے حالات سنبھلنے شروع ہو گئے تھے۔ ماں باپ کی یاد اور بچوں سے دُوری شروع شروع میں تو بہت تڑپاتی تھی لیکن ریالوں کی کشش سارے رشتے ناطے بھُلا دیتی ہے۔ ماضی کو یاد کرتے ہوئے غنی کی آنکھوں کے کنارے بھیگ سے گئے۔

نورین غنی کی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے صاف کرتے ہوئے بولی:

''غنی! وقت بھی بڑی ظالم شے ہے' کبھی مٹھی میں ٹھہرتا ہی نہیں۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے بھاگتے چلے جاتے ہیں' تو یہ جیسے صدیوں پہلے ہی گزر گیا ہوتا ہے۔ پیچھے مُڑ کے دیکھیں تو کل کی بات لگتی ہے' آگے نظر دوڑائیں تو خسارہ ہی خسارہ نظر آتا ہے۔ سب کچھ خالی' مٹی کے خالی گھڑے کی طرح' بجاؤ تو آواز دُور سے آتی سنائی دیتی ہے' قریب آؤ تو خالی''۔

''تو کیا میں صرف اپنی مرضی سے گیا تھا وہاں پر؟'' غنی نے پوچھا۔

''نہیں''! نورین نے آہستہ سے جواب دیا۔

''تو پھر سارا الزام مجھ پر ہی کیوں؟ غنی نے نورین کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''اُس وقت کے حالات نے آپ کو صرف دو برس کی اجازت دی تھی''۔

''دو برس میں تو صرف امی اور ابو کا علاج ہُوا اور ان کی وفات ہو گئی۔ آگے پیچھے دونوں ہی چل بسے۔ مَیں تو والد صاحب کی میّت کو کندھا بھی نہ دے سکا''۔

''امی کے فوت ہونے پر آپ پہلے سال کے بعد چھٹی پر آئے ہوئے تھے۔ ابو نے آپ کو کتنا روکا تھا' کتنا کہا تھا آپ کو کہ نہ جاؤ' چھوڑ دو' تمہارے ریال تمہاری ماں کو نہیں بچا سکے تو مجھے کیا بچائیں گے۔ تم اگر میرے پاس ہوئے تو میری صحت کسی دوا کے بغیر ٹھیک ہوتی رہے گی۔ یاد ہے آپ کو؟'' نورین غنی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''جی، سب یاد ہے۔ ابو بہت روئے تھے' میرے جانے کا سن کر۔ بہت روکا تھا انہوں نے مجھے' لیکن مجھے واپس جانا تھا' دو سال کا معاہدہ پورا کرنے کے لئے۔''

''غنی! آپ کو نہیں پتہ کہ ابو آپ کے جانے کے بعد کتنا روتے تھے؟ اتنا تو وہ شاید امی کی وفات پر بھی نہیں روئے تھے۔ مجھے کہتے تھے نورین

میری بات یاد رکھنا' غنی نے میری بات نہیں مانی' اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔تم ساری عمر اکلاپے کی آگ میں جلتے گزارو گی' وہ وہاں اور تم یہاں۔ بس ایک کام کرنا' اپنے بچوں کو اپنے سے دُور بھیجنے کو کوشش نہ کرنا' کبھی بھی۔ چاہے دو وقت کا فاقہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔غنی کو اب پیسوں کی ہوس ہوگئی ہے۔انسان کو سوائے اپنا سٹیٹس سمبل بنانے کے اور کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔تم ہمّت کرنا اور بچوں کی پرورش اچھے اصولوں پر کرنا''۔

غنی بھیگی آنکھوں سے نورین کی باتیں سنتا رہا۔ پھر کہنے لگا کہ یہ سب باتیں ٹھیک ہیں لیکن اگر مَیں باہر نہ جاتا تو آج بھی ہم کرائے کے گھر میں رہ رہے ہوتے۔ ہمارے بچے معمولی سکولوں میں پڑھتے اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے ترستے۔

''ترستے تو وہ اب بھی ہیں' غنی''۔ نورین نے کہا

''کس چیز کی کمی ہے انہیں؟ دنیا کی ہر آسائش ان کے پاس ہے۔''

''آپ کی! صرف والد کی کمی محسوس ہوتی ہے اُن کو پتہ ہے رمشا مجھے اکثر کیا کہتی ہے؟ مام! میری کلاس فیلوز کے ابو اُنہیں لینے سکول آتے ہیں' تو مجھے پاپا بہت یاد آتے ہیں۔ میری سہیلیاں اپنے پاپا کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر جاتی ہیں''۔

''رمشا ابھی بچی ہے نورین' اسے کچھ پتہ نہیں۔ یہ سب چیزیں ہمارے بچوں ہی کے لیے تو ہیں۔ دیکھو عاصم کتنا خوش ہوتا ہے میرے آنے پر''۔

''نہیں غنی! وہ بچہ نہیں ہے۔ وہ عمر کے اس حصے میں ہے جہاں باپ کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ مجھے کہتا ہے کہ ماما جب پاپا سالوں کے بعد چھٹی آتے ہیں تو پورا مہینہ مَیں انتظار کرتا رہتا ہوں کہ وہ کب واپس جائیں گے۔ ہر وقت روک ٹوک' آپ تو ایسا نہیں کرتیں۔ مَیں ہر سال کلاس میں فرسٹ آتا ہوں''۔

''یہ سب تمہارے پڑھائے ہوئے سبق ہیں۔'' غنی غصے سے بپھر کر بولا۔

''یہ میرے پڑھائے ہوئے سبق نہیں ہیں غنی! آج کل کے بچے بڑے سمجھ دار ہیں۔ میرے بس میں جو ہوتا ہے' وہ مَیں کرتی ہوں' باپ کی کمی تو آپ ہی پوری کر سکتے ہیں۔''

''تم کیا چاہتی ہو؟''

''مَیں صرف آپ کی واپسی چاہتی ہوں۔ خدا کے لئے اپنے وطن میں واپس آ جاؤ۔ مَیں اکثر پڑھتی اور سنتی ہوں غیر ممالک میں پاکستانیوں کے ساتھ جو سلوک وہاں کی حکومتیں' باشندے اور کمپنیوں کے مالکان کرتے ہیں۔ وہ انہیں انسان تک نہیں سمجھتے۔ یہ ہمارا ملک ہے' یہ ہماری پہچان ہے' یہاں ہمارے حقوق ہیں' آزاد عدالتیں ہیں جو حقوق کی محافظ ہیں' بد دماغوں کا دماغ درست کر دیتی ہیں۔غنی' کون سی نعمت ہے جو اس ملک میں نہیں اور کون سا ملک ہے جس میں ساری نعمتیں موجود ہیں۔ ذرا سوچو اس ملک نے تمہیں کیا نہیں دیا اور ایمانداری سے بتاؤ تم نے اس ملک کو کیا دیا۔ تنگ سڑکوں اور پرانی ٹیکسیوں کے طعنے؟ غنی! مستقبل ہمارے پیارے وطن کا ہے۔ مجھے ریال نہیں چاہئیں۔ بس اپنے وطن میں واپس آ جاؤ اور اپنے وطن کی آزاد فضا میں زندگی گزارو...''

''ہر وقت تمہاری تو ایک ہی رٹ ہوتی ہے۔ واپسی' واپسی''۔

''آپ کو پتہ ہے مَیں پچھلے دس برس سے نہیں سوئی''۔

''کیا کہہ رہی ہو''؟

''سچ بول رہی ہوں۔ ایک بیوی کو خاوند کی موجودگی میں جو تحفظ ملتا ہے' وہ بینک بیلنس' گھر اور گاڑی نہیں دے سکتے۔ خاوند کے بغیر بیوی ادھوری رہتی ہے۔ غنی! ہم گزارہ کر لیں گے' آپ واپس آ جائیں۔ دس برس ہو گئے ہیں ندی کے دو کناروں کی طرح چلتے ہوئے ہمیں۔ اب حوصلہ بھی جواب دے رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں پچھتاوے ہی رہ جائیں...''

نورین اپنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

غنی نے فضا میں گھورتے ہوئے کہا: ''پکّا وعدہ ہے نورین! میں دو سال بعد ہمیشہ کے لئے پاکستان لوٹ آؤں گا— پاکستان جو ہماری پہچان ہے!''

دل کی فتح

عرفان پاشا

روشن نے چوپال کا رخ نہ کیا بلکہ بغلی گلی میں سے ہوتا ہُوا گاؤں کے آخری حصے کی طرف بڑھ گیا۔ گاؤں کے ملاحظے کے دوران اس کی نگاہیں اِدھر سے اُدھر دیکھتی رہیں اور اس کا دماغ سوچتا رہا۔ وہ سیدھا اُس مزار کے پاس بیٹھ گیا جو گاؤں کے باہر ذرا فاصلے پر واقع تھا۔ روشن گاؤں کے بارے میں کسی ایسے انجینئر کی طرح سوچ رہا تھا جو کسی قطعہ زمین کو اپنے فن کی مدد سے ایک نئی شان دینا چاہتا ہو۔ گاؤں کی زمینی سطح درمیان سے اُبھری ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا گاؤں کسی ٹیلے پر بسایا گیا ہو۔ اس سے باہر نکلنے کے لئے تین بڑے راستے تھے' جبکہ دو بند گلیاں بھی روشن نے دیکھ لی تھیں۔

ابھی رات اتنی گہری نہیں ہوئی تھی لیکن گاؤں کی فضا گھپ اندھیرے کی لپیٹ میں آ چکی تھی۔ چمنیوں سے اُٹھنے والا دھواں تقریباً ختم ہو چکا تھا اور چولہوں میں جلنے والے اُپلوں کی راکھ چولہوں کی گرم گرم آغوش میں ہولے ہولے ٹھنڈی پڑ رہی تھی۔ گھروں سے اُٹھنے والا بچوں کا شور بھی اب تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ کسی گھر سے بچے کے رونے کی آواز آتی اور تھوڑی دیر بعد بچہ روتے روتے چپ ہو جاتا۔ کہیں کہیں سے لوری کی آوازیں بھی اُٹھ رہی تھیں۔ گلیوں میں اِکا دُکا لوگ آ جا رہے تھے' البتہ چوپال میں ابھی تک زندگی عروج پر تھی۔ یہاں حقے کی گڑاگڑاہٹ نے ایک نغمگی پیدا کر رکھی تھی۔ پختہ عمر کے لوگ اور بڑے بوڑھے اپنے اپنے خیال کے مطابق دانائی کے خزانے لُٹا رہے تھے۔ کچھ نٹ کھٹ نوجوانوں نے کونے میں محفل سجا رکھی تھی۔

روشن نے سگریٹ سلگا کر خالی پیکٹ اور آدھی ماچس وہیں پھینک دی۔ وہ دیر تک دھوئیں کے مرغولے بناتا ذہن میں اپنے کام کا خاکہ تیار کرتا رہا۔ آخری کش لے کر اس نے جب اپنے نتھنوں سے دھواں نکالا تو وہ دو متوازی لکیروں کی صورت میں دُور تک پھیلتا گیا' جیسے کسی زمانے میں فضائی سیاروں کے پیچھے آسمان پر دھوئیں کی متوازی لکیریں نکلتی تھیں۔ سگریٹ کا فلٹر پاؤں کے نیچے مسل کر وہ اُٹھا۔ اب رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ سارے گاؤں میں مکمل سناٹا تھا' اتنا کہ ہوا کی سرسراہٹ بھی محسوس کی جا سکتی تھی۔ پرندوں کے پر پھڑپھڑانے تک کی آہٹ صاف سنائی دیتی تھی۔ گاؤں کے باہر جھینگروں اور مینڈکوں کی ملی جلی تان نے خوف کا جال سا بُن رکھا تھا۔ اسی اندھیرے میں رات کا بیوپاری اپنے بیوپار پر نکلا ہُوا تھا۔

نام تو اس کا روشن تھا' مگر روشنی کے ساتھ اس کی دشمنی تھی۔ دن کی روشنی میں وہ خوابِ خرگوش کے مزے لیتا اور جیسے ہی اندھیرا آسمان سے گرنا شروع ہوتا' وہ اُلو کی طرح شکار کے لئے نکلتا اور اندھیرا ختم ہونے سے پہلے کام مکمل کر کے واپس آ جاتا۔ روشن اگرچہ چور تھا مگر ''اصول'' کا پکا تھا۔ کسی غریب کو تنگ نہ کرتا' کسی سرائے یا رفاہِ عامہ کی چیز پر ہاتھ صاف نہ کرتا' کسی کی عزت کی طرف میلی آنکھ سے نہ دیکھتا اور نہ ہی اپنے گاؤں یا اس کے قریب اپنے فن کا مظاہرہ کرتا۔

رات نے اپنے پر پھیلا لئے۔ روشن کے سیاہ اور بھیانک چہرے پر

ستارے پسینے کے قطروں کی طرح چمکنے لگے اور اس کے ہونٹوں سے شفق کا خون صاف ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ مگر پوری ہوشیاری سے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ گاؤں میں اس کا رخ ایک حویلی کی طرف تھا جس کا انتخاب اس نے کر لیا تھا۔ وہ حویلی کے قریب پہنچ گیا۔ گلیاں بالکل سنسان تھیں۔ کبھی کبھی کتے کے بھونکنے یا بیل کے ڈکرانے کی آواز اس خاموشی کے تسلسل میں پیوند لگا دیتی تھی۔ حویلی کی دیوار کے بالکل ساتھ ایک درخت تھا۔ اس نے ایک جست لی اور دیکھتے ہی دیکھتے بغیر آواز درخت کے پتوں میں گم ہو گیا۔ اس کی بڑی بڑی سرخ آنکھیں اندھیرے میں دُور دُور تک دیکھ رہی تھیں۔ اب اسے حویلی کے اندر اور باہر کا منظر نظر آ رہا تھا۔

حویلی کافی بڑی تھی۔ اس میں ایک طرف گھر کا رہائشی حصہ تھا' دوسری طرف مویشیوں کی جگہ۔ جب وہ درخت پر چڑھا' تو کتے نے اسے دیکھا نہیں تھا' پھر بھی بھونکنے لگا۔ اس کے مالک نے کتے کو شاباش دی لیکن کتا پھر بھی بھونکتا رہا' جیسے اُسے کسی آنے والے خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہو۔ حویلی کے صحن میں چارپائیاں بچھی تھیں جن پر اہلِ خانہ سوئے ہوئے تھے۔ گھر کا مالک اپنے چھوٹے سے بیٹے کو' جو اس کے سینے پر لیٹا ہُوا تھا' سات شہزادیوں کی کہانی سنا رہا تھا۔ روشن دیوار پر درخت کے پتوں میں چھپ کر بیٹھا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ انتظار کر رہا تھا کہ کب کہانی ختم ہو۔ گھر کے مالک نے سات شہزادوں کی شادی سات شہزادیوں سے کروادی اور کہانی ختم کرنے کے بعد بیٹے سے پوچھا: ''کہانی کیسی لگی؟'' بیٹے نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اس وقت تک سو چکا تھا۔ اس نے بیٹے کو بڑے آرام سے چارپائی پر ڈال دیا مگر بیٹا اس منتقلی کے دوران جاگ گیا اور اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا جو صحن کے درمیان میں کھڑا اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی فضا میں بلند کر کے کچھ پڑھ رہا تھا۔ جب اس نے گھوم کر چکر مکمل کیا تو بیٹا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ جب وہ بستر پر لیٹا' تو بیٹے نے پوچھا: ''ابو! آپ یہ کیا کر رہے تھے؟''

''بیٹا! یہ اللہ کا کلام ہے۔ جب آیت الکرسی اور درود شریف پڑھ کر سوئیں تو اُس گھر میں چور چوری نہیں کر سکتے۔''

چور کا نام سن کر بیٹا سہم گیا اور اپنے باپ کے ساتھ چمٹ کر اس کی بغل میں منہ چھپا لیا۔

باپ نے بیٹے کو دلاسہ دیا: ''بیٹا ڈرو نہیں۔ ہمارے گھر چور نہیں آ سکتا۔ اگر آیا تو آیت الکرسی اور درود شریف کی حد میں داخل ہوتے ہی اندھا ہو جائے گا۔''

بیٹے کو تسلی ہوئی یا نہیں لیکن وہ مسلسل چمٹا رہا اور کچھ دیر بعد دونوں سو گئے۔

اب گھر کے مالک کے خراٹے صاف سنائی دے رہے تھے۔

وہ تو سو گئے مگر روشن کے دل میں کشمکش برپا تھی۔ روشن جتنا سوچتا' اتنا ہی اُلجھ جاتا۔ وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ وہ دوراہے پر کھڑا تھا جہاں سے اسے کسی بھی راستے کا چناؤ مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی حالت یوں تھی جیسے سانپ کے منہ میں چھپکلی۔ ایک طرف اس کا دماغ تھا جو اس سے کہہ رہا تھا ''تمہاری زندگی کی ڈور اس چوری کے ساتھ بندھی ہے۔ تمہاری زندگی چوری ہے' چوری سے وابستہ ہے اور اسی سے تم نے پیٹ بھرنا ہے۔ اگر تم نے ہاتھ کھینچ لیا تو تیسرے دن ہی فاقے سے مر جاؤ گے' اُدھار تک تمہیں کوئی نہیں دے گا اور مزدوری کا مزہ تم چکھ چکے ہو۔ شہر میں فروٹ بیچے تو تم رشوت خور اہلکاروں کا پیٹ نہ بھر سکے۔ عزتِ نفس کو محفوظ رکھنا ہر جگہ تمہاری کامیابی کے راستے کا روڑا بنا اور پھر فاقوں نے تمہیں رات کی شہنشاہی سکھا دی۔ اگر تم نے یہ شہنشاہیت چھوڑ دی تو پھر کئے اور نہ کئے ہوئے گناہوں کی سزا اس دنیا کے قید خانے میں ہمیشہ بھگتو گے''۔

دوسری طرف اس کا دل تھا جو اس سے کہہ رہا تھا: ''یہ اس شخص کے ایمان کا سوال ہے جس کے گھر میں چوری کے لئے چُھپے بیٹھے ہو۔ اُس کا ایمان

ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی برکت سے اُس کے گھر میں چور نہیں آ سکتا اور اگر تم نے یہاں چوری کر لی تو اس کا اللہ تعالیٰ اور اس کے کلام پر سے ایمان اُٹھ جائے گا۔ وہ کبھی اپنا عقیدہ مضبوط نہیں رکھ سکے گا۔ جب تک عقیدہ مضبوط نہ ہو، بندہ کسی کام کا نہیں ہوتا۔ اس کے ایمانی انحطاط اور عقیدے کے ٹوٹ جانے کے ذمے دار تم اور صرف تم ہو گے اور قیامت کے دن تم سے اس کی باز پرس ہوگی۔ آج کے بعد اس آدمی کے سارے گناہ تمہارے ذمے ڈال دیئے جائیں گے، اگر تم نے کوئی نیکی کی ہے تو وہ بھی اس کے خانے میں ڈال دی جائے گی۔ آج تم پیٹ کا دوزخ تو بھر لو گے مگر پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوزخ میں جُھلسو گے اور اگر آج تم نے اس آدمی کے ایمان کو متزلزل ہونے سے بچا لیا تو شاید اس نیکی کے صلے میں تمہاری ساری خطائیں معاف کر دی جائیں۔''

دل اور دماغ میں جنگ و جدل کی کیفیت جاری رہی اور کچھ دیر تک وہ سانس لینا بھی بھول گیا۔ آخر دل نے معرکہ مار لیا اور اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ سامنے پڑا شکار چھوڑ کر خالی ہاتھ جانے کا فیصلہ کیا۔

وہ درخت سے دیوار پر اُترا تو درخت کے پتے ہلنے سے کتے کو خبر ہو گئی۔ اس نے زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا اور دوڑ کر دیوار کی طرف آ گیا۔ روشن نے اپنے آپ کو دیوار پر پھیلے پتوں میں چُھپا لیا اور بے حس و حرکت ہو کر بیٹھ گیا۔ گھر کے مالک نے نیم خوابیدگی کے عالم میں کتے کو دو تین مرتبہ ڈانٹا مگر وہ دیوار کے ساتھ والے درخت کی طرف منہ کر کے زور زور سے بھونکتا رہا۔ کتے کے مسلسل اور زوردار بھونکنے سے مالک اپنی چارپائی سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اپنے آپ کو بچے کی بانہوں سے آزاد کرایا، بچے پر کپڑا ڈال دیا اور دیوار کی طرف آنے لگا جس جانب منہ کر کے کتا بھونک رہا تھا۔ روشن پہلے تو پتوں کی آڑ میں دیوار پر بیٹھا تھا مگر جیسے ہی گھر کے مالک نے اس کی طرف آنا شروع کیا، اس نے خطرے کو بھانپ کر باہر گلی میں چھلانگ لگا دی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ گھر کا مالک پتے ہلنے اور چھلانگ کی آواز سن کر ہوشیار ہو گیا۔ بندوق لے کر وہ بھی اس کے پیچھے دوڑا اور بلند آواز میں ''چور! چور!'' پکارنے لگا۔ دو تین منٹ میں اس کے ساتھ آٹھ دس اور آدمی مل گئے۔ دو کے پاس بندوق بھی تھی مگر ان کے اور روشن کے درمیان کافی فاصلہ حائل تھا۔ روشن اپنی پوری رفتار سے بھاگ رہا تھا اور اس کا رُخ گاؤں سے باہر کھیتوں کی طرف تھا۔ اب گاؤں کے کافی لوگ جاگ چکے تھے اور جس جانب سے ''چور! چور!'' کا شور اُٹھ رہا تھا، اُس طرف بھاگنے لگے۔ اب ان کی تعداد بیس کے لگ بھگ تھی اور رات کے سناٹے میں ان کا شور کافی دُور تک سنا جا سکتا تھا۔ روشن جلد سے جلد گاؤں سے باہر نکلنا چاہتا تھا، اسی لئے وہ بہت تیز دوڑ رہا تھا۔ اگر وہ گاؤں سے باہر نکل جاتا تو پھر کھیتوں میں اسے دن کی روشنی میں بھی ڈھونڈ لینا ممکن نہ تھا۔ جب وہ بھاگتے ہوئے آخری موڑ مڑ کر سیدھی گلی میں داخل ہوا، جو گاؤں سے باہر جا رہی تھی، تو گاؤں کے پہرے دار نے اس کو دیکھ لیا۔ اس نے لالٹین اور ڈنڈا ایک طرف پھینک دیا، اور آگے بڑھ کر اس کو دبوچ لیا۔ روشن کا ہاتھ اپنے نیفے میں اُڑسے خنجر پر پڑا، اس نے خنجر نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ ایک لحظے کو سوچا اور خنجر پہرے دار کو گھونپنے کی بجائے اس کی نظروں سے بچا کر نالی میں پھینک دیا۔ اب اس کی سانس پُھول چکی تھی، اس کے لئے مزید دوڑنا اب ممکن نہ تھا۔ اتنی دیر میں گاؤں والوں کا شور بہت نزدیک آ چکا تھا۔ روشن نے اپنے حواس میں پہرے دار کے یہ کلمات سنے: ''گھبرانا نہیں بھائیو! میں نے چور پکڑ لیا ہے۔!''

''چور'' کا لفظ اس کے سینے پر گھونسے کی طرح لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس کا دماغ یک دم اندھیرے کے گہرے سمندر میں ڈوب گیا!

آخری تحفہ

محمد شعیب

صفیں باندھی جا چکی تھیں۔ وہ سب سے اگلی صف کے درمیان غم سے نڈھال کھڑا تھا۔ سُو جی ہوئی پُرنم آنکھیں اُس کے دکھ اور کرب کی غمازی کر رہی تھیں۔ اچانک ایک آواز گونجی' جسے سنتے ہی وہ بے چین ہو گیا۔ وہ نظریں اُٹھا کر سامنے دیکھتا مگر فوراً ہی شرمندگی سے نظریں جھکا لیتا۔ احساسِ ندامت اور پچھتاوے نے اس کے غم میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

اس نے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ ایک بھائی اور چار بہنوں کے بعد پیدا ہوا تھا' اس لئے سب کا لاڈلا قرار پایا۔ بہنیں اسے یُوں گود میں اُٹھائے پھرتیں جیسے وہ کوئی گُڈا ہو۔ سب سے بڑے بھائی نے ماں باپ اور بہنوں کی توجہ اپنی طرف کم ہوتی ہوئی محسوس کی لیکن چھوٹے بھائی کی محبت میں اس نے بھی اسے کُھلے دل سے تسلیم کر لیا اور یوں وہ سب کی توجہ اور محبت کا مرکز بن گیا۔ اس کی والدہ تو اس پر جان چھڑکتی تھیں۔ ہر طرح سے اس کا خیال رکھتیں۔

اس کا بڑا بھائی اور بہنیں بھی سکول جاتی تھیں لیکن اس کو ایک اچھے اور مہنگے سکول میں داخل کروایا گیا۔ لاڈ پیار کے ساتھ ساتھ اس کی والدہ نے اس کی اچھی تربیت پر بھی توجہ دی۔ وہ ذہین اور محنتی تھا' توجہ سے پڑھتا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر کلاس میں وہ کوئی نہ کوئی پوزیشن ضرور لے لیتا۔

اس کے والد کی کپڑے کی مناسب سی دکان تھی۔ گھر کا خرچ ٹھیک چل رہا تھا۔ وہ چھٹی کلاس میں تھا جب ایک روز اچانک اس کے والد کو دل کا دورہ پڑا اور ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ ابھی چھوٹا تھا' اس کو اندازہ نہیں تھا کہ کتنا بڑا سانحہ گزر گیا ہے۔ باپ کی وفات کے بعد اس کے بڑے بھائی نے تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور والد کی دکان اور گھر بھر کی کفالت کی ذمہ داری سنبھال لی۔ اس کے بڑے بھائی کو تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا لیکن حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اور اپنے شوق کی قربانی دیتے ہوئے اپنے خوابوں کی تعبیر کو اپنے چھوٹے بھائی کے مستقبل میں دیکھنا شروع کر دیا۔ چھوٹے بھائی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ چار بہنوں کی تعلیم اور ان کی شادیوں کی ذمہ داری بھی اس کے کندھوں پر تھی۔ اس کی والدہ نے سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے گھریلو حالات کے اس بدلتے ہوئے منظر نامے میں گھر کے تمام افراد میں ایسی روح پھونک دی کہ سب نے اپنی ناجائز خواہشات ختم کرتے ہوئے خود کو اپنی ضرورتوں تک محدود کر لیا۔

وہ سب سے چھوٹا تھا' اسے حالات کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ باقی گھر والوں نے بھی اسے کوئی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ پہلے کی طرح اس کی خواہشوں کو پورا کیا جاتا اور ہر طرح سے اس کا خیال رکھا جاتا۔ جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا' حالات اس کی سمجھ میں آتے گئے۔ وہ جان گیا تھا کہ اس کے روشن مستقبل اور بہنوں کی ذمہ داری کی وجہ سے بڑے بھائی نے کتنی بڑی قربانی دی تھی۔ اس کی والدہ اور بہنیں کس طرح اپنی ضرورتوں کو کم کر کے اس کی خواہشات کو پورا کرتی تھیں۔ ان باتوں نے اس کے دل میں احساسِ ذمہ داری' اپنے گھر والوں کی محبت اور احترام میں مزید

اضافہ کر دیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ محنت اور لگن سے تعلیم حاصل کرنے لگا۔ ایف ایس سی کرنے کے بعد میڈیکل کالج میں داخلے کا مرحلہ آیا تو بھاری فیس اور کتابوں کے لیے کافی رقم کی ضرورت تھی۔ کاروبار سے اتنی رقم ایک دم نکالنا ممکن نہ تھا۔ والدہ نے اس کی بہنوں کے جہیز کے لیے کچھ رقم بچا کر رکھی تھی لیکن اس کے بجائے انہوں نے اپنے جہیز کا بچا ہوا واحد سونے کا سیٹ بیچ کر اس کے داخلے کی رقم جمع کروائی۔ اس نے اپنی والدہ کو بہت منع کیا لیکن والدہ نے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا کہ بیٹا جب تُو ڈاکٹر بن جائے گا تو میں نیا سیٹ بنوالوں گی' فی الحال تم اپنی تعلیم مکمل کرو۔

وہ دن رات محنت سے پڑھنے لگا۔ اس نے چاہا کہ اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے شام کے وقت کوئی ملازمت کر لے لیکن اس کے بڑے بھائی نے اسے منع کر دیا کہ میڈیکل کے لئے بہت زیادہ محنت اور پڑھائی کی ضرورت ہوتی ہے' اس طرح تمہاری توجہ تقسیم ہو جائے گی' تم ملازمت کا خیال دل سے نکال کر صرف اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔

وہ اکثر اپنی والدہ' بڑے بھائی اور بہنوں کی محبت اور ایثار کے بارے میں سوچتا۔ اس کے بڑے بھائی نے اس وقت تک شادی سے انکار کر دیا جب تک وہ میڈیکل کی تعلیم مکمل کر کے برسرِ روزگار نہیں ہو جاتا اور دو بہنوں کی شادی نہیں ہو جاتی۔ اس کی بڑی بہن بی اے کرنے کے بعد گھر میں بچوں کو ٹیوشن پڑھانے لگی۔ دوسری بہنیں اپنے لیے کوئی چیز خریدنے کے بجائے چھوٹے بھائی کے لئے کچھ خرید کر زیادہ خوشی محسوس کرتیں۔ اپنی والدہ کی تو وہ امنگوں اور آرزوؤں کا محور تھا۔ اسے وہ رات کبھی نہیں بھولتی تھی جب اس کو سخت بخار ہو گیا تھا۔ سر میں بھی شدید درد تھا۔ اس کی والدہ اس کے سر دبانے بیٹھ کر اس کو دبانے لگیں۔ اس نے انہیں روکنا چاہا لیکن انہوں نے پیار سے ڈانٹتے ہوئے اُسے خاموش کروا دیا۔ سر دبانے سے کچھ سکون محسوس ہوا تو اس کو نیند آ گئی۔ تقریباً دو اڑھائی گھنٹے بعد اس کی آنکھ کھلی تو دیکھا والدہ ابھی تک اس کا سر دبا رہی تھیں۔

ایم بی بی ایس کرنے کے بعد وہ ہاؤس جاب کرنے لگا۔ اسے اپنی منزل بہت قریب نظر آ رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد گھر والوں کا سہارا بنے۔ اس دوران ایک روز اس کی والدہ کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی۔ وہ انہیں ہسپتال لے آیا۔ اپنے جاننے والے تمام سپیشلسٹ ڈاکٹروں کو دکھایا' لیکن اُن کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں پیارے بیٹے کی خوشیوں سے اپنا حصہ لیے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو گئیں!

اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ اپنی والدہ کی میّت کے قدموں بیٹھ کر مسلسل آنسو بہاتا رہا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس ہستی کے دکھوں کو سمیٹنے کے لیے اس نے اتنا طویل سفر طے کیا تھا' عین منزل کے قریب پہنچ کر وہ اپنے سارے دکھوں کو اپنی آغوش میں لیے زمین کی آغوش میں چلی جائیں گی۔ ماں باپ اپنی ساری خوشیاں اولاد کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں' لیکن اپنے دکھوں کا سایہ تک اپنی اولاد پر نہیں پڑنے دیتے!

اچانک ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے نظریں سامنے اٹھائیں تو احساسِ ندامت نے اسے پھر حصار میں لے لیا۔ اس کے سامنے اس کی والدہ کی میّت پڑی تھی۔ صفیں باندھی جا چکی تھیں۔ امام صاحب نے نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیے لوگوں کو متوجہ کیا' لیکن اس کو نمازِ جنازہ پڑھنا نہیں آتی تھی۔ وہ کئی سال تک میڈیکل کی موٹی موٹی کتابیں یاد کرتا رہا تھا' لیکن رب کو یاد کرنے کا خیال اسے کبھی نہیں آیا تھا' جس کے پاس سب کو جانا ہے۔ اس احساس نے اس کے دکھ میں مزید اضافہ کر دیا۔ ساری زندگی اپنی خوشیاں اور خواہشات اُس پر نچھاور کرنے والی محبوب ترین ہستی اس دنیا سے رخصت ہو رہی تھی' مگر وہ انہیں دنیا کا آخری تحفہ بھی نہیں دے پایا تھا۔

اپنا گھر

انوشہ سلمان

راحیل صاحت تیس سال بعد وطن واپس آئے تھے۔ انہیں وطن کے ذرے ذرے سے پیار اور اپنائیت محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ایک ایک چیز انہیں پیار سے دیکھ رہی ہے۔ وہ بھی حیرت اور شوق کے عالَم میں اطراف کا جائزہ لے رہے تھے۔ جس جگہ وہ کھڑے تھے اس کے عین سامنے ایک میدان ہُوا کرتا تھا۔ وہاں بچپن میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ گُلی ڈنڈا اور کبڈی کھیلا کرتے تھے مگر اب وہ میدان نہیں، وہاں گھر اور دکانیں بن گئی تھیں۔

انہوں نے سہم کر سر کو جھٹکا دیا، زور سے سانس لی اور اپنے بھتیجے عمیر کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پان منہ میں رکھ کر کہا ''بھئی عمیر! یہاں کا تو نقشہ ہی بدل گیا ہے؟''

''جی ہاں! اس بار آپ بڑی مدت کے بعد آئے ہیں۔ اس عرصے میں بہت تبدیلیاں آ گئی ہیں۔'' ''آپ کو یہ تبدیلی اچھی لگی ہوگی؟''

انہوں نے آسودگی سے سانس لے کر کہا: ''ہاں! ایک پچھتاوا سا ہُوا۔ اُن دنوں یہ شہر بہت پُر امن اور پُر سکون تھا۔ یہ بھیڑ بھاڑ اور بھاگ دوڑ نہیں تھی۔ یہ شور شرابا اور افراتفری دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے ہر شخص نفسی نفسی کے عالَم میں ہے۔

انہوں نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ اب کہاں چلیں؟

''فرح خالہ کے ہاں چلتے ہیں۔ ان سے آپ ابھی نہیں ملے۔''

''فرح'' انہوں نے چونک کر کہا: ''مگر بھئی وہ تو گاؤں میں رہتی تھی اور میں نے اسے پچھلی بار کوئی پینتیس سال پہلے دیکھا تھا۔''

عمیر نے بھی قدم آگے بڑھایا: ''آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر ہُوا یہ کہ گاؤں میں ان کی مالی حالت ٹھیک نہیں رہی۔ پھر ان کے شوہر کا بھی انتقال ہو گیا۔ مجبور ہو کر وہ کوئی چار سال قبل یہاں آ گئیں۔''

''چلو اس سے ملتے ہیں۔''

وہ حیرت سے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے تھے مگر ایک کسک سی دل میں جاگزیں تھی، کچھ کھو دینے کا افسردہ احساس۔ ان کا دھیان بار بار اپنے پرانے گھر کی جانب جا رہا تھا۔ بے گھر ہونے کا عذاب کون محسوس نہیں کرتا۔

تنگ سی گلی میں سناٹے کا راج تھا۔ ایک بند دروازے پر پہنچ کر عمیر نے دستک دی۔ قدموں کی آواز سنائی دی۔ کُنڈی گری اور پھر دروازہ مدھم سی چرچراہٹ کے ساتھ کُھل گیا۔ عمیر کے پیچھے پیچھے وہ اندر داخل ہوئے۔ چھوٹا سا آنگن تھا جس لڑکی نے دروازہ کھولا تھا، وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ سامنے صحن میں ایک عمر رسیدہ عورت کھڑی تھی۔ دھان پان سا بدن، نکلتا ہُوا قد، چہرے پر بیتے ہوئے ماہ و سال نے لکیروں کا جال بُن رکھا تھا۔ فرح کو انہوں نے تیس برس قبل آخری بار دیکھا تھا۔ اُس وقت وہ کِھلے ہوئے ایک شاداب پھول کی طرح تھی، مگر اب وہ پھول مرجھا گیا تھا جیسے خود ان سے وقت نے سب کچھ چھین لیا تھا۔ وہ افسردہ نظروں سے اپنی برسوں سے بچھڑی بہن کو دیکھتے رہے۔ یکا یک عمیر نے کہا ''خالہ پہچانئے تو یہ کون ہیں؟''

فرح شش وپنج کے عالَم میں انہیں گھور رہی تھی، عمیر کی آواز سنی تو ایک بار پھرانہیں غور سے دیکھا۔ پھر یکا یک اس کے چہرے پر حیرت کے گہرے آثار اُبھرے جیسے اس کا وجود اندر ہی اندر اتھل پتھل ہوکر رہ گیا ہو۔ پھر وہ یک لخت آگے بڑھی اور جذبات سے مغلوب آواز میں چیخی: ''ارے بھیا راحیل!'' کئی منٹ تک فرح کا ناتواں جسم خشک پتے کی طرح ان کے بازوؤں میں کانپتا رہا۔کئی منٹ تک وہ اپنے دھڑکتے دل کو سنبھالنے کی کوشش کرتے رہے پھر حولے سے فرح کو خود سے الگ کیا۔

فرح نے آنسو پونچھتے صرف اتنا کہا: ''کتنی مدت بعد آئے ہو؟''

چالیس سال بیتے کہ انہوں نے گھر کو خیر باد کہا تھا۔ پہلے لندن میں گھر بنایا۔ پھر کچھ سال کینیڈا میں گزارے لیکن کینیڈا کی برف اچھی نہیں لگی تو واپس برطانیہ آ گئے۔ جب گئے تھے تو جوانی رگوں میں آگ بن کر دوڑتی تھی۔ کچھ ماحول کا اثر تھا، کچھ ان کا اپنا طرزِ فکر کہ دھیرے دھیرے انہوں نے خود کو بالکل بدل ڈالا۔ زندگی کا وہ چولا جو وطن سے پہن کر آئے تھے اُتار پھینکا اور ایک نیا روپ اختیار کیا۔

پہلے ایک خوبصورت اور کشادہ مکان بنایا اور پھر اسے مغربی طرز پر آراستہ کیا۔ پھر اصول اور ضابطے بنائے۔ صبح آٹھ بجے کے بعد ناشتہ نہیں ملے گا۔ شام کو ٹھیک سات بجے کھانا جسے وہ ''ٹی'' کہنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ بچے انگریزی میں بات کرتے، تو انہیں فخر اور خوشی کا احساس ہوتا۔ صبح سب سے پہلے شیو کرنا بہت ضروری تھا۔ بغیر ٹائی اور سوٹ کے وہ کبھی باہر نہیں گئے تھے۔ قمیض، پائجامہ پہن کر باہر نکلنا ان کے خیال میں بدتہذیبی اور گنوار پن تھا۔ انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے وہ بغیر لباس کے باہر چلے گئے ہوں۔

اپنے ان خیالات اور مخصوص طرزِ زندگی کی بناء پر اپنے واقف کاروں میں وہ خاصے بد دماغ مشہور ہو گئے تھے لیکن انہیں رائے عامہ کی کوئی پروا نہیں تھی۔ شروع کے دس برسوں میں دو تین مرتبہ وطن آئے تھے لیکن دونوں ہی بار خوش نہیں ہوئے تھے۔

انہیں اپنے شہر کی ہر شے ناپسندیدہ محسوس ہوتی تھی۔ دھوپ، گرمی، گرد وغبار مکھیاں اور لوگ۔ جہاں جاتے ناک پر رومال رکھے رہتے۔ عزیزوں کے یہاں جاتے تو کھانے پینے میں احتیاط برتتے۔ جو معمول ان کا انگلستان میں تھا، اس میں ذرا فرق نہیں آنے دیا۔ چپل نہیں پہنی کہ گرد وغبار سے پاؤں گندے ہو جائیں گے۔ ناشتہ انگلش طرز کا کرتے۔ باہر نکلتے تو کم از کم شرٹ پتلون میں۔ سوتے سلیپنگ سوٹ میں اور گاؤن پہن کر باتھ روم جاتے۔ انہیں کوفت ہوتی جب وہ دیکھتے کہ لوگ جن کپڑوں میں سارا دن گزارتے ہیں، انہی میں سو بھی جاتے ہیں۔

آخری بار وہ اماں کے انتقال پر آئے تھے اور صرف ایک ہفتہ ٹھہر کر واپس چلے گئے تھے۔ کچھ تو ملازمت کا جنجال، کچھ یہ کہ ان کے دل میں آنے کی خواہش بھی نہیں تھی۔ چنانچہ اپنا شہر، اس کی گلیاں اور عزیزوں کے چہرے اگر کبھی بھولے بھٹکے یادوں میں ابھرتے بھی تو انہیں کسی کمی کا احساس نہ ہوتا۔

اور پھر دونوں بچوں کی شادیاں ہوئیں، لیکن شادیوں میں ان کی پسند اور رضامندی کا دخل نہیں تھا، جس سے انہیں پہلی بار کچھ ملال ہوا۔ لڑکے نے ایک برٹش لڑکی سے شادی رچائی جو اس کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔ لڑکی کے لئے انہوں نے رشتے کی بہن کے بیٹے کو عرصے سے پسند کر رکھا تھا۔ بہن بیوہ تھی، صرف ایک ہی بیٹا تھا اس کا۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکا انگلینڈ آئے گا تو گھر داماد بن کر رہے گا۔ یوں ان کی لڑکی ان کے پاس رہے گی، جب یہ بات انہوں نے بیوی سے کہی تو اس نے ناک بھوں چڑھا کر کہا: ''بھول جاؤ اس بات کو۔'' بیوی کا ایک خالہ زاد بھائی تھا جو کئی سال سے امریکہ میں مقیم تھا۔ اس کا بیٹا بیوی کو بہت پسند تھا۔

اس لئے نہیں کہ لڑکے میں کوئی خوبی تھی' بلکہ صرف اس لئے کہ وہ اس کے بھائی کا بیٹا تھا۔

اس موقع پر انہیں پہلی بار اس فاصلے کا اندازہ ہوا جو اُن کے اور بیوی بچوں کے درمیان تھا۔ بیوی نے ان کے فیصلے اور پسند کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھا۔ بچوں نے انہیں قطعاً نظر انداز کر دیا۔ دوسری شادی کے بعد لڑکی نے امریکہ کا رخ کیا اور لڑکا بھی اپنی بیوی کے ساتھ دوسرے شہر چلا گیا۔ ایک تو اس بنا پر کہ اسے وہاں ایک بہتر ملازمت مل گئی تھی اور دوم یہ کہ وہاں اس کی بیوی کے ماں باپ رہتے تھے۔

اب بڑھاپا سر پہ تھا۔ زندگی ایک نیا روپ اختیار کر رہی تھی۔ جس دائرے میں زندہ رہ رہے تھے' وہ اب تنگ ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا کہ اس دائرے میں وہ تنہا ہیں۔ وہ مکان جسے انہوں نے بڑے چاؤ سے سجایا تھا' سنوارا تھا اور جو انہیں بہت پسند بھی تھا' اب ویران' بے رونق اور خالی خالی نظر آتا۔ تنہائی میں پرانی یادیں ماضی کے دریچوں سے اتر کر ان کے گرد آ بیٹھتیں۔ والدین' بہن بھائی' رشہ دار' محلے دار' عزیز' دوست' گلی کوچے اور اپنا گھر... وہ آنکھیں بند کر لیتے اور ڈوبتے دل کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کرتے۔

کبھی کبھی ان کا دل گھبراتا' ایک وحشت سی ہوتی اور گھر سے نکل کھڑے ہوتے۔ سڑکوں پر مارے مارے پھرتے' پھر بھی گھٹن اور وحشت میں کمی نہ آتی۔ اکیلے پن کا احساس اور ایک انجانا خوف انہیں گھیرے رہتا۔ ایسے ہی ایک موقع پر وہ اِدھر اُدھر بھٹک کر بمشکل واپس آئے۔

فرح اور اس کے بیٹے سے ملاقات کر کے نکلے تو گلی میں سناٹا' شام کی نیم تاریکی' ویرانی اور تنہائی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اپنے مکان کے دروازے پر پہنچے تو یکا یک جھجک کر رک گئے۔ ہونٹوں پر زبان پھیری اور اپنے گھر کے دروازے کو یوں غور سے دیکھا' جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔

''میرا خیال ہے کہ قبرستان یہاں سے دور نہیں ہے۔ اب یہاں تک آئے ہیں تو ذرا قبرستان بھی ہو لیں۔'' سڑک کے دونوں جانب دکانوں اور چائے خانوں میں رونق نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک ایک شے کو دھیان سے دیکھتے ہوئے چلتے رہے۔ اب وہ خاصے تھک گئے تھے۔ ٹانگوں میں تھکن کے باعث درد ہونے لگا تھا۔ سانس بھی کچھ بھاری ہو گئی۔ تاہم انہوں نے پروا نہیں کی۔ ایک کے بعد دوسرا قدم اٹھاتے رہے۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ قبرستان کے قریب پہنچ گئے۔ قبرستان سے متصل بھکاریوں کی ایک بستی ہُوا کرتی تھی۔ ٹاٹ اور سرکنڈوں سے بنی ہوئی جھونپڑیوں کی جگہ کچھ گودام اور چند ایک دکانیں اور مکان بن چکے تھے۔ وہ یکا یک رک گئے اور بولے: ''یار! اس جگہ فقیروں کی ایک بستی ہوا کرتی تھی۔''

عمیر نے کہا ''مگر وہ بستی تو کب کی ختم ہو گئی۔''

''تو ان بیچارے فقیروں سے بھی اپنے گھر چھن گئے۔'' انہوں نے بڑے دُکھ سے کہا۔ عمیر نے چونک کر ان کے چہرے پر نظر ڈالی اور دیر تک دیکھتا رہا' مگر زباں سے کچھ نہیں کہا۔

قبرستان کے باہر پھولوں کی چند دکانیں تھیں۔ انہوں نے گلاب کی پتیاں' پھول اور اگربتی کے پیکٹ خریدے۔ قبرستان میں قدم رکھا اور بولے: ''قبرستان! شہرِ خموشاں' جہاں انجام کار ہر ذی نفس کو آنا ہے۔ اُنہیں بھی جو قدموں میں سر جھکاتے ہیں اور اُنہیں بھی جو جھکے ہوئے سروں کو ٹھوکر مارتے ہیں۔'' انہوں نے قبروں کے درمیان کھڑے ہو کر دُور تک نظر ڈالی۔ جہاں تک نظر گئی' قبریں ہی قبریں تھیں... کچّے' پکّے' چھوٹے بڑے مٹی کے تودے۔ قبرستان میں جا بجا چھوٹے بڑے پیڑ تھے اور کہیں کہیں جھاڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ بعض جھاڑیوں میں زرد پھُول کِھلے ہوئے تھے جو قبرستان کی ویرانی اور اُداسی میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔

پورے قبرستان کی حالت خاصی خستہ تھی‘ صفائی بالکل نہیں تھی۔ کوڑا کرکٹ اِدھر اُدھر بکھرا ہوا تھا۔ قبروں کے درمیان کوئی ترتیب وسلیقہ نہیں تھا۔ روشیں کہیں محدود اور کہیں مسدود تھیں۔ اکثر قبریں شِکستہ حالت میں تھیں اور بعض کچی قبریں خستگی کے باعث اندر دھنس گئی تھیں۔ قبرستان کی اُداسی اور ویرانی نے پہلے ہی انہیں افسردہ کر دیا تھا‘ خستگی نے اور بھی ملول کر دیا۔ وہ افسردہ نظروں سے قبروں کو دیکھتے رہے اور سنبھل سنبھل کر آگے بڑھتے رہے۔ احتیاط لازم تھی‘ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی قبر پر پاؤں پڑ جائے اور مکین قبر کی روح کو تکلیف پہنچے۔ چند منٹ بعد وہ قبرستان کے اس حصے میں جا پہنچے جہاں ان کے خاندان کے افراد مدفون تھے۔ یکا یک عمیر نے کہا کہ چچا آپ کتنے عرصے بعد قبرستان آئے ہیں؟

انہوں نے غور کرتے ہوئے جواب دیا: ’’پچھلی بار تیس سال پہلے آیا تھا‘ اس عرصے میں کافی تبدیلیاں ہوگئی ہیں۔ قبرستان کا یہ حصہ کافی بھر گیا ہے۔ جب پچھلی بار آیا تھا تو کئی افراد نے ہوائی اڈے پر مجھے خوش آمدید کہا تھا۔ اس بار وہ وہاں موجود نہیں تھے‘ کیونکہ اب وہ یہاں محوِ خواب ہیں۔‘‘

وہ پھر قبروں کی طرف متوجہ ہوئے۔ قبرستان کا یہ حصہ ان کے خاندان کے لئے مخصوص تھا۔ ڈیڑھ سو سال میں خاندان کے جو افراد جہانِ فانی سے رخصت ہوئے تھے‘ وہ اسی حصے میں محوِ خواب تھے۔ وہ المناک نظروں سے ان سب قبروں کو دیکھتے رہے اور ان کے دل میں ایک خلاء سا پھیلتا چلا گیا جو اُداسی‘ ویرانی اور احساس بے ثباتی سے بھرا ہُوا تھا۔ کتنی عجیب بات ہے۔ نا قابلِ فہم اور حیرت ناک کہ یہ سب لوگ جو قبروں میں دنیا کے تمام آزاروں سے بے نیاز ہو کر سو رہے ہیں‘ کبھی اس دھرتی پر موجود تھے۔ چلتے پھرتے تھے‘ اپنے بچوں کے لئے مشقت کرتے تھے‘ اپنے اپنے حصے کے دکھ جھیلتے تھے اور خوشیاں سمیٹتے تھے‘ مگر اب یہ یہاں نہیں ہیں‘ کیسا حیران کُن راز ہے۔ کبھی تھے‘ اب نہیں ہیں۔ ہونٹوں پر قدرے افسردگی سے زبان پھیری اور آگے بڑھے۔ پہلے انہوں نے قبروں کے اردگرد سے خشک ٹہنیاں‘ سوکھے پتے اور کنکر صاف کئے۔ پھر قبروں پر پھول ڈالے‘ اگربتیاں جلائیں اور فاتحہ پڑھی۔ پھر اپنی ماں کی قبر کے پاس آ کر زمین پر بیٹھ گئے اور گہری محویت میں اپنی ماں کا کتبہ دیکھتے رہے۔ گلاب کی پتیوں کی مہک اور اگربتی کا معطر دھواں فضا میں پھیل رہا تھا اور اس ریشمی دھوئیں میں وہ اپنی اماں کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ خوبصورت مہربان‘ اور دعا دیتا ہُوا چہرہ! چند لمحے بعد وہ پلٹے‘ ان کی اماں کی قبر کی پائنتی کافی زمین خالی تھی۔ انہوں نے اس خالی زمین پر نظر ڈالی۔ پھر یکا یک پلٹ کر عمیر سے کہا: ’’بس یہ جگہ میرے لئے ٹھیک رہے گی۔ اماں کے قدموں میں یہ جگہ میرے لئے بالکل مناسب رہے گی۔‘‘

وہ یکا یک سنجیدہ ہوگئے۔ گہری نظروں سے عمیر کو دیکھا۔ ہاتھ اُٹھا کر سر کے نیم سفید بالوں میں انگلیاں پھیریں‘ پھر لب کھولے تو ان کی آواز میں ارتعاش تھا۔ عمیر سے کہنے لگے: ’’عمیر تم جانتے ہو پرندے صبح سویرے دانے دُنکے کی جستجو میں اپنے گھونسلوں سے نکلتے ہیں۔ پھر دُور تک جاتے ہیں‘ انجانی وادیوں اور مرغزاروں میں۔ سارا دن دانے پانی کی جستجو میں سرگرداں رہتے ہیں۔ جب دن ڈھلتا ہے اور شام پڑتی ہے‘ تو کہیں رکتے نہیں‘ کہیں بسیرا نہیں کرتے۔ میلوں کا فاصلہ طے کرنا پڑے تو بھی رات ہونے سے پہلے لوٹ کر اپنے گھر میرا مطلب ہے گھونسلوں میں واپس آ جاتے ہیں۔‘‘

لمحہ بھر گہری نظروں سے خلا میں گھورتے رہے۔ پھر ہونٹوں پر زبان پھیری اور انہوں نے کہا: ’’اب شام ہو رہی ہے عمیر۔‘‘ کچھ کہتے کہتے رُک گئے‘ پھر کانپتے لہجے میں کہا: ’’عمیر میں چاہتا ہوں کہ رات ہونے سے پہلے میں بھی اپنے گھر لوٹ آؤں!‘‘

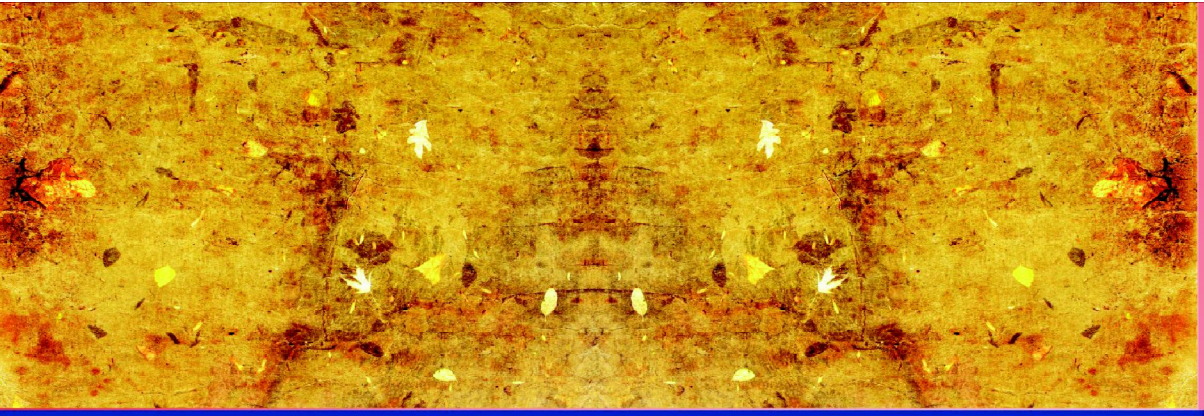

شعلۂ آواز

سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

—— اقبالؒ

اسلامی جمہوریہ پاکستان

یہ ارضِ پاک ہماری، نشانِ عزّت ہے
شناخت ہے یہ، ہماری حِصارِ وحدت کی

یہ میرا مُلک، مِری سرزمیں، میرا وطن
یہ میرے ربّ کا کرم ہے، اُسی کی قدرت ہے

شبِ[1] مبارکۂ قدر میں مِلا ہے ہمیں
بہ فیضِ ختمِ رسالتؐ یہ ربّ کی رحمت ہے

مہِ صیَام بھی ہے، قدر والی رات بھی ہے
قیامِ ارضِ وطن رحمتوں کی کثرت ہے

جو اِس کو خواب سمجھتے تھے، اُن کو جتلا دو
کہ آج اِس کا قیام و بقا حقیقت ہے

مزاجِ مِلّتِ اسلامیہ کو پہچانو
کہ ہر جوان کو اِس سرزمیں سے اُلفت ہے

اِسی کے نام سے ہیں نوجوان سَر اَفراز
جِلَو میں جن کے بہر گام فتح و نُصرت ہے

عطا ہُوا ہے جنہیں جذبۂ جہاد کا نُور
سپُرد اُن کے مِرے مُلک کی حفاظت ہے

دُعا ہے سب کی: خدا ہم کو سرفراز کرے
اَدائے فرض کی تاریخ ہم پہ ناز کرے!

— سیّد محمود احمد

1۔ اللہ تعالیٰ نے 26 اور 27 رمضان المبارک کی درمیانی رات — لیلۃ القدر — میں پاکستان عطا فرمایا

شہیدوں اور غازیوں کے لئے

منیبہ زہرہ نقوی

وطن کی خاطر جو دُور ہم سے
شجاعت اپنی دکھا رہے ہیں
اُنہی سے مجھ کو ہے اتنا کہنا
وہ یہ نہ سوچیں، وہ یہ نہ سمجھیں
اگر وہ تنہائیوں کے رستے میں، دُور ہیں اور بہت پرے ہیں
اور اُن کی راہ میں مسافرت کی، کئی فصیلیں گڑی ہوئی ہیں
ہماری نظریں اُنہی کی راہوں میں
ہر طرف اُن کو ڈھونڈتی ہیں
وہ سب کہ جن کے دلوں میں ہر دم
وطن کی خاطر، جہاد کا اِک الوہی جذبہ
رگوں میں، جاں اور دل میں ہر دم
یوں موجزن ہے
کہ آج سب اُن سے کہہ رہے ہیں:
شہید و غازی نے جان دے کر
لہو کا اپنے خراج دے کر
قبائیں رنگیں ہمیں عطا کیں
سنہری صبح ہمیں دکھا دیں
کہ جن سے ایسا نکھار آیا
کہ سارے چہرے دمک اُٹھے ہیں
وہ سارے چہرے، دعائیں جن کی
تمہارے کانوں میں آج پھر سے
نویدِ فتح سُنا رہی ہیں
شہید ہو یا کہ تم ہو غازی!
یہ مائیں بیٹے، وہ بہن بھائی
جو دُور تم سے بہت ہیں لیکن
تمہاری عظمت کے معترف ہیں
تمہاری جرأت کے معترف ہیں
دعائیں اُن کی جِلَو میں لے کر
تم آگے بڑھنا، یہ سوچ کر اَب
وطن کے دشمن جو بڑھ رہے ہیں
وہ لَوٹ جائیں شکست کھا کر
مثالِ حمزہؓ، بنامِ حیدرؓ ذرا دکھاؤ پھر اپنے جوہر
دعا یہ دل سے نکل رہی ہے:
خدا کرے کہ تمہاری نُصرت
نہایت اعلیٰ، بہت ہو اَرفع!

کشمیر

سیّدنُورالحسن

ذرا کشمیر کو دیکھو!
محبت کے سفینے جل رہے ہیں، خون بکھرا ہے
سُلگتی شام کیوں ہے، آنسوؤں کا راج کیونکر ہے؟
یہاں راتوں میں شامل سسکیوں کا ساز کیونکر ہے؟
جوانی کی حکومت، سلطنت تاراج کیونکر ہے؟
چناروں سے ٹپکتا یہ لہو اور آگ کیونکر ہے؟
یہ وحشت، بربریّت، زندگی دَر گور کیونکر ہے؟
رِدائیں لُٹ رہی ہیں، گولیوں کا شور کیونکر ہے؟
یہ وہ آنگن ہے کیا جس میں بہاریں آن بستی تھیں؟
یہ وہ آنگن ہے، جس میں رحمتیں ہر دم برستی تھیں؟
بھری وادی کا موسم آج خوں آشام کیونکر ہے؟
کہ اب جس سمت دیکھیں
ایک ہی منظر ہے بس، گویا!
بہاروں سے بھرے آنگن میں کتنی ہی جواں لاشیں
نجانے کتنی ماؤں کے جگر گوشوں کی بارا تیں
لُٹی ہیں اس طرح کہ اب نشاں باقی نہیں ملتا
جواں سینوں میں وہ جو گولیاں ہر روز کھاتے ہیں
جو اپنے ساتھ کے کڑیل جواں بھائیوں کی لاشوں کو
بڑے ہی صبر سے، برداشت سے آ کر اُٹھاتے ہیں
اُنہیں رونے، کسی فریاد کے لمحے نہیں ملتے
مگر آنکھیں سوالی بن کے
گویا پوچھتی ہیں یہ
کہ کیا اندھیر ہے، کیوں اب کوئی فرماں نہیں ملتا؟
بقائے زندگی کا کیوں بھلا اعلاں نہیں ملتا؟
یا یُو اَین او میں اب باقی کوئی انساں نہیں ملتا؟
کہ اس وحشت کو آخر کیوں کوئی عنواں نہیں ملتا؟
جواں سینوں کے چھلنی دل
مچلتی آرزوئیں
اور ترستی شبنمی آنکھیں
زبانِ حال سے یہ پوچھتی ہیں ان درندوں سے
یہ کس پنڈت کا تھا فرمان
کہ یوں تم دھونس دے دے کر
یوں انساں مار کر بیٹھو؟
یہ کس شنکر کی تھی تلقین
کہ یوں قتل کر کے تم
چڑھاؤ بھینٹ جانیں
اور پھر حیوان بن جاؤ؟
یہ کس شیطان نے تم سے کہا کہ رَوند کر لاشیں
جلاؤ گھر، تباہی کا نیا عنوان لکھ ڈالو
یہی انسانیّت ہے گر، تو پھر حیوانیّت کیا ہے؟
یہی ہے گر سکُوں، تو بربریّت کس کو کہتے ہیں؟
یوں لاشیں روندنا اور زندگی برباد کر دینا
چمن زاروں میں سنّاٹوں کا ہر سُو راج کر دینا
دُکھوں کے بیج بو کر اُلفتیں تاراج کر دینا
خود انسانوں کو انسانوں کا ہی محتاج کر دینا
تمہاری ہی آہِنسا کی ''حقیقت'' ہم نے دیکھی ہے
یہ وحشت، بربریّت کی ''شجاعت'' ہم نے دیکھی ہے!

ہم اُس سے اب تک ڈرے ہوئے ہیں!

نوشابہ شیراز

دلیل پر جو اَڑے ہوئے ہیں
وہ لوگ ہی تو ڈسے ہوئے ہیں

وہ یاد آتے ہیں، بُھولتے ہیں
جو تم نے وعدے کئے ہُوئے ہیں

کڑی مسافت کی گرد دیکھو!
تمام چہرے اَٹے ہوئے ہیں

محبتیں اب جو بانٹتے ہیں
وہ نفرتوں کے ڈسے ہوئے ہیں

ہمارے خوابوں کے راستے مَیں
سَراب کے در کُھلے ہوئے ہیں

چلی تھی پچھلے برس جو آندھی
ہم اُس سے اب تک ڈرے ہوئے ہیں

بہار کیسی عجب ہے پیارو!
تمام پتّے جلے ہوئے ہیں

اِک چُپ ہے کہ ہر بھید کا در کھول رہی ہے

محمد دیباج

وہ جس کی کہانی پسِ اوراق نہاں ہے
ہر نظم کے پیکر میں وہی زمزمہ خواں ہے

وہ بات کہ جو تجھ سے چُھپائی ہے ہمیشہ
سچ پوچھ، وہی بات مِرے دل کی زباں ہے

اِک چُپ ہے کہ ہر بھید کا در کھول رہی ہے
اِک بات ہے ایسی کہ نگاہوں سے عیاں ہے

اِک شمع کہ ہر آن بھڑکتی ہی رہی ہے
اِک درد کا ہے دیپ کہ ہر سمت دھواں ہے

جس شاخ کے پت جھڑ نے گُہر چھین لئے تھے
پت جھڑ تو گئی، شاخ پہ اب تک لرزاں ہے

یہ آگ انا کی تو جلا ڈالے گی دامن
اور موڑ جدائی کا بھی اِک اندھا کنواں ہے

جو ربّ کی عنایت کے طلب گار رہے ہیں
پھر اُن کو غمِ دَہر کی کچھ فکر کہاں ہے!

اگر جانے سے پہلے استخارہ کر لیا ہوتا

اریبہ زہرہ

نظر کی روشنی ملتی، وفا کے قمقمے جلتے
کسی نے گھر کے آنگن میں اُجالا کر لیا ہوتا

جدائی کی کَسک ایسے نہ دل میں کروٹیں لیتی
ذرا پہلے مُرَوّت سے کنارہ کر لیا ہوتا

بہت آرام سے یہ زندگانی بھی گزر جاتی
اگر یہ اضطرابِ دل گوارہ کر لیا ہوتا

اگر جانے سے پہلے استخارہ کر لیا ہوتا
تو یہ دردِ جدائی بھی گوارہ کر لیا ہوتا!

شہیدوں کا پھر ذکر شاید ہُوا ہے!

سیّدہ قُدسیہ

تعلق جو تکمیلِ رازِ خودی ہے
خودی سے ہی عرفان اور آگہی ہے

سمندر سے ساحل کا کیا فاصلہ ہے!
بس اتنی سی دُوری کہیں رہ گئی ہے

لباسِ تعلق ہے جس دل نے پہنا
تو اُس دل کی دنیا بدلتی گئی ہے

یہ سوزِ دَرُوں، جذبۂ شوق کیا ہے؟
کہ ہر فاصلے میں کمی آ گئی ہے

کبھی بارشیں ہیں، کبھی آندھیاں ہیں
مگر شمعِ اُلفت جلے جا رہی ہے

بدلنے لگی حُسنِ فطرت کی رنگت
شفق جاتے جاتے ٹھہر سی گئی ہے

شہیدوں کا پھر ذکر شاید ہُوا ہے
کہ خوشبو فضا میں بکھر سی گئی ہے

صد شکر کہ وہ آسماں والا سُنتا ہے

سارہ نزائین

تمہیں کیسے بتاؤں زندگی کیسے گزرتی ہے
تمہیں کیسے بتاؤں دل کی دھڑکن کیسے تھمتی ہے

لڑائی ہے ہمارے درمیاں! یہ جب کبھی سوچوں
یوں لگتا ہے کہ جیسے سانس سینے میں اٹکتی ہے

مگر تم میرے دل کی بے قراری سے نہیں واقف
مگر تم میرے دل کی سوگواری سے نہیں واقف

مگر صد شُکر کہ وہ آسماں والا تو سنتا ہے!
میرے خوابوں سے واقف، میری دھڑکن کو بھی سنتا ہے

وہی جو میرے دل کی بے قراری سے بھی واقف ہے
وہی جو میرے دل کی سوگواری سے بھی واقف ہے

اُف اللہ! کتنی خوش قسمت ہو تم

سیّدہ زہرہ

''سُنو!
تم کتنی خوش قسمت ہو
یہ دیکھو لکیر اپنی
تمہارے ہاتھ میں شہرت بھی ہے، قسمت بھی، دولت بھی
اُف اللہ! کتنی خوش قسمت ہو تم، سب کچھ تمہارا ہے!''
میرے ہاتھوں کو تھامے میری سکھیاں جب یہ کہتی ہیں
تو مَیں دل میں بہت ہنستی ہُوں
اور حیران ہوتی ہُوں
بھلا دولت یا شہرت میرے کیا کیا کام آئے گی؟
سکُوں مِل جائے، تو شاید یہ قسمت راس آئے گی
زمانے بھر کی دولت در پہ میرے سر جُھکائے گی!

---

۰ سہیلیاں

نوسٹلجیا

تم سے رُوٹھے اُس سے رُوٹھے
اِس کو منایا اُس کو ہنسایا
کیسے کیسے خوشیوں کے ہم گیت سنایا کرتے تھے
ذرا ذرا سی باتوں پہ اشعار سنایا کرتے تھے
ہر موسم تھا دل کا موسم، ساری اچھی باتیں تھیں
چھوٹی عمر کی پیاری باتیں کیسی اچھی باتیں تھیں
خواب، ادھورے سپنے اور بے نام سی یادیں ہوتی تھیں
درد انوکھے، گیت انوکھے اور پُر کیف سے لمحے سارے
کتنے انوکھے ہوتے تھے
من کے مندر میں کچھ رکھنا
کھویا کھویا سا پھر رہنا
تھکے تھکے سے موسم اور بے چین سی آنکھیں ہوتی تھیں
چھوٹی عمر کی پیاری باتیں کیسی اچھی ہوتی تھیں
اِک اِک لمحے کا وہ گننا
دیر تلک وہ محو سا رہنا
نیند سے خالی آنکھوں میں کچھ سوچ سے اپنی عکس بنانا
عکس کا کوئی نقش بنانا
سوچنا، چُپ ہو جانا اور کچھ کھوئے رہنا اچھا تھا
نئے سال پہ، عید پہ
وہ کچھ کارڈ خرید کے
اپنے کچھ احباب کے نام وہ گیت بھی لکھنا اچھا تھا

اور ہر پَل وہ دھڑکتے دل کی دھڑکن کتنی اچھی تھی
چھوٹی عمر کی سچّی باتیں کتنی اچھی باتیں تھیں
لیکن اب من کے مندر میں
کتنے لوگ ہیں گرچہ رہتے
کتنے خواب اور کتنے سپنے، نیند میں پورے ہوتے ہیں
کتنے گیت اور کتنے لمحے، دل میں اپنے ہوتے ہیں
لیکن اب اِدراک نے، فہم نے ایسا ہے بے حال کیا
ملی شعور کی دولت جب سے، جذبوں کو پامال کیا
ہم نے خود اپنے ہی ہاتھوں دل کو ہے برباد کیا
وہ بھی کیسی عمر تھی جب
کچھ عقل نہ تھی، اِدراک نہ تھا
پھر بھی خوش رہتے تھے، اپنے پاس سکُوں کی دولت تھی
خوشیاں تھیں، بے فکری تھی اور جانے کتنی باتیں تھیں
لیکن اب بے بس ہیں کتنے، کتنے ہم مجبور ہوئے
تم نے دیکھا کیسے کیسے لوگوں کو ناراض کیا
تم نے دیکھا، کیسے کیسے سپنوں کو تاراج کیا
آنکھ میں کتنے سپنے بھیگے
کیسے کیسے اب ہر بات پہ، آنکھیں نم ہو جاتی ہیں
غم سے بوجھل دل رہتا ہے، پلکیں نم ہو جاتی ہیں
دل کی سب اور ساری باتیں، کتنی پیاری باتیں ہیں
چھوٹی عمر کی ساری باتیں کتنی پیاری باتیں تھیں!

موتی مالا

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے مِرے عرقِ اِنفِعال کے

— اقبالؒ

انتخاب

یہ نسٹیئن کا مستقل سلسلہ ہے۔ کوئی پُر تاثیر تحریر آپ کی نظر سے گزرے، تو اس کے معنی خیز حصے کتاب، جریدے، مضمون اور مضمون نگار کے نام کے ساتھ ہمیں بھجوایئے۔ آپ کے حوالے کے ساتھ شائع ہوں گے

یہ 1942ء کا واقعہ ہے۔ مَیں میر جعفر خان جمالی مرحوم کی رفاقت میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں شریک ہونے کے لئے الہ آباد جا رہا تھا۔ بلوچستانی حضرات نے انٹر کلاس کی ایک پوری بوگی کو چھوٹا سا پاکستان بنا رکھا تھا۔ ایک صاحب جن کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی، ایک سٹیشن سے اس ڈبے میں سوار ہوئے۔ اپنے لباس اور قد و قامت کے باعث وہ ان لوگوں میں سے تھے، جو دیکھنے والے پر ایک دائمی تاثر چھوڑ جاتے ہیں۔ انہوں نے اندر داخل ہوتے ہی السلام علیکم کہا اور ہم سب نے اُٹھ کر باری باری ان سے مصافحہ کیا۔ انہوں نے بیٹھتے ہوئے کہا: ''مجھے معلوم تھا کہ ہمارے بلوچستان بھائی اس گاڑی میں سفر کر رہے ہیں۔ آپ مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لئے الہ آباد جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ آپ بیدار ہو گئے ہیں۔ انشاء اللہ اب کوئی طاقت پاکستان کے راستے میں حائل نہیں ہو سکے گی۔''

وہ گزشتہ کانگرس حکومت کے مظالم بیان کر رہے تھے اور ہمیں یہ سمجھا رہے تھے کہ اگر ہم پاکستان بنانے میں ناکام رہے تو ہمارا انجام کیا ہوگا۔ قیامِ پاکستان کے لئے ان کا جوش و خروش دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی، تاہم میں نے اپنی ذاتی معلومات میں اضافہ کرنے کی نیّت سے پوچھا: ''مسلم اکثریت کے صوبوں کے متعلق تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قیامِ پاکستان کی صورت میں وہ ہندو غلبہ سے آزاد ہو جائیں گے۔ ان کا اپنا ملک اور اپنی حکومت ہوگی، لیکن آپ یہ اندیشہ محسوس نہیں کرتے کہ آپ یعنی وہ مسلمان جن کے علاقے پاکستان میں نہیں آئیں گے، بھارت ہی کا حصہ رہیں گے، ان کے آلام و مصائب شاید زیادہ ہو جائیں۔'' انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا اور کہا: ''کیوں صاحب! آپ ہمیں مسلمان نہیں سمجھتے؟'' میں نے جواب دیا: ''الحمد للہ! آپ ہم سے بہتر مسلمان ہیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اب جبکہ پنجاب، سندھ، بلوچستان اور مشرقی بنگال میں ہمارے بھائی اونگھ رہے ہیں، آپ پوری طرح بیدار ہو چکے ہیں۔'' انہوں نے کہا: ''بھائی! اس میں آپ کا قصور نہیں، آپ بنیا شاہی کے خطرات سے غافل ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو معلوم نہیں کہ اس ملک میں بنیئے کا اقتدار کتنا خوفناک ہو سکتا ہے۔ یہ بنیئے کی فطرت ہے کہ وہ کمزور کا گلا دباتا اور طاقتور کے پاؤں پکڑتا ہے۔ ہم اگر پاکستان کے لئے زیادہ مضطرب ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ہندو کی فطرت سے زیادہ واقف ہیں۔ کیا آپ کو میری شکل و صورت یا میرے لباس سے کوئی کراہت محسوس ہوتی ہے؟ مَیں ہر روز غسل کرتا ہوں اور الحمد للہ اکثر باوضو رہتا ہوں، لیکن جب مَیں کسی ہندو حلوائی کی دکان پر جاتا ہُوں جس کی نصف توند میلی کچیلی قمیض سے باہر ہوتی ہے اور جو ہاتھ پونچھنے کے لئے اپنی غلیظ دھوتی سے تولئے کا کام بھی لیتا ہے، وہ دکان سے چند قدم دُور ایک ٹوٹی چوکی یا لوہے کی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ پیسے وہاں رکھ دو، اس لئے کہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ سے چُھو جانے کے باعث وہ بھرشٹ یعنی ناپاک نہ ہو جائے۔ پھر وہ مٹھائی خشک پتوں یا کاغذ میں لپیٹ کر میری

طرف پھینکتا ہے۔ اگر مَیں دبوچ لوں تو میری خوش قسمتی‘ ورنہ مجھے زمین سے اٹھانا پڑے گی۔ پھر جب اپنی اس تذلیل کے بعد میں یہ دیکھتا ہوں کہ پاس ہی اس حلوائی کا کتا دودھ والی کڑاہی چاٹ رہا ہے تو میرے جذبات کیا ہوتے ہوں گے؟ اگر آپ میں سے کوئی میری جگہ ہوتو کیا وہ یہ نہیں سوچے گا کہ اس ملک کا کوئی حصہ تو ایسا بھی ہونا چاہئے جہاں ہمارے بھائی آزاد اور خودمختار ہوں‘ لیکن میری باتوں سے آپ کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ ہم ایک انتقامی جذبے کی تسکین کیلئے ہی قیامِ پاکستان کی جنگ میں شامل ہیں۔ جب ہم پر آلام ومصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے تو اسلام کے اس گہوارۂ پاکستان سے کوئی دوسرا محمد بن قاسمؒ نمودار ہو گا۔ کوئی غزنویؒ‘ ابدالیؒ اُٹھے گا اور ظلم کے پرچم سرنگوں ہو جائیں گے۔ ہم غازیانِ اسلام کی راہ دیکھا کریں گے اور جب ہم نہیں ہوں گے تو ہمارے بیٹے بیٹیاں اور پھر اُن کے بیٹے بیٹیاں ان کی راہ دیکھا کریں گی۔ زندگی کی تاریک راتوں میں پاکستان روشنی کا مینار ہوگا۔‘‘ میرے ساتھی سکتے کی حالت میں ان کی طرف دیکھ رہے تھے اور میں نے اپنے آنسو چھپانے کے لئے کھڑکی سے منہ نکال لیا۔ انہوں نے کہا: ’’بھائیو! آپ خاموش کیوں ہوگئے؟ خدا کی قسم جب تم پاکستان کو اسلام کا وطن بنا لو گے‘ تب ہمیں یہ اطمینان ہو گا کہ ہمارے پیچھے ایک آہنی دیوار موجود ہے اور جب ہم دیکھیں گے کہ پاکستان ان جوانوں کی تربیت گاہ ہے جو اسلام کی غیرت کے امین ہیں‘ تو ہم تم سے کوئی مدد نہیں مانگیں گے‘ بلکہ ہم تنہا ہندو کی اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکیں گے اور ہندو ہمارے ساتھ کبھی زیادتی کی جرأت نہیں کرے گا۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ پاکستان ہمارے لئے ایک جذباتی مسئلہ نہیں‘ بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آنے والے دَور میں صرف پاکستان کی مضبوط اسلامی ریاست ہی ہماری بقاء کی بہترین ضمانت ہوگی۔‘‘

یہ ان صاحب سے میری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ الہ آباد پہنچنے کے بعد ہم جلسوں کی بھیڑ میں گم ہوکر رہ گئے تھے۔

دوسرا واقعہ: 1960ء میں احمد آباد میں بڑی بے دردی سے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا گیا۔ مسلمانوں کے ایک گھر کے تمام افراد شہید کر دیئے گئے۔ ایک مکان کمسن بچوں سمیت جلا دیا گیا۔ ایک عورت جو کسی طرح بچ گئی تھی‘ اپنے بال نوچتی‘ یہ دُہائی دیتی ہوئی باہر نکلی: ’’ہائے! کوئی پاکستان کو خبر کر دے‘‘۔ مَیں اکثر یہ سوچتا ہوں کہ یہ خاتون جو پاکستان کی طرف سے اپنی چیخوں کے جواب میں کسی محمد بن قاسمؒ یا کسی محمود غزنویؒ کا پیغام نہ سن سکی‘ اس معزز آدمی کی بہن‘ بیٹی یا بہو بھی ہوسکتی تھی جو الہ آباد کے راستے کی چند منازل میں میرا ہم سفر تھا۔ اب وہ شخص جس کی تصویر پاکستان کی جدّ وجُہد کے ایام میں ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتی تھی‘ اگر اس جہانِ فانی سے رخصت نہیں ہو چکا‘ میں اسے بہت یاد کرتا ہوں۔ میرے نزدیک اس کی داستان صرف ایک فرد کی داستان نہیں‘ ہندوستان کے طول وعرض میں اب لاکھوں ایسے ہوں گے جو بڑھاپے کے آخری ایّام میں وہ دن یاد کرتے ہوں گے جب وہ پاکستان کے قیام کے لئے جان کی بازی لگانے کے لئے تیار رہتے تھے۔ جنہوں نے کئی شہروں میں مسلمانوں کو قتل ہوتے اور ان کے گھروں کو جلتے دیکھا۔ اگر ہمارے یہ بھائی اور بزرگ کسی اجتماع میں اب ہم سے مخاطب ہوسکیں تو ان کا اوّلیں سوال یہ ہوگا کہ تم نے پاکستان کو ایک اسلامی مملکت بنانے کی جو ذمہ داری قبول کی تھی‘ وہ کس قدر پوری ہوئی؟

—— دو واقعات: نسیم حجازیؒ [مرسلہ: فرح ناز IGIS]

نظریۂ پاکستان

مسلمانوں نے ہندوستان پر تقریباً ساڑھے سات سو سال جم کر حکومت کی۔ اس کے بعد سَو برس انہیں اس سلطنت کے مختلف علاقے کھو دینے میں لگے

یہاں تک کہ حکومت سمٹ کر شاہی قلعے تک محدود ہوگئی۔ انگریزوں نے بادشاہ کو جلاوطن کر دیا۔ 1857ء کے بعد 90 برس تک انگریز نے اپنی مرضی سے خوب حکومت کی۔ جب انگریز کی رخصتی کا وقت آیا تو کاروبارِ سلطنت کا مسئلہ پیچیدہ ہو چکا تھا۔ بیسویں صدی میں ہندوستان کے لئے طرزِ حکومت کے انتخاب کا ایک بالکل نیا اور اہم تاریخی مرحلہ تھا۔ بادشاہت سے جمہوریت تک کے سفر کے لئے جو وقت درکار تھا' وہ برِصغیر کو میسر نہ آیا۔ جب ترقی یافتہ ملک اس سفر کی منزلیں طے کر رہے تھے' یہ برِصغیر انگریزوں کی غلامی سے دوچار ہوگیا۔ آزادی کی جِدوجُہد جب کامیابی کے نزدیک پہنچی تو پتہ چلا کہ اس کی دو شکلیں ہیں۔ یہ بات اُن دنوں شاید کم لوگ جانتے تھے کہ آزادی کی جو شکل انگریزوں کی حکومت کے ختم ہونے پر متعیّن ہوگی' وہ صدیوں تک اس برِصغیر کی تاریخ پر اثر انداز رہے گی۔ مسلمانوں کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ سیاسیات کی فکرِ جدید اور نظامِ حکومت کی طرزِ جدید کے مطابق اپنی منزل کا انتخاب کریں۔ جمہوریت کی نئی اور مسلّمہ حقیقت کا گہرا اور دُوررس جائزہ ضروری ہوگیا۔ جدیّدیت کا تقاضا تھا کہ ہم بظاہر وسیع القلبی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے ایک اقلیت بنا کر دوسرے درجے کے شہری بن جائیں۔ اس صورت کو نافذ اور مستقل کرنے کے لئے انگریز اور ہندو نے بڑی عالمانہ اور عیارانہ کوششیں کیں۔ اس کے لئے ایک طرف اتحاد' وطن اور اخوت کے گیت سنائے گئے اور دوسری جانب پاکستان کی غیر یقینی صورت اور یقینی غربت سے ڈرایا گیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اگست 1947ء میں اس برِصغیر کی حکومت میں مسلمانوں کو کیا حصہ ملے گا؟ مگر اس فیصلے پر ایک بہت طویل مستقبل کا انحصار تھا۔ مسلمانوں کی قیادت نے فیصلہ کیا کہ وہ حکومت میں حصہ نہیں لیں گے' بلکہ برِصغیر میں اپنا حصہ مانگیں گے۔ جس نے یہ مطالبہ سُنا' اُسے حیرت ہوئی بیشتر کو مسلمان اقلیت کی اس جرأت پر اور کچھ لوگوں کو مسلم قیادت کی اس فراست پر!

اسی فیصلے کو نظریۂ پاکستان کہتے ہیں۔ نظریۂ پاکستان کو چند لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جب برِصغیر میں پہلا شخص مسلمان ہُوا' اُس روز پاکستان وجود میں آ گیا تھا اور جب تک اس سرزمین پر ایک مسلمان بھی موجود ہے' انشاءاللہ تعالیٰ پاکستان قائم رہے گا۔ نظریۂ پاکستان اور مملکتِ پاکستان دو مربوط مگر مختلف حقیقتیں ہیں۔ جو لوگ ان میں فرق نہیں کرتے' وہ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد کہنے لگے کہ ایک خطۂ زمین کے ہاتھ سے نکل جانے کے ساتھ یہ نظریہ بھی ختم ہوگیا ہے۔ یہ لوگ علامہ اقبالؒ' قائداعظمؒ اور ان کے نظریے کو نہیں سمجھے۔ نظریے کی جگہ دل میں ہے اور مملکت کی جگہ نقشے پر۔ سرحدیں مختلف ادوار میں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں' مگر یہ نظریہ تو ایک بنیاد ہے جو ہمیشہ کے لئے بھری جا چکی ہے۔ اس پر آنے والے لوگ حسبِ توفیق عمارتیں بناتے رہیں گے۔ کبھی چھوٹی' کبھی بڑی' کبھی بہت بڑی۔ یہی وجہ ہے کہ جب پاکستان نصف ہوگیا' تو اس نظریئے کی اہمیت دوچند ہوگئی۔

—— میرِ کارواں: مختار مسعود [مرسلہ: عمران بنگش AM College]

چار عناصر

مکّہ مکرّمہ میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کی سیرت کی تشکیل کے لئے جو چار عناصر اختیار فرمائے' مدینہ منوّرہ میں ان ہی کی بنیادوں کو اسلامی مملکت کے قیام کے لئے منتخب فرمایا۔ یہ چار عناصر ہیں:

- ''ضبط'' کے ساتھ ''تنظیم'' کو منسلک فرمایا کہ جماعتی زندگی کیلئے نظم و نسق ایک اہم ضرورت ہے
- ''تحمل'' کے ساتھ ''فراستِ مومن'' کی تلقین فرمائی اور حکمت کے رموز کو آشکار کرنے پر زور دیا

- ''لربک فاصبر'' کے ساتھ آزاد زندگی کے لئے ''جہاد فی سبیل اللہ'' اور ''شجاعت'' کی تلقین فرمائی
- ''استقلال'' کے ساتھ ''قدرت وقوّت'' کے حصول پر زور دیا

اگر ہم غور کریں تو آج بھی کسی چھوٹے سے ادارے کے قیام سے لے کر بڑی سے بڑی مملکت کے قیام تک کے لئے انہی اجزائے باطنی وظاہری کو اپنا کر ہی حصولِ مقاصد میں کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے' بشرطیکہ ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کا خوف اور حُبِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیشِ نظر رہے۔ ہر قدم نیک نیتی واخلاص کے تحت اُٹھے اور مقصد نفس پرستی نہیں' خیر خواہیِ مخلوق ہو۔ یہ ہو جائے تو مسلمان اور خاص کر اسلام کا قلعہ یعنی پاکستان جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کے اجر میں عطا فرمایا' بھلا ہر اندرونی و بیرونی دشمن کی ہر تدبیر کو ناکام بنا کر کیسے نہ آگے بڑھتا جائے۔ یقین رکھئے کہ اسلام خود اپنی صداقت وحقانیت کی دلیل ہے۔ خواہ مسلمان اسے اپنی زندگی میں اپنائیں یا نہ اپنائیں' ایک وقت آئے گا اور انشا اللہ تعالیٰ ضرور آئے گا کہ اسلام کی حقانیت اور مسلمانوں کی سربلندی پورے عالَم پر روشن ہو کر رہے گی اور یہ وہ فیضانِ نورِ نبوتؐ ہوگا' فرشتے بھی جس کے منتظر ہیں۔

—— نورِ مُبیں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ڈاکٹر سیّد حامد حسن بلگرامی [مرسلہ: سارہ جتوئی MCS]

تین وارداتیں

برٹش انڈین آرمی میں مسلمان کثیر تعداد میں تھے۔ ریٹائرڈ فوجیوں کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ یہ لوگ مسلمانوں کو فوجی تربیت دے کر برِصغیر میں معرکۂ آزادی کو کامیابی سے ہمکنار کر سکتے تھے۔ 46-1945 کے انتخابات میں لاتعداد مسلمان فوجیوں نے چھٹیاں لے کر اپنے اپنے علاقوں میں شب و روز مسلم لیگ' دوسرے لفظوں میں قیامِ پاکستان کے لئے کام کیا۔ انڈین آرمی کے مسلمان افسر اور سپاہی مطالبۂ پاکستان کی منظوری کے رسمی اعلان سے کہیں پہلے خود کو پاکستانی فوجی قرار دینے لگے۔ وہ کھلم کھلا قائدِ اعظمؒ اور دیگر مسلمان رہنماؤں سے ملاقات کرتے اور ''ہمارے لئے کیا حکم ہے'' کا جواب مانگتے۔ یونٹوں اور بیرکوں میں مسلمان اور ہندو فوجیوں میں منافرت پھیلنے لگی۔ وہ ایک دوسرے کو اپنا دشمن قرار دیتے۔ ہندو نواز وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کے الفاظ میں ''انگریز فوجی افسر خود کو مسلمان اور ہندو فوجیوں کے ممکنہ تصادم اور اس کے نتیجے میں خانہ جنگی کے آتش فشاں پر کھڑا محسوس کرتے۔ ہندوستان کی خانہ جنگی اور خلفشار سے فائدہ اٹھانے کے لئے قیامِ امن کے نام پر روس کی ہندوستان میں مداخلت اور بالآخر قبضے کا خدشہ بھی تھا۔ انگریز سول وفوجی افسر اور ان کے اہلِ خانہ جلد از جلد اس خطرے سے دُور ہونا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کے مطالبۂ پاکستان کی قبولیت کے علاوہ ہندوستانی سیات کا ہر راستہ خوفناک خون خرابے کی طرف جا رہا تھا۔'' (فریڈم اَیٹ مڈ نائٹ: صفحہ 210)

متحدہ ہندوستان کی آزادی کے نتیجے میں خانہ جنگی اور اس کے بعد روس کی مداخلت کا خطرہ اپنی جگہ' لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ وہ فیصلہ کُن عنصر جس نے مسلمانانِ برِّصغیر کی منزل -- حصول پاکستان -- کو قریب تر لا کر اُن کی تقدیر بدل دی' وہ مسلمان فوجیوں کی قوت تھی جو برٹش انڈین آرمی میں ظاہر' واضح اور ثابت ہو چکی تھی۔ ہندو قیامِ پاکستان کو ہضم نہ کر سکا۔ مسلمانوں کی عسکری قوت کے عنصر نے اسے بطورِ خاص پریشان کیا۔ نراسی چودھری نے برِصغیر پر مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ حکومت اور قیامِ پاکستان میں مسلمان فوجیوں کے فیصلہ کُن کردار کے حوالے سے اپنی کتاب The Continent of Circe میں صاف صاف کہہ دیا: ''... کسی غیر ہندو قوم کو خواہ وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہو' نظر انداز کر دینا ہمارے لئے تباہ کُن ہوگا۔ کیا خبر کب طاقت پکڑ کر وہ ہم پر حکومت کرنے لگے...''

اپنی کتاب Inside Story of Hinducracy میں اجیت سنگھ ڈھلوں انکشاف کرتے ہیں: ''ڈی پی دھراور پی این ہسکر نے سپین جا کر مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب جمع کئے اوران کے تجزیے کرتے رہے۔ پھر انڈیا آفس لائبریری لندن میں خفیہ سروسز کے کاغذات چھان پھٹک کر پاکستان کی فوجی قوت کومحدود کرنے کی تدابیر سوچیں۔ان کی مرتب کردہ طویل رپورٹ کے مندرجہ ذیل نکات اب بھی بھارت کی ہرحکومت کی سرکاری پالیسی کا حصہ ہیں:

(1) ''حُبِ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسلمانوں کے جسم و جان سے نکال لی جائے۔اس کے لئے پاکستان کی جہاد مخالف قوتوں' خصوصاً مسلمانوں کے آخری نبی (حضرت محمد مصطفیٰؐ) کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے کو ماننے والے گروہ کو مضبوط کیا جائے' آگے بڑھایا جائے اور کام میں لایا جائے۔

(2) پاکستان کے اندر بھارت سے دوستی کی تحریک اور بھارتی ثقافت کو فروغ دینے والے پاکستانیوں کا ایک ایسا ٹولہ تیار کیا جائے جو اثر ورسوخ کا حامل ہو۔ (3) پاکستان کے اندر پاکستانیوں پر مشتمل افواج مخالف لابی قائم اور مستحکم کی جائے جو دفاعِ پاکستان کے لئے مخصوص کیے جانے والے وسائل کے خلاف مسلسل پراپیگنڈہ اور ہنگامہ آرائی کرتی رہے اور اپنی افواج کے خلاف نفرت پھیلا کر افواج کو شہریوں کی محبت سے محروم کر دے۔''

—— فیصلہ کُن لمحے: پروفیسر محمد منّور [مرسلہ: نیّرہ فاروق IESE]

دفاعِ وطن

امورِ مملکت کے اہم ترین عنصر یعنی دفاع کی تیاری سے متعلق دُوررس اقدامات ضروری ہوتے ہیں۔حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بنیادی حقیقت کی روشنی میں ایسے اقدامات کئے کہ یہ اثر جنگ جاری رکھنے کے لئے سودمند ثابت ہو۔آپؐ نے معاشرتی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہ رہنے دیا جو جنگ کے کامیاب طور پر انجام پذیر ہونے میں حائل ہوسکتا تھا۔آپؐ نے اصولی طور پر زندگی کو ایک ہی وحدت اور ایک ہی اصول قرار دیا۔جب زندگی کو ایک ہی وحدت اور ایک ہی اکائی تسلیم کرلیا جائے تو اس کے مختلف پہلو ایک دوسرے سے نہ تو ٹکراتے ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے کے راستے میں حائل ہو کر ملّی زندگی کی رفتار کو کم کرتے ہیں۔ حضور پاکؐ کی ملی تنظیم کا روشن ترین پہلو یہ ہے کہ ملت کا ہر فرد جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ہمہ وقت مستعد و تیار رہتا تھا اور ملک وملت کا انفرادی اور اجتماعی دولت کا آخری تنکہ تک ضروریاتِ جنگ کی فراہمی کے لئے استعمال میں لایا جا سکتا تھا۔ دوسری طرف ملت کے ہر فرد کی زندگی ایسے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی کہ وہ مجلسِ احباب کے پیار بھرے ماحول سے میدانِ جنگ کے فولاد آسا ماحول تک کے لئے پوری طرح تربیت حاصل کر چکا تھا اور ہر فرد کی زندگی کا ہر لمحہ ملک و ملت کی اجتماعی زندگی کو توانا سے توانا تر بنانے کے لئے استعمال ہوتا رہتا تھا۔ جب دولتِ ایمانی کی فراوانی سے پیدا شدہ اوصاف اور تقویٰ کی طاقت کو شامل کیا جائے تو ایسے معاشرے کے خدوخال ذہن میں ابھرتے ہیں جس کی داخلی قوتوں کا مقابلہ بڑی سے بڑی اقوامِ عالَم بھی نہیں کرسکتیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اسلام کے نام پر قائم ہونے والے ملک پاکستان میں جس کی مخالفت میں بھارت صرف اس وجہ سے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے اور لگا تا رہے گا کہ یہ اسلام کے نام پر قائم ہوا ہے' کچھ لوگ دفاع کے شعبے پر اٹھنے والے ناگزیر اخراجات کے خلاف مہم چلانے کا کاروبار جاری رکھے ہوئے ہیں۔وہ دفاع پر اُٹھنے والے اخراجات گلیوں' سڑکوں اور ہسپتالوں کی تعمیر پر خرچ کرنے کی بات کرتے ہیں۔اللہ کے بندو! اگر خدانخواستہ مُلک ہی نہ رہے تو گلیاں' نالیاں کس کام کی اور اس میں کیا شبہ ہے کہ یہ

کاروبار بھارتی سرمائے سے چل رہا ہے!

—— قابلِ غور باتیں: بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) گلزار احمد [مرسلہ: جنید احمد اعوان: MCE]

ہر مسئلے کا حل بشرطیکہ...

آزادی سے پہلے بھی برِصغیر میں صوبے تھے۔ اس وقت بھی ہم مختلف صوبائی زبانیں بولتے تھے' لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے ہمارے دلوں میں وہ جذبہ پیدا کر دیا جس نے مسلم قومیت کا شعور مسلمانوں کے دلوں میں بھر دیا اور ہم سب نے مل کر اسلام کے نام پر ایک نیا ملک قائم کر لیا۔ اس وقت ہم یقیناً ہندوؤں اور انگریزوں کے خلاف نبرد آزما تھے۔ اس جذبے اور شعور نے ہماری صفوں میں اتحاد و یکجہتی پختہ کرنے میں بھی مدد دی۔ اب ہمیں اس سے بھی بڑا چیلنج درپیش ہے۔ ہم نے اگرچہ پاکستان حاصل کر لیا ہے' لیکن ہم پاکستان دشمن قوتوں کے خلاف بھی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہم اپنے دفاع سے غافل نہیں رہ سکتے۔ ہمارا ازلی دشمن بھارت موجود ہے اور پہلے سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔ صرف پاکستان ہی ہندوؤں کا ہدف نہیں' وہ مسلمان بھی ان کے غضب کا نشانہ ہیں جو ابھی تک بھارت میں رہتے ہیں۔ ان کی تو مسجدیں بھی بے حرمتی سے محفوظ نہیں۔ پھر ہمارے بین الاقوامی دشمن بھی ہیں جو کل تک کے برطانیہ سے بھی طاقتور ہیں۔ دنیا جس قدر سمٹ کر ایک عالمی گاؤں بنتی جا رہی ہے' اسلامی دنیا کے خطرات میں بھی اسی تناسب سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اگرچہ اکثر مسلم ممالک مغرب کی ثقافت' سیاست اور رسم و رواج کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں' اس کے باوجود بھی یورپ کو اسلام سے خطرہ ہے۔ اگر پاکستان کے ایٹمی دھماکے پوری اسلامی دنیا کو ہیجان خیزی کی لہر سے ہم کنار کر سکتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کو عالمِ اسلام کی تقدیر کے تعین میں فیصلہ کُن کردار سرانجام دینے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ صوبائیت' علاقائیت اور لسانیت کی تنگ نظری اور تعصب کو اپنا کر عالمِ اسلام کی تقدیر کے تعین کا فیصلہ کُن کردار ادا کرنا تو کجا' کیا ہم خود آزاد و خودمختار رہ سکتے ہیں؟ ہمیں تعصّبات کو رد کر کے اپنی نظریں افق پر ابھرتے ہوئے نئے مواقع پر گاڑ دینی چاہئیں۔ یہ بصیرت اور بالغ نظری بشرطیکہ اس کی صحیح طور پر آبیاری کی جائے' اہلِ پاکستان کو اس قابل بنا سکتی ہے کہ وہ انشاءاللہ تعالیٰ ہر پابندی اور ہر قسم کی رکاوٹوں کو عبور کر جائے گی۔ —— ہمارے مسائل: زیڈ اے سلیری [مرسلہ: فاطمہ ریاض ASAB]

یہ بھارتی پاکستانی!

کئی بھارتی پاکستانیوں کو بھارت اور پاکستان کے درمیان موجود رابطے کے راستے بہت محدود دکھائی دیتے ہیں۔ وہ دونوں ملکوں کی ہزار میل سے زائد سرحد پر کئی واہگے کھولنا چاہتے ہیں۔ ہمارے بعض لیڈروں کے لئے یہ سرحد بھارتیوں کے بقول ایک لکیر ہے اور بس۔ اس ماحول میں یہی بات دہراتا ہوں کہ میں کہاں رہتا ہوں' بھارت میں یا پاکستان میں؟ بھارت اور پاکستان دشمنیاں لے کر پیدا ہوئے مثلاً کشمیر کا تنازعہ اور اب بھارت نے اس پر آبی جارحیت کے ذریعہ مزید تنازعے کھڑے کر دیئے ہیں اور ہر روز اس آبی جارحیت کی کوئی نئی مثال سامنے آ جاتی ہے مگر ہم اس کو زیادہ محسوس نہیں کرتے کہ ہم اس وقت بھارتی فلموں کی رنگینیوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ہم مصروف ہی رہیں گے تا آنکہ (خدانخواستہ) دشمن ہماری معیشت کی رگیں بند کر دے گا۔ سخت تعجب ہے کہ ہمارے ذمہ داران بھارت کی کسی خفیہ یا کھلی جارحیت کو محسوس ہی نہیں کرتے۔ جب سے امریکہ بھارت کے ساتھ کھل کر کھڑا ہوا ہے اور ہمارے ذمہ داران پر اچھی طرح واضح ہو گیا ہے کہ امریکہ بھارت کو ہم پر ترجیح دیتا ہے تو ہم بھی بھارت کو پاکستان پر ترجیح دینے لگے ہیں۔ اس کی

ہر زیادتی پر چپ رہتے ہیں' خواہ یہ زندگی وموت کا مسئلہ ہی کیوں نہ ہو۔ ہندو کی مسلم دشمنی تاریخ کا حصہ ہے اور اگر ہمارے دلوں میں حضرت قائدِاعظمؒ کی کوئی عزت باقی رہ گئی ہے تو ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہر کوشش کے باوجود قائدِ اعظمؒ ہندو قوم سے معمول کے تعلقات رکھنے میں بھی کامیاب نہ ہو سکے' صرف دشمنی باقی رہ گئی۔ قیامِ پاکستان سے پہلے کی تاریخ اگرچہ بہت واضح ہے لیکن قیامِ پاکستان کے بعد کی تاریخ چھپی ہوئی نہیں ہے۔ پاکستان پر کھلا حملہ کر کے اسے دولخت کرنے میں بھارت کا حصہ بہت واضح ہے۔ بھارت نے اب تک پاکستان دشمنی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اب پاکستان کے لئے بھارت کے ساتھ دوستی کی کوشش ایک ناقابلِ فہم حرکت ہے' لیکن بھارت کے اس پاکستان دشمن روّیے کے باوجود ہم اس کی فلموں اور مجروں پر مرے جا رہے ہیں۔ کیا ہم کوئی تماشائی قوم ہیں۔ ہمارے ذمہ داران کی بات تو چھوڑیئے' لگتا ہے کئی پاکستانی بھی بھارت سے مرعوب ہو چکے ہیں۔ یہ بھارتی پاکستانی جب بھارت کے ساتھ محبت کی پینگیں جھولتے ہیں تو وہ بھارتی فضاؤں میں لہراتی ہیں لیکن افسوس کہ ہم اس کو برداشت کرتے ہیں۔ کیا ایسا تو نہیں کہ اب یہی پاکستانی زندگی کا چلن بن چکا ہے اور ہمیں اسی انداز میں زندگی بسر کرنی ہے؟ مگر نہیں' الحمدللہ سوائے چند اوپر کے لوگوں کے ایک عام پاکستانی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا' اس میں غیرت کی رمق باقی ہے۔

ـــــ غیر سیاسی باتیں: عبدالقادر حسن [مرسلہ: اقصیٰ خورشید ASAB]

نقاب پوش ''دانشور''

قائدِاعظمؒ' جی ہاں! وہ قائدِ اعظمؒ جن کا نام محمد علی جناح تھا۔ وہ محمد علی جناح جنہیں قائدِ اعظمؒ کہہ کر پکارا گیا اور پھر یہ اُن کے نام کا حصہ بن گیا۔ حصہ کیا' نام بن گیا۔ آج بھی اُنہیں محمد علی جناح' جناح یا جناح صاحب کہہ کر پکارا جائے تو اہلِ دل کو پسند نہیں آتا' گوارا نہیں ہوتا اور قبول نہیں ہوتا۔ پاکستان کے کروڑوں عوام اُنہیں قائدِ اعظمؒ کہتے' قائدِ اعظمؒ کے طور پر یاد رکھتے اور قائدِ اعظمؒ سمجھتے ہیں۔ سب سے بڑا قائدِ — پاکستان کیا' جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا بھی سب سے بڑا قائد! بھارت میں سانس لینے والے بہت سے اور بھی اُن کو دل میں چھپا کر رکھتے ہیں اور بنگلہ دیش کی کشتی میں بیٹھنے والے بھی اُن کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پاکستان نہ بنتا تو بنگلہ دیش کیسے بن سکتا تھا؟ مسلم قومیّت اپنے آپ کو نہ منواتی تو ڈھاکہ کلکتہ میں مدغم ہو کر رہ جاتا۔ بنگلہ دیش کے باسی بنگالی کہہ کر نہیں' بنگلہ دیشی کہہ کر تعارف کراتے اور اپنی الگ دنیا کا پتہ بتلاتے ہیں۔

قائدِاعظم محمد علی جناحؒ کو اِس دنیا سے رخصت ہُوئے 64 برس بیت گئے۔ بھارت میں اُن کا کوئی دن نہیں منایا جاتا اور بنگلہ دیش میں بھی اُن کے نام پر کوئی تعطیل نہیں ہوتی۔ اُن کا سرکاری سطح پر اعتراف نہیں ہوتا' اس کے باوجود وہاں موجود ہیں۔ اُن کی شخصیت توانا ہے اور اپنی طاقت کا احساس دلا رہی ہے۔ مسلم قومیّت کا وہ تصوّر دھندلا نہیں پایا جسے انہوں نے اُجاگر کیا تھا۔ پاکستان میں اُن کے اذکار سے رُوگردانی کرنے والے کم نہیں' اِن میں سے کئی دانشور بھی کہلاتے ہیں۔ قائدؒ کے نظریات کی نفی اِن کا ایمان ہے' لیکن اِنہیں علی الاعلان اِس کی جرأت نہیں ہوتی۔ انہوں نے نقاب اوڑھ لئے ہیں' چھپ کر وار کرتے ہیں۔ قائدؒ کا نام لے لے کر' اُن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اُن کی نفی کرتے ہیں۔ قائدؒ کی مخالفت کے لئے قائدؒ ہی کا نام استعمال کرتے ہیں۔ اُنہوں نے زندگی بھر جن خیالات کا ردّ کیا' جن تصوّرات کا دُھتکارا' اُن کو اُن ہی سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ کُوئے دانش اور کُوئے سیاست کے زندیق ہیں۔ یہ جو بھی رنگ بدل لیں اور جو بھی نقاب پہن لیں' جس بھی حلیے میں سامنے آئیں' پاکستان اِن کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔ ان شا اللہ تعالیٰ اِن کی کوئی کوشش' کوئی

سازش‘ کوئی گھات اور کوئی واردات کامیاب نہیں ہو سکے گی۔

— مجیب الرحمٰن شامی: قومی ڈائجسٹ‘ ستمبر 2011 [مرسلہ: کلثوم عباس SCEE]

کلمۂ حق یا سجدہ ریزی!

ہماری روشن اور منوّر اسلامی تاریخ میں لاتعداد معروف اور غیر معروف اکابرین کا تذکرہ ملتا ہے جنہوں نے اسلامی تعلیمات کے منافی کاموں پر جابر سلاطین کے سامنے مسلسل کلمۂ حق کہا اور جبر‘ دھونس اور تحریص کے ہتھکنڈوں کے سامنے ہتھیار پھینکنے کے بجائے اپنے موقف پر ڈٹے رہے جس کے نتیجے میں انہیں بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور بعض صورتوں میں انہیں جان کا نذرانہ بھی پیش کرنا پڑا۔ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ جس نے طاقتور کے سامنے کلمۂ حق ادا کیا‘ اس نے کلمہ حق کہنے کا حق ادا کر دیا اور سچ یہی ہے کہ ہمارے عظیم اکابرین نے اس ضمن میں کبھی کسی مصلحت سے کام نہیں لیا۔ ہمارے اکابر علماء‘ مُلّا نہیں مجاہد تھے‘ ان پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ ہماری تاریخ ہمیں ''مُلّا'' کی اذان اور ''مجاہد کی اذان'' کا فرق صاف صاف بتاتی ہے۔ ہم جب ماضی میں جھانکتے ہیں تو جہاں اپنے ماضی پر فخر محسوس ہوتا ہے‘ وہاں دل پر اداسی کی کیفیت بھی طاری ہوتی ہے۔ دل پر چھا جانے والی اداسی کا سبب یہ ہے کہ متذکرہ شہسوار میدانِ جنگ میں بیشتر صورتوں میں تنہا یا گنتی کے چند ساتھیوں کے ہمراہ کھڑے نظر آتے ہیں۔ امام حسینؓ کے بے شمار ماننے والے خانوادۂ رسولِ مقبولؐ کو یزیدیوں کے ہاتھوں ذبح ہوتے دیکھتے ہیں اور دیواروں کے ساتھ لپٹ لپٹ کر رونے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اسی طرح زین العابدینؒ کے بیٹے حضرت زیدؓ کے حواری ان کا ساتھ عین وقت پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کے ساتھ صرف ڈھائی سو جاں نثار رہ جاتے ہیں۔ حاکمِ وقت کے اہلکار حضرت زیدؓ کی پیشانی پر تیر چلاتے ہیں اور اسلامی تاریخ کے دامن پر ایک اور خونِ ناحق کا داغ لگ جاتا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کی کمر پر اعلائے کلمۃ الحق کی پاداش میں کوڑے برسائے جاتے ہیں‘ مگر اس کے خلاف کوئی آواز نہیں اُٹھتی۔ امام ابوحنیفہؒ کو جیل میں اذیتیں دی جاتی ہیں اور کوئی گھروں سے باہر نہیں نکلتا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی لاش تین دن تک شہر کے چوک میں لٹکی رہتی ہے اور لوگ اس کے قریب سے آنکھ چُرا کر گزر جاتے ہیں۔ ملوکیت آنکھوں کو بے نور بنا دیتی ہے اور سروں میں سے مغز نکال لیتی ہے۔ اس نظام میں احساسِ زیاں بہت دیر بعد ہوتا ہے۔ کافی عرصے کے بعد حضرت امام حسینؓ اور ان کے خانوادہ کے ساتھ ہونے والے مظالم کے خلاف جاں نثاروں کا ایک گروہ سامنے آتا ہے‘ لیکن

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا؟

اعلائے کلمۃ الحق کے لیے اپنی جان پر کھیل جانے والوں کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ظلم اور نا انصافی کے خلاف ڈٹ جانے والے مر کر بھی زندہ رہتے ہیں اور طاقت کے زور پر حق کی آواز دبانے اور ان کے آلہ کار بننے والے حتیٰ کہ شہر اور اس کے مکین‘ کوفہ اور کوفی‘ رہتی دنیا تک نفرت کی علامت بن جاتے ہیں۔ اتنی صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی اپنے نظریے کے لیے قربانیاں دینے والے لوگ‘ اہلِ نظر کے دلوں اور دماغوں میں زندہ ہیں اور ان سے اسی طرح ہدایت اور روشنی لی جاتی ہے جس طرح وہ ہمارے درمیان زندہ موجود ہیں۔ اس کے برعکس ان مجاہدوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش کرنے والے جابر حکمرانوں کی قبروں کے نشانات بھی موجود نہیں ہیں۔ تاریخ میں ان کا نام گالی بن چکا ہے اور ان کا مقام‘ مقامِ عبرت کے سوا کچھ نہیں! آج بھی یہ سوال وقتاً فوقتاً ہمارے

سامنے آ کھڑا ہوتا ہے کہ ہم نے حق کا ساتھ دینا ہے یا ظلم کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم نے اپنی آئندہ تاریخ کے ابواب سنہری لفظوں سے رقم کروانے ہیں یا اس ضمن میں نامۂ اعمال کی سیاہی سے ہی کام چلایا جائے گا؟

—— عطاء الحق قاسمی [مرسلہ: عمران اکبر اورکزئی]

دو قومی نظریہ

''تم اپنی تاریخ محمد بن قاسم سے کیوں شروع کرتے ہو؟ تمہارے ہیرو محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کیوں ہیں؟ یہ سب اس دھرتی پر لُوٹ مار کرنے آئے تھے' ہماری تہذیب کو تباہ کرنے۔ یہ تغلق' خلجی' لودھی' سُوری اور مغل سب باہر سے آئے ہوئے تھے جن کے ناپاک قدموں سے یہ دھرتی تباہ ہوئی۔ امن کا گہوارہ یہ علاقہ غلام ہو گیا۔ تم سب غلط کہتے ہو کہ یہاں مسلمان رہتے ہیں۔ یہ صدیوں سے بلوچوں' سندھیوں' پنجابیوں اور پٹھانوں کا وطن ہے۔ یہ ہماری دھرتی ماں ہے۔ اس کی تاریخ بہت پرانی ہے' کئی ہزار سال پرانی۔ مہر گڑھ' موئن جوداڑو اور ٹیکسلا کے کھنڈر اس کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ جب پوری دنیا تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی' اس دھرتی پر خوبصورت شہر آباد تھے جن میں اپنے زمانے کی جدید ترین سہولیات میسر تھیں۔ ان تہذیبوں کے کھنڈر بتاتے ہیں کہ وہ کس قدر شاندار اور عظیم تھیں۔ ہم سب دریائے سندھ کی تہذیب کے بیٹے ہیں۔ ہم ان فاتحین اور لٹیروں کی تاریخ کو نہیں مانتے۔''

یہ اور ایسے کئی سوالات اس سرزمینِ پاکستان پر اُس وقت سے پوچھے جا رہے ہیں جس دن سے یہاں کے رہنے والوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ مسلمان راجپوت اور ہندو راجپوت' سکھ جاٹ اور مسلمان جاٹ' بدھ گورکھا اور مسلمان گورکھا الگ الگ ہیں' خواہ ان کی رگوں میں ایک ہی خون دوڑتا ہو' وہ ایک ہی زبان بولتے ہوں' ایک ہی طرح کا لباس پہنتے ہوں اور ایک ہی طرح کے کھانے کھاتے ہوں۔ بس زبان سے ادا کئے گئے چند الفاظ جنہیں کلمۂ طیبّہ کہتے ہیں' چچا زاد' ماموں زاد' خالہ زاد حتیٰ کہ سگے بھائی کو بھی ایک دوسری قوم میں لا بٹھاتے ہیں۔ جس دن سے اس بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم ہوئی اور میرے ملک پر اللہ تعالیٰ کے نام کی تختی لٹکا دی گئی' اس دن سے ایسے سوالات کرنے والے دانشوروں نے ہڑپہ' مہر گڑھ اور موئن جوداڑو کے کھنڈرات تک اپنے شجرہ ہائے نسب پہنچا دیئے۔

مجھے حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ لوگ جو اس دھرتی ماتا سے پانچ ہزار سال پرانا رشتہ استوار کرتے ہیں اور محمد بن قاسم اور غزنوی وغیرہ کو لُٹیرا ثابت کرتے ہیں' ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے آباؤ اجداد کا کوئی تعلق اس دریائے سندھ کی تہذیب سے رہا ہو۔ سب کے سب خواہ راجپوت ہوں' آرائیں ہوں' بلوچ ہوں' سندھی ہوں' جاٹ ہوں' پنجابی ہوں' پشتون ہوں' اس سرزمین پر لُٹیروں کی طرح وارد ہوئے۔ یہاں پر آباد ہڑپہ اور موئن جوداڑو کی تہذیب کو انہوں نے تباہ و برباد کیا' بلکہ یہاں کے پُرامن باشندوں کو اس علاقے سے دھکیل کر جنوبی پہاڑوں کے سلسلے سے بھی پیچھے پھینک دیا اور خود اس دھرتی کے مالک بن گئے اور اس ''دھرتی ماں'' کے بیٹے!!

آئیں ذرا تاریخ کے جھروکے میں جھانک کر دیکھیں کس نے سب سے پہلے سندھ کی تہذیب کو برباد کیا اور اُس نسل سے کون کون ہے جو سندھ' پنجاب' بلوچستان اور خیبر پختونخواہ میں آباد ہے۔ دریائے سندھ کے آغاز یعنی شمالی علاقہ جات سے سمندر تک جو خوبصورت تہذیب یہاں آباد تھی' جس کے آثار بھارت کے گجرات تک جا ملے ہیں' اسے تہس نہس کرنے

کے لئے سب سے پہلے آریائی اقوام وسط ایشیاء سے دندناتی یہاں وارد ہوئیں۔ان کا اپنی دھرتی ماتا یعنی وسط ایشیا سے اتنا ہی مضبوط رشتہ تھا کہ جب اُس نے جانوروں کے لئے گھاس اور انسانوں کے لئے پانی دینا چھوڑ دیا تو وہ اُس ماتا پر لعنت بھیج کر اِس ماتا یعنی سندھ دھرتی کو فتح کرنے آ گئے۔کتنا بودا اور کچا ہوتا ہے یہ زمین اور وطنیّت کا رشتہ۔یہی وہ آریائی اقوام ہیں جن کی نسل سے اس وقت اس سرزمین پر اکثر برادریاں اور قبیلے آباد ہیں۔سب نسل، زبان اور خون کے حوالے سے آریائی اثرات رکھتے ہیں۔یہ آریائی اقوام 517 قبل مسیح میں یہاں آباد ہوئیں اور انہوں نے یہاں کے رہنے والوں یعنی اس دھرتی کے بیٹوں کو مار بھگایا یا شُودر بنا کر ذلت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا۔اُس کے بعد 326 قبل مسیح میں آتش پرست ایرانی آئے، آج ان کی نسلیں بھی یہاں آباد ہیں اور اس دھرتی کی وارث ہیں۔پھر سکندر کی افواج آئیں اور اُن کی اُن پرانے فاتحین سے جنگ ہوئی اور یونانی تہذیب کی گونج سنائی دینے لگی۔اس کے بعد 120 سال تک یہاں موریا حکومت کرتے رہے جو ایرانیوں اور یونانیوں کے اختلاط سے جنم لینے والی قوم تھی۔یہ 185 قبل مسیح تک آباد رہے، ان کی نسلیں بھی یہاں موجود ہیں۔اسی طرح بہت سے ایسے قبائل جو یونانی ہندی میل جول سے بنے تھے، وہ اکٹھے ہوئے۔انہوں نے 405 عیسوی تک یہاں راج کیا اور اپنی نسلیں بھی چھوڑیں۔اس دھرتی پر ایران اور وسطی یورپ سے ہزاروں قبیلے آ کر آباد ہوئے۔

یہ تاریخ بہت طویل ہے اور یہاں پر آباد نسلوں کے شجرہ ہائے نسب اگر نکالے جائیں تو وہ کسی نہ کسی لُٹیرے، فاتح یا بیرونی حملہ آور سے جا ملتے ہیں۔پہلے والے نے کہا یہ میری دھرتی ماں ہے، دوسرے والے نے اُس پر قبضہ کیا اور پھر اسے اپنی ماں بنا کر یہاں آباد ہو گیا۔بلوچ شام کے شہر حلب سے آ کر آباد ہوئے اور یہ کوئی زیادہ دُور کی بات نہیں، آریاؤں سے بعد کی بات ہے، لیکن سب کو اپنا رشتہ مہر گڑھ سے جوڑنا ہے، سیّد ہو، مرزا ہو، افغان ہو، راجپوت ہو، آرائیں ہو، جاٹ یا کوئی اور سب کے سب اس دھرتی پر یا تو فاتحین کی اولاد ہیں یا پھر بہت سے فاتحین کے میل ملاپ سے جنم لینے والی نسلیں۔اس کے باوجود کہتے ہیں کہ محمد بن قاسم ہی لُٹیرا تھا، ہم تو اس دھرتی ماں کے بیٹے ہیں۔

سب کو محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کی جنگیں یاد آتی ہیں۔آریاؤں کا وہ ظلم یاد نہیں کہ یہاں پر آباد نسلوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔سب کو اورنگ زیب کا بھائیوں کو قتل کرنا یاد ہے، لیکن اشوک کے نوّے بھائی قتل کر کے بادشاہ بننا اور کلنگا کی جنگ میں دس لاکھ انسانوں کی لاشوں کے پہاڑ بنانا یاد نہیں۔حیرت کی بات یہ ہے کہ اس علاقے پر قبضہ کوئی چین سے آ کر کرے، وسطی ایشیاء سے، یونان سے یا ایران سے، تو یہ تہذیب کا حصہ ہے اور اگر کوئی کلمہ طیّبہ پڑھتا ہُوا آئے تو لُٹیرا اور بیرونی حملہ آور!!

جس کو اپنی نسل، رنگ اور زبان پر فخر ہو، اُسے بھی اپنے ہیرو منتخب کرنے کا حق ہے۔جس کو اپنے عقیدے پر فخر ہو، اُسے بھی اپنے ہیرو دل میں بسانے کا اختیار، لیکن جو مسلمان آباؤ اجداد کی اولاد ہیں، کلمہ طیّبہ پڑھتے ہیں اور رشتہ اُس تہذیب سے جوڑتے ہیں جس کو اُن کے آباؤ اجداد نے تباہ و برباد کیا تھا، تو حیرت ہوتی ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو کوئی اپنے آپ کو کسی دوسری قوم کا بتائے، وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے (بخاری، کتاب المناقب) اور قوم کی تعریف میرے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کر دی۔ابولہب سگا چچا، بنو ہاشم کا فرد لیکن اُس کا نہ میرے رسولؐ سے کوئی تعلق اور نہ ہی اُس کی اُمت سے۔

—— اپنی بات: اور یا مقبول جان [مرسلہ: سیّدہ اسماء IESE]

گُفتارِ شیریں

مِری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دُکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو

—— اقبالؒ

چُھٹیاں

بشیر سیال

چھٹیاں ایک مرتبہ پھر شروع ہو چکی ہیں۔ بچوں کے لیے اس میں جہاں خوشی کی بات ہے' وہیں افسوس کا پہلو بھی ہے کہ تین ماہ بعد دوبارہ سکول جانا پڑے گا۔ پرائیویٹ سکول چھٹیاں کم کرتے ہیں' حالانکہ ان میں اکثر ایسے ہیں جن کی چھٹی ہو جانی چاہیے۔ چند سال قبل ان سکولوں نے سمر کیمپ کا ڈول ڈالا تھا۔ اب اس ڈول میں مزید مراعاتی پانی ڈال دیا گیا ہے۔ ہمارے شہر کے ایک سکول نے چھٹیوں میں بچوں کو تیراکی سکھانے کا اعلان کیا ہے۔ ہم خود کوئی طریقہ ڈھونڈ رہے ہیں کہ کسی طرح ہمیں بھی داخلہ مل جائے۔ یوں خشکی پر تیراکی سیکھنے والے پہلے چند لوگوں میں ہمارا شمار بھی ہوگا۔ ہماری مصدّقہ اطلاع (ہمارے دوست مصدّق کی اطلاع) کے مطابق اس سکول کے پاس پانی کا جو زیادہ سے زیادہ ذخیرہ ہے' وہ سکول کی چھت پہ واقع وہ ٹینک ہے جس میں پہلے ہی مینڈکوں کے بہت سے بچے تیراکی سیکھ چکے ہیں۔ جب مینڈک کے بچے سیکھ سکتے ہیں تو انسان کے بچے کیوں نہیں سیکھ سکتے۔ ویسے تو ہمارے شہر میں ایک عدد نہر بھی واقع ہے۔ معافی چاہتے ہیں' واقع نہیں ہے' بہتی ہے۔ یہ اُن دنوں بھی بہتی ہے جن دنوں ہمارے دریاؤں میں پانی نہیں ہوتا۔ اس کے بہنے میں ہمارے شہر کی ملوں اور فیکٹریوں کا بڑا ہاتھ اور پانی ہے۔

چھٹیوں میں یہی خرابی ہے کہ ان میں بندہ کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔ خیر! ہم واپس آتے ہیں' بات ہو رہی تھی سکولوں کی۔ یہاں ایک اور سکول نے چھٹیوں میں موسیقی سکھانے کا اعلان کیا ہے۔ میوزک کلاسز ویسے پہلے ہی شروع کر دی تھیں' لیکن ایڈمشن نہیں ہو رہے تھے۔ آخر سکول کے ساتھ والی بلڈنگ کے مالک نے اپنی جیب سے فیس ادا کر کے کئی ایڈمشن کروائے اور مطلوبہ تعداد پوری کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ اعلان بھی کیا ہے کہ اگر پہلے ہی مہینے پڑوسی اور ساتھ والے کرایہ دار بلڈنگ خالی کر گئے تو موسیقی سکھانے والے استاد کو تنخواہ کے ساتھ ساتھ بونس بھی ادا کیا جائے گا۔

چھٹیوں کی اس بہتی گنگا میں سبھی ہاتھ دھونے کے درپے ہیں۔ ایک سکول نے چھٹیوں میں خوشخطی سکھانے کا اعلان کیا ہے۔ ان کا یہ بینر پڑھنے کے بعد' جو کہ ہم نے کافی دیر میں پڑھا اور جس میں اپنی عینک سے زیادہ معلوماتِ عامہ سے کام لیا' ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ واقعی لوگوں کو خوشخطی سکھانے کی بہت ضرورت ہے۔ ہمیں بھی کچھ کلاس فیلوز نے یہ مشورہ ایڈوانس میں دے رکھا ہے' لیکن ہم اتنی آسانی سے ان سے اسائنمنٹ لکھوانے کے حق سے محروم ہونے والے نہیں۔

اگرچہ ہینڈ رائٹنگ سراسر ہمارا ذاتی معاملہ ہے' لیکن جب سے ہمارے دو ایک سراسر ذاتی معاملات منظرِ عام پر آئے ہیں اور یار لوگوں نے جس طرح ان پر اپنا حقِ رائے دہی استعمال کیا ہے (اور ابا جی نے کیا استعمال کیا ہے؟ یہاں بتانا مناسب معلوم نہیں ہوتا) ہمیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا ہر ذاتی معاملہ بلیک پراپرٹی ہے اور اس پر رائے زنی کا حق

ہر فرد کو اسی طرح حاصل ہے جس طرح ہر سکول کو اپنے سامنے موجود سرکاری جگہ پر پارکنگ بنانے یا بچوں کے لیے جھولے لگانے کا حق حاصل ہے۔

چھٹیاں پرائیویٹ کے ساتھ ساتھ سرکاری سکولوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں اور یہاں بھی سرگرمیوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان کے کھیل کے میدان کھچا کھچ بھر جاتے ہیں۔ ہمارے قریبی سکول میں چھٹیوں کے دوران کئی کرکٹ ٹورنامنٹ منعقد ہوتے ہیں جن سے سکول کو اضافی آمدنی ہوتی ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ آمدنی خرچ کہاں ہوتی ہے۔ ہم نے کبھی معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ مبادا سرکاری راز کی چوری کے مرتکب قرار پائیں اور قرار واقعی سزا کے حقدار ٹھہریں۔

اب کے بچے زیادہ خوش اس لیے بھی ہیں کہ چھٹیوں میں کوئی کام کرنے کو نہیں ملا۔ ہمارے سکول کے زمانے میں تو اتنا کام ملا کرتا تھا کہ چھٹیاں ختم ہو جاتی تھیں' کام ختم نہیں ہوتا تھا۔ اس کا حل ابا جی نے یہ نکالا کہ اعلان کر دیا جو بچہ پہلے چھٹیوں کا کام مکمل کرے گا' اس کو انعام دیا جائے گا۔ اس اعلان پر عمل صرف اُسی سال ہو سکا۔ اگلے سال اعلان میں تبدیلی کر دی گئی اور انعام کا حقدار وہ قرار پایا جو کہ تمام چھٹیوں میں چھٹیوں کا کام کرے گا۔ اس طرح ابا جی کو سب بچوں کو انعام دینا پڑا۔

جہاں چھٹیوں کا کام نہ ملنے پر بچے خوش ہیں' وہیں کچھ لوگ اس بات پر ناراض بھی ہیں۔ اس ساری صورتِ حال پر غور کرنے اور آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دینے کے لیے گزشتہ دنوں ٹیوشن سینٹرز کے مالکان اور انجمنِ ردّی فروشاں کا مشترکہ اجلاس ایک پرائیویٹ سکول کے ''ہال'' میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں تعلیمی سال ستمبر کے مہینے میں شروع کرنے کی پُر زور مخالفت کی گئی اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ یہ فیصلہ واپس لیا جائے۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی اعادہ کیا گیا کہ والدین کے ساتھ مل کر حکومتی فیصلے کے خلاف بھرپور ملک گیر احتجاجی تحریک چلائی جائے گی۔ اجلاس میں بعض اراکین کی جانب سے وزیرِ تعلیم سے مستعفی ہونے کا مطالبہ بھی کیا گیا۔

ہم ان لوگوں کی باتوں میں آنے والے نہیں' کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ مُٹھی بھر شر پسند عناصر ملک کی ترقی کے مخالف ہیں۔ روشن خیالی بلکہ ترقی پسندی کا تقاضا تو یہ ہے کہ بچوں کو زیادہ سے زیادہ چھٹیاں دی جائیں۔ ان کا تعلیمی سال مختصر ترین کر دیا جائے۔ اسی لئے تو ان کی آسانی کی خاطر نصاب میں کمی کا فیصلہ کیا گیا تھا اور اس کا عملی مظاہرہ اسلامیات کے نصاب کو مختصر کر کے دیا گیا۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ چند بنیاد پرست' اور بزدل لوگ یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ فیصلے کسی بیرونی دباؤ کے تحت کیے جا رہے ہیں جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ہم اپنے ہر قسم کے فیصلے کرنے میں آزاد ہیں اور تمام تر فیصلے وسیع تر ملکی مفاد میں کرتے ہیں۔ یہ بات باعثِ فخر ہے کہ مفاد وسیع ہو کر وہاں تک پہنچ گیا' جہاں پہنچنے کے لیے بڑے بڑوں کو ہوائی اڈوں پر جوتے بلکہ جرابیں اُتروا کر تلاشی دینا پڑی۔

ہم یہاں یہ واضح کرتے ہیں کہ اس سارے معاملے میں ہم قطعاً غیر جانبدار ہیں اور کسی فریق کے لیے ہمارا کوئی مشورہ نہیں۔ کیونکہ ایک فریق ہمارے مشورے پر عمل نہیں کرتا اور دوسرے فریق کو ہم مشورہ دے نہیں سکتے' لیکن ہم حسبِ سابق اور حسبِ حال (جو بے حال ہے) درخواست کر سکتے ہیں اور دونوں سے کر سکتے ہیں کہ آپ چاہے کسی بھی مفاد کے لیے کام کریں اور وہ مفاد جتنا بھی وسیع ہو' اتنا خیال ضرور رکھیے کہ ایسا نہ ہو آپ آج جن بچوں کے معاملات پر آنکھ رکھنا نہیں چاہئے' کل آپ اُن بچوں سے آنکھ ہی نہ ملا سکیں۔

موبائل کبوتر

اشفاق احمد ورک

انسان جب سے رُوئے زمین پر برسرِ پیکار ہُوا ہے' اپنے احساسات وجذبات دوسروں تک پہنچانے کے لیے بے تاب اور کوشاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغام رسانی کا سلسلہ تب سے رواں دواں ہے جب زبان بھی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ لفظوں سے پہلے یہ شعبہ اشاروں کے بل بوتے پر قائم تھا۔ انسانی ہاتھ اور آنکھیں اس کے سب سے بڑے ترجمان ہُوا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ اشاروں کی زرخیز زمین میں حرفوں کی کونپلیں پھوٹ نکلیں' ان پر لفظوں کے برگ وبار آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے پیغام رسانی نے کاغذی پیرہن زیبِ تن کرلیا۔

تاریخ کا چرخہ اپنی خاص رفتار سے گھومتا رہا۔ یہی روانی انسانی آبادی اور ان کے درمیانی فاصلوں میں اضافہ کرتی چلی گئی۔ انہی فاصلوں کی بنجر دھرتی پر نامہ بر کا وجود اُگ آیا۔ نامہ بری کے شعبے میں تیز رفتاری اور بے ضرری کے سبب انسانوں کی نسبت پرندوں کا حق فائق قرار پایا اور اس اہم پوسٹ پہ پہلی تعیناتی حضرتِ کبوتر کی عمل میں آئی۔ یہ عہدہ ان کو سراسر اُن کی شرافت کی بنا پر تفویض ہوا' وگرنہ اس پوسٹ کے لئے کوّا بھی ایک مضبوط امیدوار تھا لیکن اس کی لگائی بجھائی کی عادت کے سبب اس کا منہ بند کرنے کے لئے اسے اچھے مشاہرے پر محض منڈیر پہ بیٹھ کر مہمانوں کی آمد کی اطلاع دینے کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ جنابِ کبوتر کو اس محکمے میں بھرتی تو عام پیغام رسانی کے لیے کیا گیا تھا' لیکن دل والوں' رومانوی مزاج والوں اور اپنی اہلیہ کے اُکسانے پر جلد ہی جھانسے میں آ گیا اور محبت ناموں کا علَم بردار بن بیٹھا۔ ایک زمانے تک تو یہ سلسلہ جیسے تیسے چلتا رہا۔ اپنے احساسات اپنے پیاروں تک پہنچانے کے لیے کبوتر کی منت سماجت بلکہ خدمت بھی کی جاتی رہی' لیکن ظالم سماج بھلا اس کو کہاں تک برداشت کرتا؟ بالآخر صورتِ حال یہ ہوئی:

خط کبوتر کس طرح لے جائے بامِ یار پر
پر کُترنے کو لگی ہیں قینچیاں دیوار پر

انہی ہنگامی حالات میں یہ ذمہ داری حضرتِ انسان نے سنبھالی اور جلد ہی اپنی فنکاری' اداکاری اور ہوشیاری کی بنا پر اس منظر نامے کا سب سے اہم کردار بن بیٹھا۔ اتنا اہم کہ داغ جیسے شوقین مزاج شاعر کو بھی باقاعدہ اعلان کرنا پڑا کہ:

چاہیے پیغام بَر دونوں طرف
لطف کیا جب دُو بدُو ہونے لگی

ہم دیکھتے ہیں کہ یہ پیغام کہیں تو زبانی بھیجا جا رہا ہے اور کہیں بذریعہ خط اور بعض مقامات پر تو دونوں حربے استعمال میں لائے جا رہے ہیں:

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

یہ زبانی پیغام ہی ہے، جس نے نامہ بر کی اہمیت کو دوچند کر دیا ہے۔ دونوں اصناف کے اہلِ دل اس کے مرہونِ منت ہیں۔ مطلب برآری کی خاطر اس کے سو سو نخرے برداشت کرتے ہیں۔ شاعر ایک بار کرید کرید کر یہ پوچھتے سنائی دیے:

تأمل تو تھا اُن کو آنے میں قاصد!
مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی؟

ادھر قاصد ہے کہ اپنی اہمیت کے پیشِ نظر روز بروز سر پہ چڑھتا جا رہا ہے۔ وہ اصحابِ دل کو ''اُن'' کا حال کم اور اپنے قصے کہانیاں زیادہ سناتا ہے۔ اُس کی اسی چرب زبانی کے پیشِ نظر حلقۂ دل کے پوشیدہ رکن مولانا حالی جیسے شریف ترین بزرگ بھی اُسے ڈانٹ پلانے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

بس! ہو چکا بیاں کسلِ رنج و راہ کا
خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں؟

بعض مقامات پر تو حضرتِ نامہ بر محض چرب زبانی ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ''اُن'' کا غمزہ وعشوہ وادا اور ''اِن'' کی بے چینی اور بے تابی اور اشتیاق دیکھ دیکھ کر بقلم خود حلقہ میں قدم رکھنے سے باز نہیں آتے، بقولِ غالب:

ذکر اُس پری وِش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا

رقیب کا سب سے بڑا مقصد، دونوں کو ایک دوسرے سے بدظن کرنا ہے، وہ رفتہ رفتہ کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ اس کی لگائی بجھائی رنگ دکھانے لگتی ہے اور جنم جنم ساتھ نبھانے، اکٹھے جینے، اکٹھے مرنے اور ہمہ وقت تصورِ جاناں کیے رہنے والوں کے ہاں اس طرح کی سرد مہری سر اُٹھانے لگتی ہے:

انہیں خط لکھا کہ یہ دل مضطرب ہے، جواب اُن کا آیا محبت نہ کرتے
تمہیں دل لگانے کو کس نے کہا تھا، بہل جائے گا دل بہلتے بہلتے

دونوں دل والوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے میں تو یہ ستم ظریف کامران ٹھہرتا ہے، لیکن حلقۂ دل میں ثابت قدم رہنا یا دلبری کے امتحان کے جملہ تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا یقیناً اس کے بس کی بات نہیں۔ وہ چند ہی دنوں میں باؤلا ہو کر جنگلوں کا رخ کرتا ہے اور دل والوں کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا ہے:

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں، لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بَر ملے

آخر کار نامہ بَر کے اسی روّیے، کردار اور بددیانتی کے پیشِ نظر اسے یہ کہہ کر جبری ریٹائرمنٹ بلا ادائیگیِ حقوق ومراعات (Compulsory retirement without benifits) پر بھیج دیا جاتا ہے۔ اس ٹرمینیشن آرڈر کے ساتھ کہ:

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
اُن کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

معلوم تاریخ بتاتی ہے کہ حلقۂ اربابِ دل کو نامہ بروں کی چیرہ دستیوں اور نامہ نویسی کے جھمیلوں سے نجات دلانے کا کارِ خیر انجام دینے کی ذمہ داری بغیر کسی لالچ، فیس یا نذرانے کے گراہم بیل نے لی۔ اُس نے ٹیلی فون ایجاد کر کے ہزاروں میل دُور بیٹھے فریقین یعنی اہلِ دل کو بھی براہِ راست گفتگو اور گلے شکووں کی سہولت فراہم کر دی۔ اگرچہ اس پہ بھی ہمارا شاعر

شا کی نظر آیا اور یہ کہتا دکھائی دیا:

میرے اکلاپے وچ یار وسینس[1] نے واہدے کیتے نیں
ٹیلی فون جدوں دا آیا سُنج بنیرے ہو گئے نیں

ٹیلی فون نے اہلِ دل اور عزیز رشتہ داروں کو آمنے سامنے لا بٹھایا۔ اس سے نامہ بروں کے نخروں اور فرمائشوں سے بھی چھٹکارا ملا۔ شاعر اس بات پہ خوش بھی نظر آیا' بقول آتش:

نامہ بر نہ میّسر ہُوا تو خوب ہُوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی سب نے تسلیم کر لیا کہ محبت کے جذبات' نیک خواہشات نیز دوستی کے احساسات کو جو سلیقہ اور حُسن تحریری لفظوں کے ذریعے عطا کیا جا سکتا ہے' وہ منہ زبانی اظہار میں کسی طرح ممکن نہیں۔ ہاں! یہی جذبات اور نیک خواہشات اگر بغیر کسی درمیانی وسیلے کے اپنے مقام پر پہنچیں' تو لطف دوبالا ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے گراہم بیل کے مقلّدین نے SMS (شارٹ میسج سروس) ایجاد کر ڈالا جس ذریعے پیاروں کے محسوسات نہایت رازدارانہ اور فنکارانہ انداز سے مخاطبین تک پہنچنے لگے۔ لگتا ہے ولی دکنی نے اپنے اس سہ مصرعہ شعر میں کئی سو سال پہلے اسی جدید ایجاد کی طرف اشارہ کیا تھا:

ولی اس گوہرِ کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی
وہ میرے گھر میں یُوں آوے ہے
جیوں سینے میں راز آوے

آج اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہی ہوائی پیغام نہایت سرعت سے ایک جدید اور بے حد کارآمد صنفِ سخن کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ تیز رفتاری کے اس دور میں ادب کی سیدھی تعریف یہ ہے کہ:

''الفاظ کا ایسا باسلیقہ مجموعہ جس سے کم سے کم وقت میں لمبی سے لمبی بات کی یا کہی جا سکے۔''

ظاہر ہے آج کا موبائل میسج اس تعریف پہ عین پورا اُترتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ وقتی تقاضوں کے ساتھ ساتھ جس طرح ناول افسانے میں' سوانح عمری خاکے میں اور طویل نظم ہائیکو اور یک مصرعی نظموں میں ظاہر ہوئی' اسی طرح ادب کی بے شمار اصناف اس مختصر سے موبائل میسج میں سمٹ آئی ہیں۔ آپ اتفاق کریں گے کہ روز بروز ہمارے موبائل فون پہ احباب کی طرف سے موصول ہونی والے اکثر پیغامات میں افسانہ' شاعری اور مزاح کا ذائقہ محسوس ہوتا ہے۔ ہمارے شاعر ادیب بے شک لاکھ بُرا مانیں' اس زود ہضم صنفِ سخن یعنی SMS کا راستہ روکنا ممکن نہیں رہا۔ البتہ اس کے اصل تخلیق کار کا نام معلوم نہ ہونے کی بنا پر اسے زیادہ سے زیادہ لوک صنفِ سخن (Folk literary genre) کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ اس کو اسی موقف کی تائید کے لیے عوام وخواص میں روز بہ روز مقبولیت حاصل ہوئی' اس زُود ہضم صنفِ سخن کے چند نمونے نذرِ قارئین ہیں:

- مزاج کیسے ہیں جناب کے!
  درد کا کیا حال ہے؟ خُون رُکا یا جاری ہے...!
  حاجیوں نے پتھر مار مار کے بُرا حال جو کر رکھا ہے جناب کا؟
- واپس جا کر بھی یاد رکھنے کا شکریہ۔ نہ خون بہنے کی پروا ہے نہ چوٹوں کا درد' دُکھ اس بات کا ہے کہ پتھر

1۔ سائنس

مارنے والوں کی اکثریت کا تعلق میری پارٹی سے ہے'

دیکھا جو سنگ کھا کے جُمرات کی طرف

اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی

- یہ کبھی نہ کہو کہ میری قسمت ہی خراب ہے... اللہ نے آپ کو مومن بنایا اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اُمتی بھی۔ ایک لمحے کے لئے سوچیں کیا آپ کی قسمت خراب ہے؟
- جب ایمان رکھتے ہو کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے' تو یہ کیا سوچنا کہ فلاں فلاں تو میرا دُشمن ہے؟
- جب سو کر اُٹھو تو قبر میں سوال جواب کی ریہرسل کرو... وہاں کلمہ طیبّہ سُنا جائے گا
- ڈرو اُس سے جو تُم سے ڈرتا ہے... میں تُم سے ڈرتا ہوں
- کل رات چار فرشتے آئے اور مجھ سے کسی ذہین' ایماندار' مخلص اور خوبصورت شخصیت کا پتہ پوچھا۔ میں نے تمہارا بتا دیا۔ کیسا اُلّو بنایا ان کو؟
- یہ پیغام اس کو بھیجو جو آپ کی نظر میں دنیا کا سب سے بڑا بیوقوف ہو' میں نے تو بھیج دیا ہے
- اللہ دیکھ رہا ہے!
- جب بارش ہوتی ہے تم یاد آتے ہو' جب کالی گھٹا چھائے تم یاد آتے ہو' جب بدن بھیگ جائے تم یاد آتے ہو۔ یہ تو بتاؤ کب واپس کرو گے میری چھتری؟
- نماز پڑھ لو... اس سے پہلے کہ تمہاری نمازِ جنازہ پڑھی جائے
- ہماری زندگی مکمل ہوجائے اگر ہمارے... چھوٹے چھوٹے... پیارے پیارے... ڈھیر سارے... معصوم سے... ننھے سے... شریر سے SMS ایک دوسرے کو ملتے رہیں
- کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی بہت تکلیف دیتی ہیں' یقین نہیں تو سوئی پر بیٹھ کر دیکھ لیں
- ایم اے کی ڈگری ملنے پر مبارک... وقت نکال کر میٹرک بھی پاس کرلو
- بتاؤ اللہ کہاں ہے؟ سو روپیہ انعام ملے گا... آپ بتایئے اللہ کہاں نہیں؟ ایک ہزار روپیہ دوں گا
- نیند نعمتِ ربِ جلیل ہے... بے شمار فوائد سے لبالب... ایک یہ کہ ہر صبح اُٹھتے ہیں تو نئے ہیئر سٹائل کے ساتھ... پارلر والی کو پیسے دیئے بغیر

اس سلسلے میں آخر میں ایک بار پھر وہی بات کہ موبائل SMS مستقبل قریب میں ہمارے شاعروں ادیبوں کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج بننے والا ہے۔ آنے والے دور میں وہی تخلیق کار ادب کی کسوٹی پر کھرا اُترے گا جو دو چار جملوں میں پُر لطف اور فکر انگیز بات کہنے کا سلیقہ جانتا ہوگا۔ یہ بھی یاد رہے کہ نیا زمانہ ابلاغ اور اختصار کا زمانہ ہے یعنی پہیلیاں بجھوانے یا علامتیں سُجھانے کی بجائے سیدھی اور مختصر بات کرنے کا دَور۔ کیونکہ بقول اسلم کولسری:

اُنہی تک ہی جو بات پہنچی نہ اسلم

تو کس کام کے استعارے تمہارے

یہ میرا آشیاں

امجد اسلام امجد

میاں کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہے۔ کھڑکی سے بازار کا شور آ رہا ہے۔ جس میں کاروں کے ہارن اور رکشوں کے شور کی آوازیں نمایاں ہیں۔ بیوی تنگ آ کر ایک کھڑکی زور سے بند کرتی ہے۔

بیوی: اف توبہ کس قدر بیہودہ محلّہ ہے۔ (بس کا ہارن بجتا ہے) کہاں ہے وہ آپ کا شیش محل جس میں آپ مجھے قلوپطرہ بنا کر رکھنے والے تھے؟

میاں: وہ... وہ... تو

میاں: کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ میں تمہارے لیے کیا کیا کچھ سوچتا ہوں!

بیوی: آپ براہِ کرم سوچنا ملتوی کیجئے اور کوئی ڈھنگ کا مکان ڈھونڈیئے۔ مَیں اب اس کباڑ خانے میں نہیں رہ سکتی۔ غضب خدا کا' دروازہ سیدھا بازار میں کھلتا ہے اور بازار بھی کم بخت میلے کو شرماتا ہے۔ دنیا کی ہر چیز یہاں موجود ہے' خراد کی دکانیں' پچاس برس پرانے موٹر سائیکل' یکدم جوان بنانے کی ورکشاپس' کارپوریشن کا کوڑا خانہ' عوامی لیٹرین' تھڑا ہوٹل' دیگیں' کڑاہیاں اور اللہ جانے کیا کیا مصیبت ہے یہاں!

میاں: (بات کاٹتے ہوئے) خیر اب اتنا مبالغہ بھی نہ کرو' کتنا پُر رونق بازار ہے' گھر بیٹھے طرح طرح کے کھانوں کی خوشبو مفت میں!

بیوی: میلہ مویشیاں سے کم ہجوم ہوتا ہے یہاں آوارہ جانوروں کا۔

(لوہے پر ہتھوڑا مارنے کی آواز آتی ہے)

بیوی: غور سے سنئے' مصرع طرح پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ ساتھ والی ڈھلائی کی دکان سے دیا گیا ہے۔ ابھی سبزی ریڑھیوں والے اپنی اپنی غزلیں لے کر آئیں گے' موٹر سائیکلیں رباعیاں گنگنائیں گی۔ رکشے قطعے پیش کریں گے اور ٹیکسی والے قصیدے پڑھیں گے۔

میاں: اوہو بھئی' تم تو خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا لیتی ہو

بیوی: مجھے آسمان سے تارے توڑ لانے کی ضرورت نہیں' آپ مجھے زمین پر ایک چھوٹا سا' خوبصورت سا' پُر سکون گھر دلا دیجئے جہاں صرف مَیں ہُوں اور آپ۔ بے آواز' پُر فضا' خوشگوار گھر' پیارا گھر۔

میاں: لاؤں گا ضرور لاؤں گا۔

بیوی: کب لائیں گے؟ ہمارے بچے احساسِ کمتری میں مبتلا رہیں گے۔

میاں: ارے بچے ہونے تو دو' آج بلکہ ابھی' مَیں چُھٹی کی درخواست لکھتا ہوں تم کپڑے بدل لو۔ ہم ابھی مکان کی تلاش میں نکلتے ہیں۔

بیوی: تین سو اٹھارہ مکانوں کی فہرست مَیں نے اخباروں کے اشتہاروں سے تیار کر رکھی ہے۔

میاں: گھبراؤ نہیں' کل کا سورج نکلنے سے پہلے ان کی تعداد تین سو سترہ رہ جائے گی... میرا قلم کہاں ہے؟

ایک ٹیکسی تیزی سے مختلف دروازوں پر رُکتی ہے۔ میاں بھاگ کر جاتا ہے' پھر بھاگ کر واپس آ بیٹھتا ہے۔ ٹیکسی پھر چلتی ہے

میاں: (بڑبڑاتے ہوئے) بیس' انیس' اٹھارہ' بس یہیں روک دو۔

ڈرائیور: (بریک لگاتے ہوئے) مل گیا جی؟

میاں: ہاں یہی ہے غالباً... کیوں بیگم؟

بیوی: ہاں اخبار میں تو یہی نمبر تھا' لیکن...

میاں: لیکن کیا؟

بیوی: یہ تو کوئی بہت پرانی عمارت ہے۔

میاں: پھر؟

بیوی: پھر یہ کہ اخبار میں تو کچھ اور ہی لکھا تھا۔

ڈرائیور: آپ بھی کمال کرتی ہیں۔(ہنستا ہے) بی بی جی بھولا بادشاہ ہیں۔

بیوی: کیا مطلب؟

ڈرائیور: بیچنے کے لیے تو چیز کو بڑھا چڑھا کر ہی پیش کیا جاتا ہے۔

بیوی: مگر ہم اسے خریدنے تو نہیں آئے۔

میاں: ہم تو کرائے پر لیں گے اسے۔

ڈرائیور: مجھے تو یہ کوئی اُجاڑ سی جگہ لگتی ہے۔

بیوی: نہیں بھئی۔ دو بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ روم کے علاوہ ایک برآمدہ' ایک سٹور' ایک باورچی خانہ' ایک غسل خانہ مع فلش سسٹم اور ایک... یہ کیا لکھا ہے؟

ڈرائیور: کوئی بھوت بنگلہ لگتا ہے جی!

بیوی: (سرگوشی میں) میرا خیال ہے یہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ یہ تو کچھ آسیب زدہ سی عمارت لگتی ہے۔

میاں: (دروازہ کھولتے ہوئے) اب یہاں تک آ ہی گئے ہیں تو دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ صبح سے اُنیس گھر دیکھ چکے ہیں۔ کتنے پیسے ہوئے بھائی؟

ڈرائیور: چار سو روپے؟

میاں: کیا؟

ڈرائیور: چار سو روپے۔

بیوی: اتنی زیادہ رقم؟

ڈرائیور: ایک بات بتاؤں آپ کو!

میاں: کیا؟

ڈرائیور: اگر آپ اور آگے جاتے نا...

میاں: ہاں' ہاں

ڈرائیور: تو پتا ہے کیا ہوتا؟

میاں: کیا ہوتا؟

ڈرائیور: تو اور زیادہ رقم بنتی۔ آج سی این جی نہیں ہے سر جی!

بیوی: سی این جی اور پٹرول میں کیا فرق رہ گیا؟ بہت شرارتی ہو تم۔

ڈرائیور: بی بی جی' آپ خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہیں۔ تین سو ننانوے روپے دے دیں بس...

میاں: صبح سے جتنے پیسے میں ٹیکسی رکشے والوں کو دے چکا ہوں' اتنے میں ایک مہینے کا کرایہ دیا جا سکتا تھا۔

ڈرائیور: سائیکل کا؟

میاں: کیا؟ (پیسے دیتے ہوئے) یہ لو۔ آؤ بیگم۔

میاں: کوئی گھنٹی ونٹی نظر نہیں آتی۔

بیوی: دستک دے لیجئے۔ ویسے ایک بات ہے' جگہ ہے بہت پُرسکون۔ اللہ کرے اندر سے اچھی ہو۔

(میاں دستک دیتا ہے)

بیوی: علاقہ بھی بڑا معقول ہے۔ خاموش خاموش، تنہا تنہا' چپ چپ گھر۔

میاں: (زور زور سے دستک دیتے ہوئے) کمال ہے!

بیوی: میری ہمیشہ سے خواہش تھی کہ میرے پاس ایسا ہی گھر ہو جس میں بہت سے کمرے ہوں۔ میں... اور وہ میرا مطلب ہے آپ بھی گھر میں پھریں' باتیں کریں' خاموش رہیں۔ دستک دیجئے نا۔

میاں: (زور زور سے دستک دیتا ہے) شاید کوئی آ رہا ہے

عورت: (دروازہ کھولتے ہوئے) کون ہے؟ کیا پاگلوں کی طرح دروازہ

کھٹکھٹاتے جا رہے ہو۔ پتا بھی ہے لکڑی آج کل کتنی مہنگی آ رہی ہے۔

میاں: جی وہ بات دراصل یہ ہے کہ ہم یعنی ہم دونوں... (گھبرا کر خاموش ہو جاتا ہے)

عورت: توبہ توبہ استغفار! کیسا زمانہ آن لگا' اچھی خاصی شکلیں ہیں' اچھے خاصے کپڑے ہیں' مگر کیسی بے حیائی سے بھیک مانگتے پھر رہے ہیں۔

میاں: جی؟

عورت: مَیں سب سمجھتی ہوں تم لوگوں کے چکر' اب بنا لو کوئی کہانی کہ ہم لُٹ گئے' برباد ہو گئے...

میاں: محترمہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟

عورت: ٹھیک کہہ رہی ہوں! بھاگ جاؤ' یہاں سے کچھ نہیں ملے گا۔

بیوی: (غصے سے) کیا مطلب' کیا سمجھتی ہیں آپ ہمیں؟

عورت: ارے دیکھو زبان کیسے چلاتی ہے۔

بیوی: چلئے جی' مجھے تو یہ کوئی پاگل معلوم ہوتی ہے۔ اخبار والے بھی پتا نہیں کیا ہیں' بغیر تفتیش کے اشتہار چھاپ دیتے ہیں۔

عورت: (بڑبڑاتے ہوئے) اخبار! اشتہار!! ارے کہیں تم' کہیں تم لوگ کرایہ دار... میرا مطلب ہے کہ کرایہ دار بننے کے لیے تو نہیں آئے؟

میاں: آئے تو اسی لیے تھے' مگر اب جا رہے ہیں۔ چلو بیگم۔

عورت: ارے بیٹا! سنو تو سہی۔ معاف کرنا بیٹی' مجھے کچھ غلط فہمی ہو گئی۔ آؤ آؤ' اندر آ جاؤ۔ (دروازہ کھولتی ہے)

اِدھر ڈرائنگ روم ہے۔

(وہ ایک اُجاڑ کمرے میں داخل ہوتے ہیں)

بیوی: ڈرائنگ روم! یہ ڈرائنگ روم ہے؟

عورت: تو اور کیا' اب کیا میں اس میں تصویریں لا کر لگاؤں؟ اچھا خاصا کمرا ہے۔ ڈرائنگ روم نہ سہی' تم اسے سٹور بنا لینا۔

بیوی: وہ باقی کمرے.....

عورت: باقی' ہاں باقی کمرے (ایک اور اسی طرح کے کمرے میں داخل ہوتی ہے) ایک کمرا تو یہ ہے۔ ٹھیک ٹھاک ہے' بس دس پندرہ سال سے سفیدی نہیں ہوئی' اس لیے تھوڑا سا گندہ ہو رہا ہے۔ اس کھڑکی پر پردہ ڈال لینا ورنہ سامنے والے ہوٹل سے اندر نظر پڑتی ہے۔ (روکتے ہوئے) آں ہاں۔ کھڑکی مت کھولو۔

(بیوی کھڑکی کھولتی ہے۔ ایک دم پیچھے ہٹ کر ناک پر ہاتھ رکھتی ہے)

بیوی: اف! توبہ!! کس قدر بُو ہے۔

عورت: اسی لئے تو منع کیا تھا کہ کھڑکی مت کھولو' ادھر کارپوریشن کا کُوڑا ڈپو ہے' ساتھ پبلک لیٹرین ہے' برابر میں گندا نالہ گزرتا ہے (کھڑکی بند کرتی ہے) ارے تم بیڈ روم بنا لینا۔ ہاں یہ ایک کمرا ہے۔ (ایک طرف اشارہ کرتی ہے) ذرا چھوٹا ہے' پھر بھی کسی نہ کسی کام تو آ ہی جائے گا۔ بچے ہیں تمہارے؟

بیوی: جی نہیں' ابھی چار ماہ پہلے تو ہماری شادی ہوئی ہے۔

عورت: چلو اچھا ہے۔ مجھے تو بچے زہر لگتے ہیں' ہر وقت رِیں رِیں' رُوں رُوں۔ ایک منٹ زبان تالو سے نہیں لگتی۔ انسان چند لمحے بیٹھ کر کچھ سوچے' کچھ پڑھے۔ ہاں یاد آیا' بیٹا تم پڑھے لکھے ہو؟

میاں: جی' جی گریجویٹ ہوں۔

عورت: وہ تو ٹھیک ہے مگر میٹرک بھی کیا ہے' کچھ لکھ پڑھ بھی لیتے ہو۔ دراصل مجھے اخبار پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ اب میری آنکھیں جواب دے گئی ہیں' حروف دکھائی نہیں دیتے۔ تمہیں بس ایک تکلیف دوں گی کہ صبح دو تین گھنٹے مجھے اخبار پڑھ کر سنا دیا کرنا۔

میاں: جی؟

عورت: یہ کمرا میرے استعمال میں رہے گا۔ باقی تینوں کمرے تمہارے!

مزے سے رہو۔ کھاؤ پیؤ اُٹھو بیٹھو!

بیوی: مگر...!

عورت: اگر مگر کچھ نہیں، کیا تم اپنی بوڑھی مالک مکان کی اتنی سی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتے؟ سچ کہتی ہوں تمہارے آنے سے اس گھر میں رونق آجائے گی۔ میرا کتنا جی چاہتا تھا کہ کوئی میرے پاس ہو جس سے مَیں باتیں کروں۔ شطرنج کھیلنا آتی ہے تمہیں؟

بیوی: مجھے؟ جی نہیں۔

عورت: کوئی بات نہیں، میں سکھا دوں گی۔ پھر میں اور تم کھیلا کریں گے رات رات بھر! دراصل مجھے جاگتے رہنے کی بیماری ہے۔ ساری ساری رات چھت کو گھورتی رہتی ہوں۔ اب تم آ جاؤ گی تو میرا وقت اچھا کٹ جائے گا۔ میری پچھلی کرایہ دار بہت اچھی تھی، ہم دونوں چوبیس گھنٹے باتیں کیا کرتی تھیں۔

بیوی: کیا ہُوا اسے؟

عورت: اسے تو کچھ نہیں ہُوا، اس کے خاوند کو لُو لگ گئی تھی سردیوں میں۔

میاں: سردیوں میں لُو لگ گئی تھی؟

عورت: اور کیا، ایک دن پتہ نہیں کیا اول فول بکنے لگا۔ میں نے دروازے بند کر لیئے ورنہ وہ تو پاگل ہو رہا تھا۔ کوئی پوچھے بھئی تمہیں کس نے کہا کہ عورتوں کی باتیں سنو۔ اور تم جانو اصل باتوں میں کبھی کبھار دیر ہو ہی جاتی ہے۔ اس دن بے چاری غریب کو باتوں باتوں میں تیسرے وقت کا کھانا بھی پکانا یاد نہ رہا۔ بس اتنی سی بات پر ناراض ہو گیا۔

میاں: تیسرے وقت کا... کھانا... اوخدایا!

عورت: نہیں بیٹے، کھانے کی تم تکلیف نہ کرنا، میں اپنا کھانا خود ہی پکا لیا کروں گی۔ خدا خوش رکھے، میری پچھلی کرایہ دار بہت اچھی تھی۔ جس دن بھی کھانا پکاتی، مجھے اپنے ساتھ کھلاتی تھی۔ جب تک وہ رہی، میں نے کبھی چولہے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ اب اس عمر میں کھانا کیا ہے، مگر وہ چیز جسے عادت کہتے ہیں، کم بخت پیچھے پڑ گئی ہے۔ جب تک سالن میں چار پانچ بوٹیاں نہ ہوں، مجھے مزا ہی نہیں آتا۔ ارے ارے کہاں چلے؟ ٹھہرو، سنو تو سہی۔ چلو تم دو بوٹیاں ہی ڈال دینا، ارے رُکو...

میاں بیوی کا ہاتھ پکڑتا ہے، دونوں باہر کو بھاگتے ہیں

پہلے والا منظر: میاں بیوی کا پرانا مکان، بازار، شور، گوڑا خانے کی بُو، دیگوں کی کھڑکھڑاہٹ، کباڑیوں کی تاڑ پھاڑ، موٹر سائیکل، ٹیکسیوں اور رکشوں کی چنگھاڑ۔

بیوی: سنئے!

میاں: جی فرمایئے!

بیوی: ذرا یہ کھڑکی تو کھول دیجئے۔

میاں: کیوں؟ تمہیں تو بازار کے شور سے وحشت ہوتی ہے۔

بیوی: جب سے مَیں نے اس بڑھیا کی باتیں سنی ہیں، مجھے یہ گھر جنت کا ٹکڑا معلوم ہونے لگا ہے۔ دیکھئے اس ٹیکسی کا ہارن کتنا سُریلا ہے... (ہارن کی آواز) اور یہ ڈھلائی والے کتنے آہنگ سے ہتھوڑا چلاتے ہیں (ہتھوڑے کی آواز) یوں لگتا ہے جیسے کوئی ماہر طبلچی طبلے پر سنگت کر رہا ہو۔ کتنی مزیدار خوشبو ہے پلاؤ قورمے کی، کس لَے اور سُر میں کھڑک رہی ہیں دیگیں؟

میاں: یہ اشتہار دیکھا ہے تم نے۔

بیوی: کون سا؟

میاں: یہی ''بنگلہ کرائے کے لئے خالی ہے۔''

بیوی: جہنم میں ڈالیں اشتہار کو، یہ گانا سنیں۔ ویسے ایک بات ہے، اس ہوٹل والے کے پاس ریکارڈ بہت اچھے اچھے ہیں، سنئے ذرا!

میرا گھر، میری جنت، یہ میرا آشیاں

گانے کی آواز پر دونوں جھومنے لگتے ہیں۔

مزاحیہ مشاعرہ

ہماری دعوت پر نسٹیئنز نے اپنے پسندیدہ مزاحیہ اشعار ارسال کیئے اور کمال یہ کیا کہ شاعر کے اصل نام کے ساتھ۔ان باذوق نسٹیئنز کے نام:

اُسامہ حسن، محمد منیب، مامون چیمہ، ربیعہ خالد، اختر رضا، ابحال محبوب، شبانہ بتول، فاطمہ ریاض
زنیرہ اصغر، حشام احمد، شہریار بختیار، عدیل مشتاق، ارسلان خان، منیب احسن، حسن علی، عاصم فاروق، نیرہ فاروق، نایاب افتخار چودھری

نسٹ میں ایڈمشن

کب اُسے ذوقِ شعر و سخن چاہیئے
میرے پیارے کو شوارمے چکن چاہیئے
اُس کے چہرے پہ ہیں جُھرّیاں اَن گِنت
اور ملبوس اسے بے شکن چاہیئے
باپ چاہیئے کھلونے اُسے لے کے دے
اور بچّہ یہ کہتا ہے ''گن'' چاہیئے!
بولتا ہے تو خاموش ہوتا نہیں
اُس کے بھاری لبوں پر بٹن چاہیئے
میرے بچّے پہ یارب کرم تُو ہی کر
نسٹ ہی میں اُسے ایڈمشن چاہیئے

(نسیمِ سحر)

عِلم

ہم نے کل اخبار میں اِک دوست کا کالم پڑھا
تھا بنی آدم جہاں لکّھا نبی آدم پڑھا
اِک جگہ مَوسِم کو ہم نے سَہواً مَوسَم پڑھا
حضرتِ راغب نے ٹوکا، تم نے پھر مَوسَم پڑھا
فارسی میں اِک جگہ لکّھا تھا بَرمَن گم گرم
ہم نے انگریزی میں ''بَرمَن گم'' کو برمنگھم پڑھا

(دلاور فگار)

اپنا کھاؤ

دیگ اور کفگیر والوں کا بُرا یُوں حال ہے
بوٹیاں جس میں بھری رہتی تھیں اُس میں دال ہے
آ گیا بُدھ وار تو بیگم سے فرمائش ہوئی
آج بریانی پکا لؤ بند شادی ہال ہے

(گستاخ گیاوی)

دل یا کھلونا

افسرِ سرکار ہونا چاہیے
ٹھاٹ سے دفتر میں سونا چاہیے
دل مِرا فی الفور واپس کیجئے
آپ کو شاید کھلونا چاہیے
آپ کا مضموں فکاہی ہے مگر
اس کے ہر فقرے پہ رونا چاہیے

(کلیم چغتائی)

درخواست بنامِ شاعر

اپنی غزلیں سُننے والوں سے یوں حفظ کرائیں گے
جو دو چار لکھی ہیں غزلیں اُن کو ہی دُہرائیں گے؟

ممکن ہو تو بہرِ خدا دو چار اشعار تو لکھیں اور
ہر محفل میں کب تک ہم کو باسی شعر سُنائیں گے؟

(خالد محمود)

کُھلا بستر

تین سو مجھ سے لئے ٹی ٹی نے اور کچھ دیر بعد
دوسرے سے چار سَو اینٹھے ہیں یہ مجھ پر کُھلا

برتھ دینے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
''جتنے عرصے میں مِرا لپٹا ہُوا بستر کُھلا''

(عاصی اختر)

آئیڈیا

بِل بَنا دفتر میں اپنے بیٹھ کر
محکمے کو اب نیا یہ تھاٹ دے

بیس ہیں تو سَو اِکائیاں درج کر
اور ہِن نوٹس کے مِیٹر کاٹ دے

(ماجد صدیقی)

امریکہ میں

ہم کو تو بڑھاپے نے کہیں کا بھی نہ چھوڑا
محرومیٔ جذبات کو بیٹھے ہیں چُھپائے

خوش ہوتے ہیں ہم لوگ اگر کوئی حسینہ
اس عمر میں ہم پر کوئی تہمت ہی لگائے

• بل کلنٹن کے سکینڈل کی جانب اشارہ

(ضیاء الحق قاسمی)

واٹر گاڑی

کبھی سیلف کرتا نہیں کام اس کا
کبھی بیٹ ری ہنہنائی ہُوئی ہے

مِری جان یہ دھکّہ اسٹارٹ ہو گی
یہ گاڑی مِری آزمائی ہُوئی ہے

(سرفراز شاہ)

پاپ میوزک

دیکھنا لوگو ڈھٹائی ایک نغمہ چور کی
پڑھ رہا ہے بزم میں میری غزل کس شان سے

پاپ موسیقی جسے کہتے ہیں، پاتی ہے جنم
ساز اور آواز کے اِک کُودتے طوفان سے

اُس نے اطہر میرے دانتوں کا کباڑا کر دیا
میں نے سوچا تھا کہ دُوں جاپان کو زَک پان سے

(طیّب علی اطہر شیرکوٹی)

مُشکل مضمون

کرتا ہُوں مَیں جتنا بھی اُسے فون زیادہ
ہو جاتا ہے ناراض وہ قارون زیادہ

آسان نہیں عشق کا سبجیکٹ بھی لیکن
مُشکل ہے یہ الجبرے کا مضمون زیادہ

ہو جائے نہ مُنکھڑا ترا کچھ اور بھی کالا
چہرے پہ رگڑ بھائی نہ صابُون زیادہ

(عبداللہ یزدانی)

دوائے دِل

''دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے''
ذکر یہ بائی پاس کا کیا ہے؟

ہارٹ اسپیشلسٹ سے پوچھ کے دیکھ
''آخر اِس درد کی دوا کیا ہے''

(شاہدالوری)

بول بالا

مَیں کہتا ہُوں کہ یہ کیا ہو رہا ہے
وہ کہتے ہیں: سب اچھا ہو رہا ہے

مَیں کہتا ہُوں: گرانی بڑھ رہی ہے
بہت دشوار جینا ہو رہا ہے

فقیرُالدّین کا ہے حال پتلا
امیرُالدّین موٹا ہو رہا ہے

وہ کہتے ہیں: تمہاری کھوپڑی کا
یقیناً پیچ ڈھیلا ہو رہا ہے

گرانی کی شکایت کررہے ہو!
کرم یہ تو خدا کا ہو رہا ہے

ستاروں سے بھی جو آگے جہاں ہیں
وہاں تک اپنا چرچا ہو رہا ہے

خدا کا شُکر ہے پھر آسماں سے
جو نازل ''من و سلویٰ'' ہو رہا ہے

(طٰہٰ خان)

لوٹا

صحت مند لوٹا نہ بیمار لوٹا
لڑھکنے کو بیٹھا ہے تیار لوٹا

حکومت کسی پارٹی کی بھی ہو یاں
ملے گا تمہیں عینِ دربار لوٹا

نذیر اس کے مَیں آنے جانے پہ صدقے
بڑے کام کی شے ہے عیّار لوٹا

(نذیرلدھیانوی)

آہستہ آہستہ

ابھی تو سات دِن پہلے بنا ہے وہ اوورسیئر
بنے گا ملیّن نر میرا پسر آہستہ آہستہ

نہ رؤ بندہ اگر سرجن نے کوئی مار ڈالا ہے
وہ بَن جائے گا ماہر ڈاکٹر آہستہ آہستہ

کھِلا کر پندرہ سالوں تک دوا سرجن نے فرمایا
تمہارا ٹھیک ہو جائے گا درد آہستہ آہستہ
بجائے ایک دن کے ہم کو پہنچائے گی ہفتے میں
چلے گی ریل گاڑی یُوں ہی گر آہستہ آہستہ

گٹر تعمیر ہوں گے روز، گر سٹریٹ میں یُوں ہی
گلی بن جائے گی ساری گٹر آہستہ آہستہ

(نیاز سواتی)

مداری

شاپنگ کو تو چل دیئے مادر کے ساتھ ساتھ
قرضے ہی صِرف رہ گئے فادر کے ساتھ ساتھ
گھربار چھوڑ بیوی تو میکے چلی گئی
روتے ہیں بچّے صحن میں شوہر کے ساتھ ساتھ
لو اَب تو آئینے نے بھی تنگ آ کے کہہ دیا
صورت بھی اچھی چاہیے زیور کے ساتھ ساتھ
نمرود کا طبیب تھا اُلٹے دماغ کا
بھیجہ نکال ڈالا تھا مچھّر کے ساتھ ساتھ
دیکھو ذرا تماشہ مداری کا آج کل
لوگوں کو بھی نچائے ہے بندر کے ساتھ ساتھ

(جعفر رضوی)

سی این جی

آج رقیبوں کی بستی میں اپنا تو وہ حال ہُوا
مِیر کی نازک غزل کا حال جو مِل کر چند قوّال کریں
یہ سی این جی، لیٹر ہے بے چاروں کو بے کاری کا
چودھری صاحب لینڈ کروزر میں جو استعمال کریں

(رضا رشید حیدر)

شمع اور بلب

لے کر ہی مَیں ٹلُوں گا تقرر کا حکم آج
وعدوں پہ اب کے مجھ کو بُھلایا نہ جائے گا
یہ شمعِ دل نہیں ہے، سفارش کا بلب ہے
''پھونکوں سے یہ چراغ بُجھایا نہ جائے گا''

(عنایت علی خان)

ڈگری

علم کا رُعب ٹھیک ہے پیارے
ڈگریوں کا بھی کچھ اثر ڈالو
کر لیا ہے جو تُم نے پی ایچ ڈی
ساتھ ہی میٹرک بھی کر ڈالو

(نذیر جالندھری)

شامیانہ

آیا جو صبح چھ بجے نمبر جناب کا
تابش یہ بولے شعر پڑھوں شاعرانہ کیا
جو شعر سُننے آئے تھے گھر جا کے سو چکے
میری غزل سُنے گا فقط شامیانہ کیا؟

(تابش الوری)

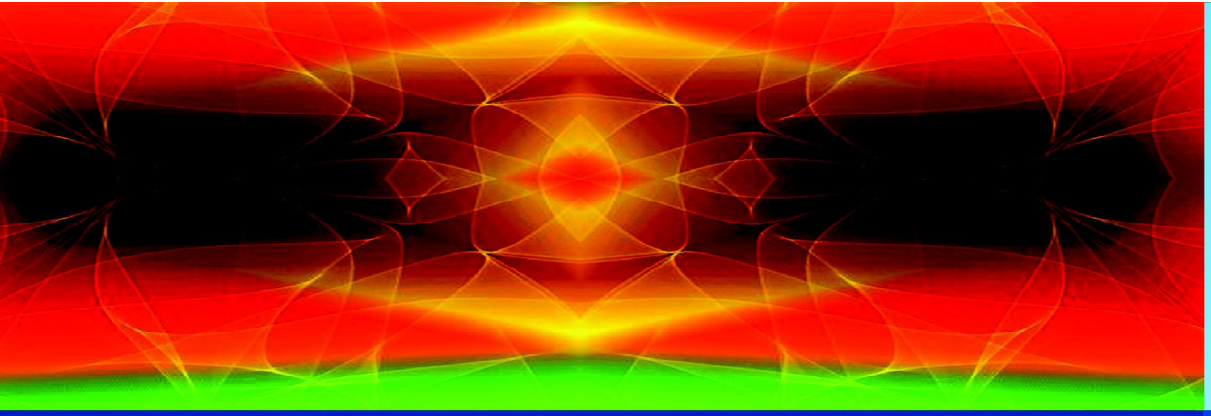

سائنس

دل زندہ و بیدار اگر ہو تو بتدریج
بندے کو عطا کرتے ہیں چشمِ نگراں اور

— اقبالؒ

ٹیکنالوجی کے بڑھتے قدم

ذوالفقار علی

مغرب فی الحال دنیا میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ کرۂ ارض کی کُل آبادی کا صرف 1/7 حصہ یورپ اور شمالی امریکہ میں آباد ہے' لیکن وہ دنیا کی دوتہائی دولت پیدا کرتے ہیں' دوتہائی ہتھیاروں کے مالک ہیں اور ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ پر دوتہائی سے زیادہ وسائل صرف کرتے ہیں۔ امریکی کارکُن چین کے کارکُنوں سے اوسطاً سات گُنا زیادہ کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

1972ء میں جب امریکی صدر رچرڈ نکسن نے چین کا دورہ کیا' تو امریکی کارکنوں کی پیداواری صلاحیت چینی کارکنوں کے مقابلے میں بیس گُنا زیادہ تھی۔ اُس وقت عالمی پیداوار میں چین کا حصہ صرف پانچ فیصد تھا جو اَب چودہ فیصد ہے۔ چین اس وقت دنیا کی دوسری سب سے بڑی معیشت ہے (جاپان کا نمبر تیسرا ہے) اور سب سے زیادہ کاربن خارج کرنے والا ملک ہے۔ دنیا کا تیزترین سپر کمپیوٹر چین کے پاس ہے۔ چینی خلانورد خلا میں پہنچ چکے ہیں اور شاید امریکیوں کی واپسی سے پہلے چاند پر موجود ہوں گے۔

دوسو سال قبل صنعتی انقلاب نے مغربی یورپ کو دنیا پر غلبہ عطا کیا۔ آج 2012ء میں ہم ایسے دور سے گزر رہے ہیں جہاں دولت' طاقت اور شہرت اپنا ٹھکانہ بدل رہی ہیں۔ جغرافیے کا معیشت اور ٹیکنالوجی کے ساتھ رابطہ وہ قوت ہے جو مشرق کو بلندیوں کی طرف لے جارہی ہے۔ یہی وہ قوت تھی جس نے مغرب کو غلبہ عطا کیا تھا۔

پندرہویں صدی میں جہاز رانی کے نئے طریقوں کے ذریعے (جو چین نے دریافت کئے) جہازوں کا سمندر پار سفر ممکن ہُوا۔ یہ جغرافیائی معلومات کہ مغربی یورپ' امریکہ کے مشرقی ساحل سے صرف تین سومیل اور چین اس کے مغربی ساحل سے آٹھ سومیل کی دوری پر ہے' دنیا کی نہایت اہم حقیقت بن گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ چین کی بجائے یورپ دنیا میں اپنی کالونیاں بنائے اور بحرِ اوقیانوس کے ساحلوں کے گردنئی مارکیٹ اکانومیز قائم کرے۔

ان مارکیٹوں نے ایسے مواقع فراہم کئے جن کی بدولت چینیوں کی بجائے اہلِ یورپ صنعتی انقلاب میں قدرتی ایندھن استعمال کرسکیں۔ بھاپ سے چلنے والے یورپ کے جہازوں اور ریل کی پٹڑیوں نے صدی میں دنیا کو مزید سکیڑ دیا اور شمالی امریکہ کی سرزمین میں چھپی ہوئی وسیع معدنی دولت کھل کر سامنے آ گئی۔ 1900ء میں امریکہ دنیا کی طاقت کے مرکز مغربی یورپ کو بے دخل کر چکا تھا۔ تاریخ اس مقام پر ٹھہری نہیں' ٹیکنالوجی کی بدولت صدی میں بھی دنیا کے سکڑنے کا عمل جاری رہا۔ 1950ء میں بحرالکاہل تک آزادانہ تجارت میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی' اب مشرقی ایشیا کی سرزمین میں موجود صنعتی صلاحیتوں کے نمودار ہونے کی باری تھی۔ پہلے جاپان پھر جنوبی کوریا' تائیوان' سنگاپور' ملائیشیا اور اب چین عالمی معیشت کا حصہ بن گئے۔ 2000ء تک چین امریکہ کے مقابل آچکا تھا۔ 2025ء میں یہ یقیناً اس کا

متبادل بن جائے گا۔

انیسویں صدی میں مشرقی حکمران' افواج اور دانشور بدلتی ہوئی جغرافیائی صورتِ حال کو روکنے کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے اور اب اکیسویں صدی میں مغربی حکمران' افواج اور دانشور بھی اس بدلتی صورتِ حال کے سامنے بے بس ہیں' لیکن اس کے باوجود انیسویں صدی کے مشرقی حکمران مغربی غلبے سے نمٹنے کے لئے بہت کچھ کر سکتے تھے۔ 1793ء میں برطانیہ کی جانب سے فری تجارتی مرکز کی پیش کش ٹھکرانا چین کے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہوا۔ 1840ء میں برطانوی بحری جنگی جہازوں کے مقابلے میں پرل اور ینگز ڈیلٹاؤں کو مستحکم کرنے میں ناکامی اس سے بھی بدتر تھی۔ 1941ء میں جاپان کا پرل ہاربر پر حملہ کرنا بدترین فیصلہ تھا۔ ان میں سے کسی ایک یا اور بہت سے موقعوں پر کئے گئے بہتر فیصلے مشرق کے لئے بڑے سودمند ثابت ہو سکتے تھے۔

سوال یہ ہے کہ مغرب کس طرح مشرق کی ترقی سے نبرد آزما ہو سکتا ہے؟ اکیسویں صدی میں مغربی اقوام بھی مشرق کی ترقی سے نمٹنے کے لئے بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ اس کی ایک بڑی مثال مغرب کی جانب سے اپنے قرضوں کی ادائیگی ہے۔ یوروزون کے حالیہ تجربات نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ ادائیگی کتنی مشکل ہے' لیکن امریکہ کی بے دلی آنیوالے خطرات کی پیش گوئی کر رہی ہے۔

آبادی کی عمر میں غیر متناسب توازن کو بہتر کرنے کی خاطر مغرب کا نوآبادکاروں کی حوصلہ افزائی کرنا ایک اور مسئلہ ہے۔ مزید کوشش نہ کی گئی تو خدشہ ہے کہ 2020ء میں مغرب کو تباہی کا سامنا ہوگا۔

تیل اور گیس کے بحران پر قابو پانا تیسرا مسئلہ ہے۔ غیر مستحکم ہونے کے خطرے کے پیشِ نظر وسائل کے حصول کے لئے مشرق اور مغرب کے درمیان مقابلہ' جو افریقہ سے مشرقِ وسطیٰ اور مرکزی ایشیا تک پھیلا ہوا ہے' مشکلات پیدا کر رہا ہے۔ خصوصاً گلوبل وارمنگ اور جوہری ہتھیاروں کے پھیلاؤ کا خطرہ خطے کو مزید غیر مستحکم کر رہا ہے۔ بین الاقوامی توازن برقرار رکھنے کے لئے امریکی فوجی طاقت کا استعمال نہایت اہم معاملہ ہے۔ یہ ایک خطرناک حربہ ہے' مگر یہ امریکی ہتھیار ہی ہیں جن کی بدلت تائیوان اور کوریا کے درمیان گزشتہ چونسٹھ برس سے امن برقرار ہے اور یہ امریکی ہتھیار ہی ہوں گے جو اکیسویں صدی میں چین کی ترقی کے پُرامن ہونے کی ضمانت دیں گے۔

2011ء کی تقریبِ عطائے نوبل انعام کے بائیکاٹ میں چین کے ساتھ اٹھارہ ممالک شامل تھے جو مغرب مخالف ہیں۔ ان میں ایران اور وینزویلا سرفہرست ہیں' لیکن یہ حقیقت مغرب کے لئے پریشان کُن تھی کہ افغانستان' مصر' عراق' پاکستان اور سعودی عرب نے بھی امریکہ کی بجائے چین کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ طویل مدت میں مشرق کی ترقی سے متعلق خدشات شاید ٹیکنالوجی اور گلوبلائزیشن کی سنگدل طاقتوں کے سامنے ڈھیر ہو جائیں۔

آج سے سو سال بعد شاید مشرق اور مغرب کے معانی میں کوئی فرق نہ رہے' لیکن قلیل اور درمیانی مدت میں جہاں ہم بڑھتے ہوئے عالمی مسائل کو انیسویں اور بیسویں صدی میں قائم کردہ قومی ریاستوں کے مسائل حل کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں' خطرات بہت زیادہ ہیں۔ ایک ایسی دنیا میں جو بڑے پیمانے پر تباہی مچانے والے ہتھیاروں سے بھری پڑی ہے' وہاں ان ہتھیاروں کو سنبھالنے میں ناکامی کا تو آپشن ہے ہی نہیں۔

اگلے چالیس سال انسانی تاریخ میں نہایت اہم ہوں گے' جس کا سب سے بڑا محرک مشرق میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے تیزی سے بڑھتے قدم ہیں۔

لیلۃ القدر ○ آبِ زم زم ○ نماز: سائنسی جائزہ

عمل سرفراز

لیلۃ القدر سے متعلق بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اختلافِ مطالع کی وجہ سے ہر جگہ رات کا ایک وقت میں ہونا ممکن نہیں۔ جب مکہ معظّمہ میں رات ہوگی' اُس وقت دنیا کے بہت سے ممالک میں دن ہوگا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس رات کے فضائل اور اس کی برکتوں سے تمام ممالک کے لوگ یکساں فیض یاب ہو سکتے ہوں۔ جہاں رات ہوگی' وہاں کے لوگ اس رات کی فضیلت کو پا سکتے ہیں اور جہاں دن ہوگا' وہ اس سے محروم رہیں۔ اس کی مختلف تشریحات ممکن ہیں' مثلاً:

رات کی حقیقت کیا ہے؟

زمین کے کسی حصے کا سورج کے سامنے سے ہٹ جانا کیونکہ جب سورج کی کرنیں زمین کے اس قطعہ تک نہیں پہنچیں گی' تو وہاں رات ہوگی۔

دن کی حقیقت کیا ہے؟

کسی قطعہ زمین کا سورج کے سامنے آ کر سورج کی کرنوں سے منوّر ہو جانا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ زمین سورج کے گرد حرکت کرتی اور گھومتی ہے۔ اس لحاظ سے زمین کا جو حصہ سورج کے سامنے آ جاتا ہے' وہاں دن طلوع ہو جاتا ہے اور باقی حصوں میں رات ہوتی ہے۔ مسلسل گھومنے کی وجہ سے رات پیچھے ہٹتی جاتی ہے اور دن پھیلتا جاتا ہے۔ زمین کے یہ روشن حصے جب زمین کی حرکت کی وجہ سے سورج کے سامنے سے ہٹتے جاتے ہیں' تو وہاں رات طاری ہو جاتی ہے۔ اس طرح رات اور دن کا یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے' جسے قرآنِ کریم ''یکور الیل علی النھار و یکور النھار علی الیل'' (رات دن پر لپٹی آتی ہے اور دن رات پر لپٹا آتا ہے) سے تعبیر کرتا ہے۔

غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مختلف قطعاتِ زمین پر رات کے طاری ہونے میں کہیں کٹ جانے کا عمل نہیں ہے' کیونکہ زمین کی حرکت ہر دم جاری ہے۔ جیسے جیسے زمین سورج کے سامنے سے ہٹتی جاتی ہے' توں توں رات میں ڈوبتی جاتی ہے۔ یہ سفر چونکہ مسلسل جاری رہتا ہے' اس لیے رات بھی بغیر الگ ہوئے مسلسل جاری رہے گی۔ فرض کریں جب لیلۃ القدر مکہ معظّمہ میں وارد ہوئی' تو یہی لیلۃ القدر زمین کی گردش کے ساتھ مسلسل آگے بڑھتی جائے گی اور زمین اور اہلِ زمین کو اپنی برکات بانٹتی جائے گی۔ گویا یہ رات ایک ہی ہے' البتہ مختلف ممالک کے لوگ اپنی اپنی باری پر اس سے فیضیاب ہوتے جائیں گے۔ یعنی یہ خیر و برکت کی ایک ٹرین ہے۔ یہ ٹرین ایک ہی ہے' ہر سٹیشن پر منتظر لوگ اس کے وہاں پہنچنے پر اس میں سوار ہو جائیں گے۔ ارشادِ باری تعالےٰ ابھی آپ نے پڑھا کہ رات دن ایک دوسرے پر لپٹے ہوئے آتے ہیں' ایک دوسرے سے کٹتے نہیں۔ یہ وضاحت بھی اہلِ علم نے کی ہے کہ عربی زبان میں اکثر رات کا لفظ دن اور رات کے مجموعے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس لیے رمضان کی ان تاریخوں میں جو تاریخ بھی دنیا کے کسی حصے میں ہو' اس کے دن سے پہلے والی رات وہاں کے لیے شبِ قدر ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں آخری اور سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہر جگہ کے اعتبار سے جو رات شبِ قدر قرار پائے گی' اس جگہ اُسی رات میں شبِ قدر کی برکات حاصل ہوں گی۔

آبِ زم زم

زم زم کا چشمہ جاری ہوئے چار ہزار سال گزر چکے ہیں' روزانہ بے شمار انسان یہ متبرک پانی پیتے ہیں۔ یہ تبرک کے طور پر دنیا کے ہر حصے میں پہنچتا ہے۔ اس کے باوجود پانی کی مقدار کبھی کم نہ ہونے پاتی بلکہ کنواں ہمیشہ لبریز رہتا ہے۔ زم زم کا پانی نہ صرف پیاس بجھاتا ہے بلکہ اس میں غذائیت بھی پائی جاتی ہے۔ آبِ زم زم کے کیمیاوی تجزیے سے اس میں معدنی اجزاء میگنیشیم سلفیٹ' سوڈیم سلفیٹ' سوڈیم کلورائیڈ' کیلشیم کاربونیٹ' پوٹاشیم نائٹریٹ اور ہائیڈروجن سلفائیڈ موجود ہونے کا انکشاف ہوا ہے۔ میگنیشیم سلفیٹ جسمانی حرارت اور گرمی دور کرتا ہے۔ قے' متلی' سردرد میں بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ دست آور ہے اور جسم سے مضر صحت اجزاء کی بیخ کنی کرتا ہے۔ سوڈیم سلفیٹ قبض کشا ہے' جوڑوں کے درد کے لئے مفید ہے۔ ذیابیطس' پتھری اور پیچش میں مفید ہے۔ سوڈیم کلورائیڈ انسانی خون کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ نظامِ تنفس اور ہضم کی صفائی اور درستی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ آنتوں اور پیٹ کے مسلسل درد اور ہیضے میں بہت فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ اعضاء کی کمزوری کو بھی دور کرتا ہے۔ کیلشیم کاربونیٹ غذا کو ہضم کرنے' ہر قسم کی پتھری کو توڑنے اور جوڑوں کے درد میں استعمال ہوتا ہے۔ جسمانی حدت اور لُو کا اثر زائل کرنے کے لئے مفید ہے۔ پوٹاشیم نائٹریٹ تھکن اور لُو کے اثرات کو زائل کرتا ہے۔ ہائیڈروجن سلفائیڈ تمام جلدی امراض میں نفع بخش ہے۔

نماز

قادرِ مطلق نے ہمارے لئے نمازوں کی جو ترتیب مقرر فرمائی ہے' اس میں ہماری جسمانی غذائی ضروریات کا خیال رکھا ہے۔ جس وقت معدہ خالی ہوتا ہے اس وقت رکعتوں کی تعداد کم رکھی گئی ہے اور جب معدہ غذا سے پُر ہے اس وقت رکعتوں کی تعداد زیادہ رکھی گئی ہے۔ نماز میں طویل سجدے وافر مقدار میں تازہ خون دماغ تک پہنچاتے ہیں کیونکہ انسانی جسم میں سر سب سے اوپر ہے۔ اس میں کسی جسمانی نقص کی وجہ سے خون صحیح طرح پر دماغ تک نہ پہنچ رہا ہو تو نماز میں سجدہ وہ واحد رکن ہے' جس حالت میں دل سے خون براہ راست دماغ تک بہ آسانی پہنچ سکتا ہے۔ دماغی امراض کے مریضوں کا مسئلہ ہی دماغ کی نالیوں میں خون کا نہ پہنچنا اور اس میں نقص ہونا ہے جس کا واحد علاج نماز کی حالت میں طویل سجدہ ہے۔ اسی طرح وضو میں ناک میں پانی چڑھانے کا حکم دیا گیا ہے جو دماغ کے بخارات اور رطوبت کو جو دماغی امراض کا سبب ہوتے ہیں خارج کر کے دماغ کو ہلکا کر دیتا ہے۔ تشہد کی حالت میں جسم بیٹھنے کی حالت میں ہوتا ہے' گھٹنے اور کولہے پر جھکاؤ ہوتا ہے' ٹخنے اور پاؤں کے عضلات پیچھے کھنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ مستقل ایک جگہ بیٹھ کر کام کرنے والے افراد اپنی نشست میں اسی کیفیت کو جو وہ نماز میں تشہد کی حالت میں بیٹھنے کی حالت میں رکھتے ہیں' اپنا لیں تو اس سے انہیں اعصابی تناؤ' پٹھوں کے کھچاؤ اور گھٹنوں اور پنجوں اور جوڑوں کے درد کی کیفیت سے افاقہ ہوگا۔ نیز یہ گیس ٹربل کے انسداد کا بھی موثر ذریعہ ہے۔ اسی لئے تو مردوں کو سیدھے پیر کا پنجہ اُٹھا ہُوا رکھنے اور دوسرے پیر کے تلوے کو بچھا کر اس پر پورا وزن رکھنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ تشہد کی حالت میں عورتوں کو دونوں پیر علیحدہ ایک جانب کھلے رکھنے کا حکم دیا گیا۔ یہ کیفیت انہیں ناف ٹلنے کی شکایت سے بچائے رکھتی ہے۔

> حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ زم زم کا پانی جس غرض سے پیا جائے وہ پوری ہو جاتی ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اپنے دستِ مبارک سے ڈول ڈال کر آبِ زم زم نوش فرماتے اور یہ دعا پڑھتے: ''اے اللہ مجھے فائدہ بخش علم عطا فرما۔ میرے رزق میں وسعت دے اور مجھے ہر بیماری سے شفا بخش۔'' زم زم بیٹھ کر پینے کے بجائے کھڑے ہو کر' ایک ہی سانس میں قبلہ شریف کی جانب منہ کر کے پینا سنت ہے۔ (مسلم)

نوجوانی کی موت

سیّد اسلم

خودکُشی ہر زمانے میں قابلِ نفرت رہی ہے۔حضرت موسیٰؑ کے زمانے سے قبل بھی یہ رواج تھا کہ اگر کوئی آدمی کہیں مراہُوا پایا جاتا اور یہ شک ہوتا کہ اس شخص نے خودکشی کرلی ہے تو اس کی تدفین نہیں کی جاتی تھی۔کہا جاتا کہ خودکشی کرنے والا احترام کا مستحق نہیں۔اس احترام کے مستحق فطری طور پر مرنے والے ہوتے ہیں ۔ تاہم خودکشی مذموم ہونے کے باوجود بے چارگی اور ناامیدی کی آخری شکل ہے۔بقول غالب:

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے

جلد مرنے اور خصوصاً نوجوانی میں مرنے کی آرزو شاعروں کا عمومی مشغلہ رہا ہے۔اس آرزو کا اظہار ہماری شاعری کا دلچسپ اور اہم حصہ ہے۔غالب نے بھی ''مرنے کی سَو تدبیروں'' کا ذکر کیا تھا:

تم نہ آؤ گے تو مرنے کی ہیں سَو تدبیریں
موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بُلا بھی نہ سکوں

لیکن وہ تدبیریں انہوں نے بتائی نہیں بلکہ ''رازِ سینہ دردفینہ'' کے مصداق ان کو ساتھ ہی لے گئے۔بہرحال نوجوانی کی موت پر بات کرنے سے قبل ایک اور مسئلے کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ ہزاروں افراد جو اپنے معالجوں کے پاس مشورے کے لیے آتے ہیں ان کی زبان پر ایک ہی سوال اور دل میں ایک ہی تمنا ہوتی ہے:''کوئی ایسا طریقہ معلوم ہو جائے جس سے بہتر محسوس کرسکوں بوڑھا معلوم نہیں ہوں لمبی عمر پاؤں اپنی عادات بالکل نہ بدلوں اور اپنے روز وشب سے پوری طرح لطف اندوز ہوسکوں۔''

ممکن ہے یہ مریض اتنے بہت سارے الفاظ میں اپنے طبیب سے ان سب خواہشوں کا اظہار نہ کرسکیں جو اُن کے چہروں سے تو عیاں ہوتی ہیں مگر زبان پر نہیں آتیں۔ان تمناؤں کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کو یہ سب کچھ تو حاصل ہو جائے لیکن وہ اپنی عادتوں اور طور طریقوں میں کوئی تبدیلی نہ لائیں۔وہی بے ڈھنگی رفتار جاری رکھیں جو پہلے تھی۔یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ اس تباہ کُن طرزِ زندگی کے باوجود جو آج کل اکثر لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے اور ایک طرح سے خودکشی کے مترادف ہے کوئی ایسی دوا کس طرح دے دی جائے جو آبِ حیات کا کام کرے اور اُن کا جسم جو قانونِ فطرت کے تابع ہے وہ بدل جائے۔

ایک مشہور طبیب نے اس مشکل کا حل یہ نکالا کہ اپنے مریضوں کو تحریر کردہ ہدایت دیتے ہیں کہ وہ ناپسندیدہ عادات واطوار کیا ہیں جن سے مرض بڑھتا ہے اور بے وقت کی موت عام ہوتی ہے۔یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ نوجوانی میں مرنے کے ان راستوں سے نہ قانون باز رکھتا ہے نہ کوئی روکتا ہے بلکہ احباب اعزّہ واقارب اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور کوئی اس سے یہ کہنے والا نہیں ہے کہ

اللہ آمیں سے ہم تو یوں پالیں
آپ آفت میں جان کو ڈالیں

یہ ہدایات اکثر مریضوں کے لیے ایک دھماکے کی طرح وارد ہوتی ہیں کیوں کہ مریض یہ چاہتے ہیں کہ زندگی تو اپنی مرضی سے لہو ولعب میں بسر کرتے رہیں لیکن اس کے باوجود ہر لحاظ اور ہر پہلو سے جوان رہیں اور طویل عمر پائیں۔ظاہر ہے کہ ان دونوں باتوں کو ملانا آگ اور پانی کو ملانا ہے کہ تندرست رہنے کے طریقے اور ہیں اور غیر صحت مند رہنے کے اور۔ ذیل میں افادۂ عام کی غرض سے وہ عادات وخصائل درج کیے جاتے ہیں جن کے ذریعے ہر شخص خود کو آفت میں ڈال رہا ہے اور بے وقت اپنے پیاروں کو داغِ مفارقت دے جاتا ہے۔

اندھادھند کھانا پینا

ایک عرب طبیب کا دلچسپ قول ہے کہ متوسط العمر افراد کے لیے ماہر باورچی اور خوش خوراک بیوی زہر ہے۔اس کے نصف اول سے تو کوئی اختلاف نہیں کرے گا کہ نہ صرف متوسط العمر لوگوں بلکہ جوان العمر افراد کو بھی ماہر اور بے وقوف باورچی جو مرغن غذائیں کھلاتا ہے، وہ کھانے والے کی موت کو جلد بلاتا ہے۔جلد مرنے کے لیے حیوانی چربی، بناسپتی گھی، ملائی والا دودھ، چکنائی دار گوشت، پنیر، ملائی، آئس کریم، مکھن، کیک پیسٹری خوب استعمال کریں۔روزانہ انڈے کھائیں، خصوصاً انڈوں کی زردیاں۔ اپنے آپ کو معتبر، خوش حال اور فارغ البال بنانے کے لیے موٹے ہو جائیں۔(اگر 35 سال کی عمر کے بعد وزن دس فیصد زیادہ ہے تو عمر پانچ سال کم ہوسکتی ہے) کڑاہی گوشت، مغز، کلیجی، گردے، سری پائے، کباب وغیرہ بکثرت کھائیں، سبزیوں سے پرہیز کریں۔اس طرح صحت جلد خراب ہوگی۔دعوتوں میں شیر مال، قورمہ، پلاؤ، بریانی، زردہ کھا کر اپنے خون کی رگوں کو سخت تنگ کرلیں۔

اپنی صحت خراب کرنے کا طریقہ یہ بھی ہے کہ نہایت تن آسان اور ہمیشہ نشینی کی زندگی بسر کریں۔ورزش کے بالکل قریب نہ جائیں۔ذرا سا دُور جانے کے لیے بھی سواری استعمال کریں۔نکڑ کی دکان سے سگریٹ کا پیکٹ بھی گاڑی میں بیٹھ کر لایا کریں، شام ٹی وی کے سامنے جم کر بیٹھ جائیں، خصوصاً پیٹ بھر کر کھانے کے بعد۔اس دوران صرف باورچی خانہ تک جائیں، جہاں سے کچھ کھانے کی چیزیں لے کر آجایا کریں۔ بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ اس کے لیے بھی خود نہ اُٹھیں، بلکہ یہ کام بھی بیوی بچوں سے کرائیں تاکہ چلنے پھرنے کی ذرا سی زحمت سے بھی بچ جائیں۔ملازمت پر جانے کے لیے بالکل کام کے مقام پر گاڑی سے اتریں تاکہ چلنے کی قباحت سے بچ جائیں۔دفتر اگر بالائی منزل پر ہے، تو سیڑھیوں سے ہرگز نہ جائیں بلکہ لفٹ استعمال کریں، باغ کے لیے بھی مالی ہونا چاہیے جو باغبانی کرے۔گھر کے چھوٹے موٹے کام کرنے کے لیے بھی کسی کی مدد لیں یا مستری کو بلائیں۔

ایک نوجوان شخص کو عین عالَمِ شباب میں نہایت سخت حملۂ قلب (ہارٹ اٹیک) ہُوا جس سے وہ بال بال بچا۔کہتا تھا کہ میرے چلنے پھرنے کی مقدار اس قدر کم تھی کہ میں اپنے قدموں کو گن سکتا تھا، یعنی دہلیز سے اُتر کر گاڑی میں اور گاڑی سے اُتر کر لفٹ میں اور پھر دفتر کی کرسی، جہاں ٹیلی فون کی گھنٹیاں اور چائے کی پیالیاں اور سگریٹوں کی ڈبیاں میری ساتھی ہوتی تھیں۔اسی طرح بچہ ماں کی گود اور گہوارے سے اُتر کر مدرسے کی گاڑی میں بیٹھتا ہے۔پھر اپنی گاڑی میں، جس کے بعد شفاخانہ کی بیمار ڈولی (ایمبولینس) میں اور آخر کار جنازہ گاڑی میں ایک ایسے مقام کی طرف روانہ ہوجاتا ہے، جہاں سے خالی جنازہ گاڑی ہی واپس آتی ہے۔

تمباکو نوشی

جلد موت لانے میں سگریٹ نوشی بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔اس مقصد کے حصول کے لیے سگریٹ نوشی، بلانوشی کی حد تک کریں اور یہ سالہا سال تک کریں۔سگریٹ یا بیڑی پینے سے اول تو پھیپھڑے کا سرطان ہوگا اور اس کے علاوہ مزید دو سرطانوں کے لیے بھی میدان فراہم ہوگا۔

یہ بات بھی اب ہر ایک کو معلوم ہے اور معلوم نہیں تو معلوم ہونا چاہیے کہ تمبا کو نوشی کرنے والوں میں مرضِ قلب بہت سخت ہوتا ہے اور اموات بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ دل کی سرخ رگوں کی خرابی کے علاوہ ٹانگوں اور دماغ کی سرخ رگیں بھی سخت اور تنگ ہوجاتی ہیں۔ جس کا نتیجہ فالج، ٹانگوں کا درد اور پاؤں کی انگلیوں کا گلنا بھی ہوسکتا ہے۔ تمبا کو خوری منہ، حلق اور کھانے کی نالی کا سرطان بھی کرتی ہے اور موت کو قریب سے قریب تر لاتی ہے۔ مے نوشی بھی عمر کو کم کرنے میں بے حد مددگار ثابت ہوئی ہے، چنانچہ

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بَس چل سکے، ساغر چلے

اگر دیگر غلط اعمال و عوامل بھی ہیں مثلاً تن آسان زندگی اور کھانے پر تابڑ توڑ حملے ہو رہے ہیں، تو مے نوشی بلڈ پریشر کو مزید بلند کرے گی، دل پر مزید بوجھ ڈال کر دل کی فعالیت کو کم کرے گی۔ ''تھوڑی سی'' پینے والوں کا دل بھی اپنا فعل صحیح طور پر انجام نہیں دے سکے گا اور قبل از وقت بند ہوجائے گا۔

چوہا دوڑ

جلد مرنے کا آسان طریقہ زندگی کی دوڑ میں مسلسل مصروف رہنا بلکہ چوہوں کی طرح دوڑ میں بگٹٹ دوڑنا ہے۔ چنانچہ زندگی مختصر کرنے کی غرض سے اپنے شعبہ میں سب سے اوپر پہنچنے کے لیے غیر ضروری جدّ و جُہد میں اپنے آپ کو آگے دھکیلیں، بڑھائیں، مقابلہ آراء ہوتے رہیں اور دوسروں کو جائز اور ناجائز طریقے سے پیچھے ہٹاتے رہیں کیوں کہ آپ کے ذہن میں تو یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اصل لطف تو سب سے اوپر جانے میں ہے۔ ہر چیز لینے کی کوشش کریں کہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے۔ کھا ڈبل روٹی، خوشی سے پھُول جا، مگر رخصت و تفریح کے لیے ہرگز کوئی وقت نہ نکالیں۔

کرب اور گھٹن

جلد موت لانے میں کرب اور گھٹن کا اہم کردار ہے۔ جذباتی کشمکش سے

> سگریٹ نوشی کی بدولت دائمی کھانسی کا تحفہ ملے گا۔ کھانسی اپنے دامن میں کئی فوائد لیے ہوئے ہے۔ مثلاً گھر میں چور نہیں آئیں گے اور گلی کے آوارہ کتے بھی نہیں کاٹیں گے۔ وہ یوں کہ آپ ساری رات کھانسیں گے، تو چور بھاگ جائیں گے کہ صاحبِ خانہ ابھی تک جاگ رہے ہیں اور چونکہ کھانسی کا بونس لاٹھی یا چھڑی ہے، اس لئے گلی یا سڑک پر چلتے ہوئے آوارہ کتے جونہی آپ کی جانب لپکیں گے، آپ چھڑی کے کچوکے بلکہ محض چھڑی لہرانے ہی سے کتوں کی بدتمیزی یا طبع آزمائی سے محفوظ رہیں گے۔
>
> —— یادیں، باتیں: حکیم اجمل خاں

خون کی کولسٹرول بھی بڑھتی ہے اور دیگر چکنائیوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ آخر کار یہ کولسٹرول اور چکنائی آپ کے جسم کی سرخ رگوں پر پڑے گی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ افغانستان میں لڑنے والے غیر ملکی فوجی جو اَپنے ملک سے دُور، کرب میں دوسری سرزمین پر دوسروں کی جنگ لڑنے میں مصروف ہیں اور جن کی غذا نہایت چکنی بلکہ حیوانی چربی سے بھرپور ہے، جب جنگ میں مارے گئے، تو ان کے بعد از مرگ ملاخطے (پوسٹ مارٹم) پر سرخ رگیں ناقابلِ بیان حد تک کولسٹرول کی وجہ سے تنگ اور سخت پائی گئیں [نیوز ویک-14 ستمبر 2012ء]۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ سرخ رگوں کو خراب کرنے اور جلد مرنے میں کرب اور مرغن غذا فیصلہ کُن کردار ادا کرتی ہے۔ کرب میں مبتلا اُنیس سالہ نوجوان کی سرخ رگیں پچاس سالہ شخص کی طرح ہوجاتی ہیں۔

جلد مرنے کے لیے خود کو ہر وقت گھٹن اور حالتِ کرب میں رکھیں۔ اپنے آپ کو کبھی بھی ستانے کا موقع نہ دیں۔ فضول خرچی نہ چھوڑیں اور پوری پوری محنت کے بعد بھی اپنے معاملات کے بارے میں فکرمند رہیں۔

قناعت پسندی کو قریب سے نہ گزرنے دیں۔ ہر وقت اس اُدھیڑ بُن میں رہیں کہ یہ رعایت یا سہولت تو مل گئی' اب دوسری سہولت کیسے ملے گی۔ خود سے کم تر معیارِ زندگی والوں پر نظر بھی نہ ڈالیں' اس سے ڈپریشن ہوتا ہے۔ یہ دیکھیں کہ ساتھ والے یا اعلیٰ درجے والے کن کن مراعات سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں لیکن ایسا ایک لمحے کو نہ سوچیں کہ وہ کم عقل خود کتنی محنت کرتے ہیں۔ اس سے آپ کو ٹینشن کی سوغات ملے گی' جو آپ کو مزید مراعات دلوائے نہ دلوائے یا ترقی کے بالا درجے پر پہنچائے نہ پہنچائے' عالمِ بالا میں بہت جلد پہنچا دے گی۔

کیفین نوشی

تصدیق ہو چکی ہے کہ کافی کی چھ پیالیاں روزانہ پینے سے دل کی بے چینی میں اضافہ ہو جائے گا اور بدنظمیِ قلب واقع ہو سکتی ہے۔ کافی میں مضر شے کیفین ہے جو چائے اور کوکو یا کولا مشروبات میں بھی ہوتی ہے۔ اس لیے ان اشیاء کا بکثرت پینا نہ صرف کیفین' بلکہ سفید چینی یا سفید زہر اپنے جسم میں داخل کرنا ہے' چنانچہ جلد مرنے کے لیے کافی' چائے اور کولا مشروبات بہ کثرت استعمال کریں۔

معالج سے دُور رہیں

اپنے امراض سے بے اعتنائی جلد موت لانے کا باعث ہو سکتی ہے۔ چنانچہ صحت کو خراب کرنے اور اپنے آخر وقت کو جلد قریب لانے کے لیے کبھی بھی معالج سے اپنا معائنہ نہ کرائیں تاکہ آپ کے بلڈ پریشر' شوگر' تفریط تھائرائڈ' مرض کارونری قلب کا بروقت اور قابلِ علاج مرحلے پر پتا نہ چل سکے۔ اگر آپ کے خون میں کولسٹرول زیادہ ہے' تو وہ بھی اس طرح دریافت نہیں کی جا سکے گی اور نہ علاج و پرہیز سے اس کی اصلاح ہو سکے گی' صحت روز بروز خراب ہوگی' پھر موت واقع ہو جائے گی!

اوپر ہم نے نوجوانی میں مرنے کے طریقے بتائے ہیں' کوئی شخص اگر ان میں سے تین عیوب میں بھی گرفتار ہے' تو بے عیب شخص کی بہ نسبت اس

> طبّیہ کالج میں بحث ہو رہی تھی: غذا بدن میں جا کر جزوِ بدن کیسے بنتی ہے؟
> معروف شاعر حکیم خواجہ عشرت لکھنوی نے طلبہ کے قریب جا کر کہا:
>
> حکما کہتے ہیں' ہوتی ہے غذا جُزوِ بدن
> ہم تو تحلیل ہوئے جاتے ہیں' غم کھانے سے
>
> ـــــ ماہنامہ خبرنامہ ہمدرد: نومبر 2012ء

عیب دار شخص میں مرنے کا امکان بتیس گُنا زیادہ ہے اور یہ موت بھی صرف ایک بار نہیں آتی' بلکہ ساری زندگی کو خراب کر کے آتی ہے

کہوں کس سے مَیں کہ کیا ہے' شبِ غم بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا' اگر ایک بار ہوتا

سیدھا راستہ

مندرجہ بالا اعمال و عوامل میں مبتلا رہ کر کوئی بھی شخص اپنی تندرستی کو روگ لگا سکتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے جسم کی تشکیل میں یہ راز مضمر ہے کہ اگر اسے اعتدال سے استعمال کیا جائے تو یہ تندرست رہے گا۔ صحت مند اور تندرست رہنے کے لیے ضروری ہے کہ صحت درست کرنے کے اصولوں پر عمل اور اپنے طبیب سے تعاون کیا جائے۔

ایک طویل اور پُر مسرت زندگی صرف اتفاقیہ حاصل نہیں ہو جاتی۔ اس ضمن میں ان طریقوں کو اختیار کیا جائے' جن سے نہ صرف امراض کا سدِ باب ہوتا ہے بلکہ بحالیِ صحت بھی ہوتی ہے۔ صحت کا مطلب کیا ہے؟ اس سے مراد یہ نہیں کہ آپ نے اپنی زندگی کی چند ساعتیں طبیبوں کی کلینک میں گزار لیں' چند گولیاں حلق سے نیچے اتار لیں' کچھ سُوئیاں جسم میں لگوا لیں۔ صحت صرف اس بات کا نام بھی نہیں کہ آپ کو کہیں درد نہیں ہے یا آپ کو کوئی مرض نہیں ہُوا۔ صحت کے بارے میں عالمی ادارۂ صحت کی یہ تشریح یاد دلانا بے حد ضروری ہے کہ: ''صحت کا احساس ہو اور کوئی مرض و آزار نہ ہو۔''

صحت تندرستی کے اصولوں پر عمل کرنے سے ملے گی' دوا کھانے سے نہیں!!

جسم کی دُنیا

دستی ایکسرے مشین ○ دُنیائے بدن کی سُوپر پاور

معین الحق

قدرت کی بے شمار فیاضیوں میں سے ناخن بھی ایک نعمت اور فطرت کی صناعی کا ایک نمونہ ہیں۔ ناخنوں کی ساخت' ان کی شکل اور رنگت پر غور کیا جائے' تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ناخن کی حیثیت ایک ایسی دستی مشین کی سی ہے جو پورے انسانی جسم کا ایکسرے دکھا دیتی ہے۔

اگر ہماری انگلیاں ناخنوں کے بغیر ہوں' تو ان کے آخری سرے جو نہایت حساس ہوتے ہیں' آئے دن حادثات کی نظر ہوتے رہیں یعنی ناخن نہ ہوں تو نہ صرف ہماری انگلیاں بدنما نظر آئیں بلکہ وہ صحیح طرح کام بھی نہ کر سکیں۔ ہماری انگلیوں کے آخری سروں پر لاتعداد رگوں اور ریشوں کا اجتماع ہے جن کا تعلق اور خصوصی رابطہ باقی جسم سے ہے۔ انگلیوں کے اس حصے میں قدرت نے قوتِ لامسہ یعنی چُھونے کی حِس جیسی نازک شے چھپائی ہے' چنانچہ اس کی حفاظت کے لیے انگلیوں کے باہر والے سروں پر ناخن لگا دیئے ہیں جو دراصل ہمارے جسم کے اندر جھانکنے والی کھڑکیوں کی مانند ہیں اور ان کے مطالعے سے ہم انسانی جبلّت اور خصلت کے متعلق کافی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ ناخنوں کی جو رنگت ہمارے سامنے ہے' وہ ان کی نہیں بلکہ ہمارے جسم کی ہوتی ہے۔ اس رنگت سے ہمیں اپنی صحت کے متعلق اندازہ ہو سکتا ہے۔ اچھے اور تندرست جسم والے انسان کے ناخن نہایت شفاف' چمکیلے اور سرخ رنگ کے ہوتے ہیں۔ اگر ہاتھوں کی جلد اچھی ہو مگر ناخن ذرا بھدے نظر آنے لگیں' تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جسم کے اندر کوئی نہ کوئی خرابی موجود ہے۔ کُھردرے ناخن یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہمارے اعصابی نظام (نروس سسٹم) میں کچھ گڑبڑ ہے۔ مزید غور کے لیے دیکھیں کہ جِلد اور ناخن کی حالت ایک جیسی ہے یا کچھ فرق ہے؟ اگر فرق واضح ہے' تو ضرور کوئی خرابی ہے۔

ناخن بالکل صاف اور شفاف ہونے چاہئیں۔ ان کی رنگت گلابی سرخی مائل اور چمکدار ہونی چاہیے۔ صاف ستھرے ناخنوں کے ریشے بھی ہموار ہوتے ہیں۔ ناخنوں پر کُھردرے پن یا اُبھاروں کی موجودگی سے پتا چلتا ہے کہ ہمارا اعصابی نظام ٹھیک سے کام نہیں کر رہا اور انسان بے چَین زندگی گزار رہا ہے۔ اگر ناخن نالی دار' جھری دار اور کُھردرے ہوں' تو وہ آسانی سے تڑخ کر رفتہ رفتہ انگلیوں سے الگ ہونے لگتے ہیں۔

بعض اوقات ناخنوں پر سفید دھبے نمودار ہو جاتے ہیں۔ شروع شروع میں یہ مدھم ہوتے ہیں' پھر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ان کا نمودار ہونا خطرے کی پہلی گھنٹی ہے جوں جوں خرابی بڑھتی ہے' یہ سفید دھبے بڑے اور نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ناخنوں پر جھریاں یا نالیاں بنتی ہیں۔ اس سے انسان اپنی اندرونی خستہ حالی اور کمزوری سے آگاہ ہوتا ہے۔ جلد ہی ناخن تڑخ کر اُتر جاتے ہیں۔ سفید ناخن جسم میں گرماہٹ کی عدم موجودگی ظاہر کرتے ہیں۔ بلا شبہ ناخن ہمارے جسم کے ہر حصے کا ایکسرے لینے کی مشین ہیں۔ اس مشین کی دل و جان سے حفاظت کیجئے۔

دنیائے بدن کی سُوپر پاور

دماغ انسانی بدن کی دنیا کی واحد سُپر پاور ہے۔ دل کا دھڑکنا' سانس لینا'

کھانا ہضم کرنا' سوچنا سمجھنا' ہنسنا رونا' یہ سب کام قدرت نے دماغ کے اختیار میں دے رکھے ہیں۔اس کا وزن 3 پونڈ ہے اور سائز گریپ فروٹ کے برابر ہوتا ہے۔اوپر کے حصے کا رنگ خاکستری ہوتا ہے اور اندرونی حصے کا رنگ سفید۔باقی اعضا کے خلیات بگڑتے بنتے رہتے ہیں' مگر دماغ کے خلیات کا جو حصہ ایک بار مردہ یا ضائع ہو جائے' وہ نیا نہیں بن سکتا' البتہ یہ ہوتا ہے کہ ایک حصے کا کام کوئی دوسرا حصہ سنبھال لیتا ہے۔جسم کے دوسرے حصوں کی طرح دماغ کی غذا بھی خون ہے۔اس میں اہم چیز آکسیجن ہے۔اگر اسے چند منٹ تک آکسیجن نہ ملے تو اپنا کام جاری نہیں رکھ سکتا اور اس کے حکم پر جسم کے اندر جتنے کام ہو رہے ہیں' وہ سب بند ہو جاتے ہیں۔

اس کا تمام کام اعصاب کے ذریعے سے ہوتا ہے۔اعصاب ان نسوں کو کہتے ہیں جن کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے۔سر سے لے کر ہاتھ پاؤں کی انگلیوں کی پوروں تک بدن کا ہر حصہ اعصاب کے جال کے ذریعے سے دماغ سے جڑا ہوا ہے۔کچھ اعصاب وہ ہیں جو سونگھ کر' دیکھ کر' چکھ کر' سُن کر اور ہاتھ لگا کر کسی بات کا پتا لگاتے ہیں مثلاً کسی گرم چیز کا احساس یا پھسل کر گرنے کا خطرہ۔وہ فوراً یہ خبر دماغ تک پہنچاتے ہیں۔دماغ دوسری قسم کے اعصاب کے ذریعے سے فوراً ہدایات بھیجتا ہے کہ گرم چیز کو ہاتھ نہ لگاؤ یا پھسلنے کا خطرہ ہے تو توازن برقرار رکھو اور ساتھ ہی یہ احتیاط بھی کرو کہ اگر پھسل پڑو تو کسی نازک عضو کو چوٹ نہ لگے۔جسم کا وہ حصہ جہاں اعصاب اپنی حاصل کردہ معلومات پہنچاتے ہیں اور پھر ان کا جواب لاتے ہیں' مرکزی عصبی نظام (سینٹرل نروس سسٹم) کہلاتا ہے۔یہ نظام دماغ اور نُخاع پر مشتمل ہوتا ہے۔نُخاع (حرام مغز) وہ ڈوری ہے جو دماغ سے نکل کر ریڑھ کی ہڈی کے اندر سے گزر کر نیچے تک جاتی ہے۔اس کے علاوہ کچھ اور نظام بھی ہیں مثلاً دل' پھیپھڑا اور معدہ جو ہر وقت خود بہ خود کام کرتے رہتے ہیں۔خود کار عصبی نظام بعض اعضاء کے کام کی رفتار تیز یا کم کرنے کے نظام بھی ہیں۔یہ تمام نظام ایک دوسرے سے کسی نہ کسی طریقے سے جڑے ہوئے ہیں۔دنیا کا بڑے سے بڑا اور بہترین کمپیوٹر بھی دماغ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔کمپیوٹر تو تب چلتا ہے' جب اس میں پروگرام ڈالا جاتا ہے۔دماغ کے اندر تمام پروگرام قدرت نے پہلے سے ڈال رکھے ہیں۔کمپیوٹر تو بور ہوتا ہے نہ آرام کر سکتا ہے' نہ وہ خوش ہو سکتا ہے' نہ ہنس سکتا ہے' نہ اسے غیب سے کوئی نئی بات سوجھتی ہے اور نہ ایجاد کر سکتا ہے' مگر دماغ یہ تمام کام کر سکتا ہے۔ماہرین کو اس وقت تک صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ دماغ کا بایاں حصہ بدن کے دائیں حصے کو کنٹرول کرتا ہے اور دایاں حصہ بدن کے بائیں حصے کو کنٹرول کرتا ہے۔دایاں حصہ پہچان (تمیز)' سوچ (خیال) اور قوتِ فیصلہ کو کنٹرول کرتا ہے۔انسان سو جائے تو بھی دماغ کام کر رہا ہوتا ہے۔ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ انسان اپنے دماغ سے صرف پندرہ فی صد کام لیتا ہے۔دماغ پر کئی بیماریاں حملہ کرتی ہیں۔کبھی کسی زہریلی چیز کے اثر سے اندر رسولی پیدا ہو جاتی ہے۔اگر آپریشن سے اس کا نکالنا ممکن ہو تو اسے نکال دیا جاتا ہے۔دماغ کی ایک بیماری کو الزائمر کہتے ہیں۔عام طور پر یہ 60 سال سے زیادہ عمر کے لوگوں کو ہو سکتی ہے۔پہلے ان کی یادداشت خراب ہوتی ہے' پھر وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ جوتے کا تسمہ کیسے باندھا جائے' گاڑی کیسے چلائی جائے' کھانا کیسے کھایا جائے۔اس مرض کی اصل وجہ معلوم نہیں' لیکن یہ ہوتا بڑھاپے میں ہے۔کچھ نفسیاتی بیماریوں کا تعلق بھی دماغ سے ہے۔مثلاً خواہ مخواہ کا وہم' خوف' پریشانی' غیب سے آوازوں کا سنائی دینا' یا سمجھنا کہ کوئی میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔اللہ کریم کرم فرمائے!

جہانِ نَو

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب!
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملّت کا شباب!

— اقبالؒ

عالَمِ خواب میں علامہ اقبالؒ سے مکالمہ

نسٹیئن: فضیلت مآب، حکیم الامت، نسٹ میں خوش آمدید! آج 9 نومبر کو ہم یہاں آپ کا ایک سو پینتیسواں یومِ ولادت منا رہے ہیں۔ ہماری خوش بختی کہ آپ ہم میں موجود ہیں!

علامہ اقبالؒ:

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

نسٹیئن: نوجوان نسل احوالِ حاضرہ سے مایوس و غمناک ہے۔ آپ کو اپنے درمیان پا کر شمعِ امید جل اُٹھی ہے، اُن کے دلوں میں

علامہ اقبالؒ:

غمیں نہ ہو کہ بہت دَور ہیں ابھی باقی
نئے ستاروں سے خالی نہیں سپہرِ کبُود

نسٹیئن: لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے...

علامہ اقبالؒ:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز میں ہے زندگی کا سوزِ دَرُوں
شَرَف میں بڑھ کے ثرّیا سے مُشتِ خاک اس کی
کہ ہر شَرَف ہے اسی دُرج کا درِ مکنوں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی، لیکن
اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

نسٹیئن: بعض اربابِ نظر اس حوالے سے اعتراضات کرتے ہیں کہ...

علامہ اقبالؒ: (بات کاٹ کر)

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نا زن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بے گانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

نسٹیئن: علامہ محترم! تو پھر کچھ علاج اس کا؟

علامہ اقبالؒ:

اِک زندہ حقیقت مرے سینے میں ہے مستور
کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نے پردہ، نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہُوا زرد

نسٹیئن: فلسفۂ خودی کے بارے میں کچھ ارشاد فرمائیں گے کہ ہر عہد اور ہر نسل میں یہ زیرِ بحث رہا!

علامہ اقبالؒ:

خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے؟ بیداریٔ کائنات

نسٹیئن: کچھ نظریۂ زندگی کے متعلق!

علامہ اقبالؒ:

بَرتَر از اندیشۂ سُود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

تُو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

نسٹیئن: آپ کا طریقِ زندگی؟

علامہ اقبالؒ:

مِرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

نسٹیئن: جنابِ محترم! آپ نے بار بار فقر کا ذکر فرمایا اپنی تحریر و تقریر میں، براہِ کرم اس کے فیوض و برکات پر روشنی ڈال دیجئے

علامہ اقبالؒ:

ہمّت ہے اگر تو ڈھونڈ وہ فقر
جس فقر کی اصل ہے حجازی[1]

اس فقر سے آدمی میں پیدا
اللہ کی شانِ بے نیازی

یہ فقرِ غیّور جس نے پایا
بے تیغ و سناں ہے مردِ غازی

نسٹیئن: لیکن علامہ محترم! مسلمانوں نے یہ میراثِ فقر کھو کر...

علامہ اقبالؒ: (بات کاٹ کر)

یہ فقر مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولتِ سلمانؓ و سلیمانؑ

نسٹیئن: علامہ محترم! فنونِ لطیفہ کے حوالے سے کچھ ارشاد فرمایئے!

علامہ اقبالؒ:

سَرُود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر
گُہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ

ضمیرِ بندۂ خاکی سے ہے نمود اُن کی
بلند تر ہے ستاروں سے اُن کا کاشانہ

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

ہوئی ہے زیرِ فلک اُمتوں کی رُسوائی
خودی سے جب ادب و فن ہوئے ہیں بیگانہ

نسٹیئن: جنابِ محترم! کمیونزم کی رُسوائی و تباہی کے بعد سیکولرازم، لبرل ازم اور دین و سیاست کو جدا جدا کروانے کا دھندا اپنا لیا ہے ایک گروہ نے ...

علامہ اقبالؒ: (بات کاٹ کر)

ہوئی دین و ملّت میں جس دم جدائی
ہَوَس کی امیری ہَوَس کی وزیری

دوئی ملک و دیں کے لئے نا مُرادی
دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری

یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیںؐ کا
بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری

اسی میں حفاظت ہے انسانیّت کی
کہ ہوں ایک جُنیدیؒ و اردشیری

1۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عاداتِ پاک کے مطابق

نسٹیئن: ایک دُنیا آج مسلمانوں کو مٹانے کے درپے ہے' ان حالات...

علامہ اقبالؒ:

مِٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیمؑ و خلیلؑ

اس کی زمیں بے حدود' اس کا اُفق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج' دجلہ و دنیوب و نیل

نسٹیئن: حکیم الامت! ملتِ اسلامیہ امراض اور مصائب میں گھری ہے' اسباب کیا ہیں آپ کے خیال میں؟

علامہ اقبالؒ:

سخت باریک ہیں امراضِ امم کے اسباب
کھول کر کہیے تو کرتا ہے بیاں کوتاہی

دینِ شیری میں غلاموں کے امام اور شیوخ
دیکھتے ہیں فقط اِک فلسفۂ روباہی

ہو اگر قوّتِ فرعون کی در پردہ مرید
قوم کے حق میں ہے تہمت وہ کلیم الّلہی

نسٹیئن: علامہ محترم! اس کا علاج بھی تو تجویز فرما دیجئے!

علامہ اقبالؒ:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دَہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے

نسٹیئن: کشمیریوں کی تحریکِ آزادی کے حوالے سے کچھ فرمائیں گے جہاں جبر اور صبر کے مقابلے کی نئی تاریخ لکھی جا رہی ہے!

علامہ اقبالؒ:

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو
تھرتھراتا ہے جہانِ چار سُوئے رنگ و بُو

نسٹیئن: علامہ محترم! بھارت نواز حلقے دعویٰ کرتے ہیں کہ کشمیریوں کو کسی عالمی طاقت کی پشت پناہی حاصل نہیں' اس لیے وہ بہت زیادہ دیر تک...

علامہ اقبالؒ: (جلالی انداز میں)

خود آگاہی نے سکھلا دی ہے جس کو تن فراموشی
حرام آئی ہے اُس مردِ مجاہد پر زِرہ پوشی

نسٹیئن: مغربی کلچر کو لوگوں نے تہذیبِ حاضر سمجھ لیا ہے...

علامہ اقبالؒ: (بات کاٹ کر)

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تدبّر کی بِنا سرمایہ داری ہے

نسٹیئن: اپنے فلسفۂ عشق کی تعبیر سے تو نوازیئے!

علامہ اقبالؒ:

عشق دمِ جبرئیلؑ، عشق دلِ مصطفیٰؐ
عشق خدا کا رسولؐ، عشق خدا کا کلام

عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابنُ السّبیل، اس کے ہزاروں مقام

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

نسٹیئن: بے یقینی' بے سکونی اور خوف کا جو جہنم دہک رہا ہے یہاں...

علامہ اقبالؒ: (آہ بھر کر)

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر
از نبیؐ تعلیمِ لَاتَحْزَن بگیر

گر خدا داری زغم آزاد شو
ازخیالِ بیش و کم آزاد شو

قوتِ ایماں حیات افزا یدت
وردِ لا خوف علیہم[1] با یدت

بیمِ غیر اللہ عمل را دشمن است
کاروانِ زندگی را رہزن است

ہر کہ رمزِ مصطفیٰؐ فہمیدہ است
شرک را در خوفِ مضمر دیدہ است

[خود کو غم کے قید خانے میں قید کرنے والو! غارِ ثور میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو دیے جانے والے نبویؐ سبق لاتحزن ان اللہ معنا (ڈرو نہیں، غم نہ کرو اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے) کو قلب و ذہن میں سمو لو۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو تو کمی بیشی یا نفع نقصان کی اُدھیڑ بُن، رنج والم اور خوف و بے یقینی میں مبتلا رہنا چھوڑ دو۔ ایمان کی قوت تمہاری عمر میں اضافہ کرے گی، لا خوف علیہم کا وِرد کرتے رہا کرو۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی فرد، کسی شے کا ڈر ترقی کے دشمن اور زندگی کے قافلے کو لُوٹ لینے والے کی مانند ہے۔ جو بھی آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول و فعل سے بخوبی آگاہ ہے، وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا ڈر یا خوف شرک کا دوسرا نام ہے]

نسٹیئن: علامہ محترم! نسٹ کے طلبہ کو کوئی نصیحت؟

علامہ اقبالؒ:

جو عالَمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد
ہر دَور میں کرتا ہے طواف اُس کا زمانہ

نسٹیئن: ''صاحبِ ایجاد'' کی منزل پر پہنچنے کا راستہ؟

علامہ اقبالؒ:

ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خداداد
کوشش سے کہاں مردِ ہنرمند ہے آزاد

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کُھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

نسٹیئن: علامہ محترم! آپ عمر بھر بارگاہِ ربّ العزت میں اُمّتِ مسلمہ کے لئے دُعا گو رہے، سوال تو ذاتی سا ہے، بمہربانی بتایئے خود اپنے لئے کیا التجا کرتے ہیں، دعا کرتے ہیں اپنے ربّ سے؟

علامہ اقبالؒ:

تُو غنی از ہر دو عالَم مَن فقیر
روزِ محشر عذر ہائے مَن پذیر

تُو اگر بینی حسابَم ناگزیر
از نگاہِ مصطفیٰؐ پنہاں بگیر

[ربِّ ذوالجلال! تُو سارے جہانوں کا خالق و مالک و مختار ہے اور مَیں ہُوں اِک بے بس فقیر۔ روزِ قیامت میرے عذر قبول فرما لینا، حساب نہ لینا۔ اگر یہ اشد ضروری ہو، تو میرے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اوجھل رکھ کر میرا حساب لینا کہ آقاؐ کے سامنے شرمساری برداشت نہ کر سکوں گا]

نسٹیئن: حکیم الامت! پاکستانیوں کے لئے حرفِ دعا!

علامہ اقبالؒ:

بجلالِ تو کہ در دِل دِگر آرزو ندارم
بجُز اِیں دعا کہ بخشی بہ کبوتراں عُقابی

[یاربِّ رحیم! مجھے تیرے جلال کی قسم، میرے دل میں اس کے سوا کوئی آرزو نہیں کہ تو اِن کبوتروں کو عقابی شان عطا فرما دے]

1۔ سُن لو! جو اللہ کے دوست ہیں اُن کو نہ ڈر خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے (سورۂ یونس۔ آیت:62)

نسٹیئن بیاض

اب کے برس بھی نسٹیئنز نے نسٹیئن بیاض کے لئے اپنے پسندیدہ اشعار بھجوائے۔ جن اشعار کے ساتھ شاعر کا نام نہیں تھا اور ہمیں بھی معلوم نہ ہو سکا' وہ بیاض میں شامل نہیں ہیں۔ کئی نسٹیئنز نے اپنے نام نہیں بھجوائے شاید اس خوف سے کہ — شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے! یہ نسٹیئن کا مستقل سلسلہ ہے۔ نئی نسٹیئن بیاض کے لئے اپنے پسندیدہ اشعار ابھی سے بھجوا دیجئے

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا؟ لوح و قلم تیرے ہیں
(علامہ اقبالؒ)

توکّل اُن کا اُنہیں مبارک' مِرا عقیدہ ذرا جُدا ہے
نہیں ہے عزم و عمل' تو جائز نہیں دعا و اثر کی باتیں
(پروفیسر محمد منوّر)

روزِ محشر حساب کیا لے گا
جو مجھے بے حساب دیتا ہے!
(احسان شاہد)

بہت چھوٹے ہیں مجھ سے میرے دشمن
جو میرا دوست جل جلالہ ہے' سب سے بڑا ہے
(اطہر نفیس)

آپس میں اختلاف تھا اُن میں بہت' مگر
انجم مِرے خلاف سبھی یک زباں ہوئے
(انجم رومانی)

ان اندھیروں میں بھی منزل تک پہنچ سکتے ہیں ہم
جگنوؤں کو راستہ تو یاد ہونا چاہیے
(عطاء الحق قاسمی)

اِک معصوم سحر آئینہ فطرت کی تسخیروں کا
چڑیوں کی چہکار خلاصہ حمد کی سب تفسیروں کا
(محمد اجمل نیازی)

اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ
جس دیئے میں جان ہو گی' وہ دیا رہ جائے گا
(محشر بدایونی)

یہ ریشم' یہ لباسِ حکمرانی جل اُٹھے گا
وہ ظلمت ہے کہ آخر کار پانی جل اُٹھے گا
(محمد اظہار الحق)

اس سے بڑھ کر اور کیا ہم پر ستم ہو گا منیر
مشورہ مانگا ہے اُس نے فیصلہ کرنے کے بعد
(ڈاکٹر بدر منیر)

اِک ذرا کرو ہمّت ' دُنیا بھر کے مظلومو!
ظالموں میں دیکھا ہے' حوصلے نہیں ہوتے
(احسان شاہد)

بے نام دیاروں کا سفر کیسا لگا ہے
اب لَوٹ کے آئے ہو تو گھر کیسا لگا ہے؟
(شفیق سلیمی)

شاید کسی مقام پہ مَیں کام آ سکوں
مجھ کو بھی ساتھ لیجئے، تنہا نہ جایئے
(ناصر زیدی)

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مِرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہَوا دینے لگے
(ثاقب لکھنوی)

بے تابیاں سمیٹ کے سارے جہان کی
جب کُچھ نہ بَن سکا تو مِرا دل بنا دیا
(نجمی نگینوی)

پیغام مِلا ہے ہمیں خوشبو کی زبانی
چلنے کا ارادہ ہو تو ٹھہرا نہیں کرتے
(ڈاکٹر نثار ترابی)

پُھول پیدا ہوں مگر شاخوں کی آرائش رہیں
بیٹیاں پیدا ہوں مولا! تتلیاں پیدا نہ ہوں

آبگینوں میں حمیّت کی لگن باقی رہے
عصمت و عفّت کی دشمن بیبیاں پیدا نہ ہوں

بس کہ اس مصرعہ میں مضمر ہے مکمل داستاں
روزناموں کے لئے شہ سُرخیاں پیدا نہ ہوں!
(شورش کاشمیری)

جِس کی بنیاد پہ نفرت کا نہ سایا جائے
شہر اِک ایسا محبت کا بسایا جائے
(حُسین سحر)

جو دل موہ لینے کا ڈھب جانتے ہیں
وہ ترکیب ورکیب سب جانتے ہیں
(آغا حشر کاشمیری)

جو مفلسی کے دنوں میں بچھڑ گیا مجھ سے
اُسے تلاش کروں گا مَیں نوکری کی طرح
(سلیم کوثر)

جِن سے مِل کر زندگی سے عشق ہو جائے، وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں، مگر ایسے بھی ہیں
(سرور بارہ بنکوی)

جُھک کر سلام کرنے میں کیا حرج ہے، مگر
سَر اِتنا مت جُھکاؤ کہ دستار گر پڑے
(اقبال عظیم)

لیتے ہیں ثمر شاخِ ثمرور کو جُھکا کر
جُھکتے ہیں سخی وقتِ کرم اور زیادہ
(ذوق)

چراغِ آخرِ شب! اس قدر اُداس نہ ہو
کہ تیرے بعد اندھیرا نہیں، اُجالا ہے
(انعام اللہ خاں یقیں)

چاہت کا جب مزہ ہے کہ وہ بھی ہوں بے قرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی
(ظہیر الدین ظہیر)

حادثے سے بڑا حادثہ یہ ہُوا
لوگ ٹھہرے نہیں حادثہ دیکھ کر
(عنائت علی خان)

خنجر چلے کسی پہ، تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے
(امیر مینائی)

خوش نصیبی میں ہے یہی اِک عیب
بدنصیبوں کے گھر نہیں آتی
(روحی کنجاہی)

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ دوست
جب ذرا گردن جُھکائی ' دیکھ لی
(جلیل مانک پوری)

دکھائے پانچ عالَم' اِک پیامِ شوق نے مجھ کو
اُلجھنا' رُوٹھنا' لڑنا' بگڑنا' دُور ہو جانا
(نُوح ناروی)

دبا کے قبر میں سب چل دیئے' دعا نہ سلام
ذرا سی دیر میں کیا ہو گیا' زمانے کو
(قمر جلالوی)

مُٹھّیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے
(ثاقب لکھنوی)

کسی کے منہ سے نہ نکلا ہمارے دفن کے وقت
کہ اِن پہ خاک نہ ڈالو' یہ ہیں نہائے ہوئے
(امداد علی بحر)

دل تو میرا اُداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے
(ناصر کاظمی)

دمِ رخصت وہ چُپ رہے عابد
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل
(سیّد عابد علی عابد)

دعویٰ بہت بڑا ہے ریاضی میں آپ کو
طُولِ شَبِ فِراق ذرا ناپ دیجئے
(اکبر الہ آبادی)

طُولِ شبِ فِراق جو ہم ناپنے لگے
نکلا وہ اُن کی زُلف سے دو چار ہاتھ کم
(بخش جارچوی)

ظاہر کی بڑائی کوئی معنی نہیں رکھتی
دراصل بڑا وہ ہے' جو اندر سے بڑا ہو
(انعام الحق جاوید)

دل کو کسی کی یاد سے خالی نہ کیجئے
آسیب رہنے لگتے ہیں خالی مکان میں
(محمد احمد علوی)

دشمنِ دل ہی نہیں' دشمنِ جاں ہوتا ہے
اُف! وہ احساس جو پیری میں جواں ہوتا ہے
(بشیر دُرانی)

دوستوں کی آپس میں' دشمنی نہیں ہوتی
دوستوں کی آپس میں رنجشیں تو ہوتی ہیں
(عائشہ محمود)

عداوتیں جو کسی کی عدُو سے ختم ہوئیں
جہاں کہیں بھی ہوئیں' گفتگو سے ختم ہوئیں
(ریاض قدیر)

مسئلہ دونوں کا ہے' طے بھی کریں گے دونوں
شہر کو بیچ میں آنے کی ضرورت کیا ہے
(ریحانہ قمر)

لڑائی تیرا میرا مسئلہ تھا
زمانہ درمیاں کیوں آ گیا ہے
(اظہر ناسک)

روز آپس میں لڑا کرتے ہیں اربابِ خِرد
کوئی دیوانہ اُلجھتا نہیں ' دیوانے سے
(انور صابری)

سیف اندازِ بیاں رنگ بدل دیتا ہے
ورنہ دُنیا میں کوئی بات ' نئی بات نہیں
(سیف الدین سیف)

کھلنڈرا سا کوئی بچہ ہے دریا
سمندر تک اُچھلتا جا رہا ہے
(نجیب احمد)

سیرت نہ ہو تو عارض و رخسار سب غلَط
خوشبو اُڑی تو پھول فقَط رنگ رہ گیا
(ظہیر کاشمیری)

طلَب جو ہو بھی تو ہم ہونٹ بند رکھتے ہیں
کہ ہم اَنَا کا علَم سربلند رکھتے ہیں
(جمشید مسرور)

غیر سے رکھنا پڑا مجبور ہو کر واسطہ
تم ہمارے دل میں ہو، دشمن تمہارے دل میں ہے
(قمر جلالوی)

کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرتِ انسان پر
فعلِ بد تو خود کرے، لعنت کرے شیطان پر
(انشاءاللہ خاں)

کچھ لوگ جو سوار ہیں کاغذ کی ناؤ پر
تُہمت تراشتے ہیں، ہَوا کے دباؤ پر
(احسان دانش)

مِرے بچّوں کے آنسو پونچھ لینا
لفافے کا ٹکٹ جاری نہ کرنا
(وسیم بریلوی)

کی محبت تو سیاست کا چلن چھوڑ دیا
ہم اگر پیار نہ کرتے تو حکومت کرتے
(علی ظہیر منہاس)

کہہ رہا ہے جوشِ دریا سے سمندر کا سکُوت
جتنا جس کا ظرف ہے، اتنا ہی وہ خاموش ہے
(ناطق لکھنوی)

کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا
(غلام محمد قاصر)

گلشن پرست ہُوں، فقَط گُل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہُوں مَیں
(جگر مرادآبادی)

مِرے خیال میں آنا کبھی کبھی تیرا
مِری طلب کو بڑھاتا ہے، کم نہیں کرتا
(آغا شاعر)

لوگوں نے احتجاج کی خاطر اُٹھائے ہاتھ
اُس نے کہا کہ فیصلہ منظور ہو گیا!
(جلیل عالی)

محبت بھی ہُوا کرتی ہے، دل بھی دل سے مِلتا ہے
یہ سب ہوتا ہے، لیکن آدمی مُشکل سے مِلتا ہے
(وحیداللہ آبادی)

وہ جاں بہ لب تھا، پھر بھی اصولوں پہ اَڑ گیا
بجھتا ہُوا چراغ ہواؤں سے لڑ گیا
(محمد نقوی)

مرہم کا نام لے کے نہ زخموں کو چھیڑیئے
مرہم بھلا کہاں سے نمکداں میں آ گیا
(حنیف اخگر)

پہنچے جو بارگاہِ رسولِ امیںؐ میں تو
کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از سلام

ہم پر کرم کیا ہے خدائے غیور نے
پورے ہوئے جو وعدے کیے تھے حضور
(علامہ اقبالؒ)

اظہارِ تعلق

اُسامہ حسن

اردو

ہم ایک عمر سے آپ کے لئے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ کبھی نظر سے نظر ملے تو آپ سے عرض کریں کہ آپ کے بغیر ہم ایسے ہیں جیسے صحرا میں جُھلستا درخت، جیسے خزاں رسیدہ پتّے، جیسے جُون کی چلچلاتی دھوپ میں گرم اور بے مزا ہوا جیسے... جیسے... جیسے ماہیِ بے آب، ایصالِ ثواب، عشقِ غالب، اِک نظرِ کرم کیجئے۔

خیر طلب: اسداللہ غالب

کیمسٹری

ہمارے لہو کے تمام ''ذرات'' کے سبھی ''اجزا'' آپ کی یاد سے کمپاؤنڈ ہیں، ہماری رگ رگ میں آپ کی یادوں کے ''کیمیکل'' شامل ہیں۔ دن ہیں کہ گزرتے نہیں، یوں عذاب میں ہیں جیسے شورے کا تیزاب، راتیں سلفیورک ایسڈ سے زیادہ جُھلسا دینے والی۔ اب بھی اگر آپ کی دھڑکنوں میں ہماری دھڑکنیں یوں شامل نہ ہوں جیسے آکسیجن کے ساتھ ہائیڈروجن مِل کر پانی، جس سے مداری لوگ پٹرول کے بغیر گاڑی چلانے کا تماشہ دکھا رہے ہیں، تو ہم اس طرح گھائل ہو جائیں گے جیسے گیس بناتے ہوئے سلنڈر رہی پھٹ جائے اور گیس بننے سے پہلے ہی ضائع ہو جائے۔ رحم کیجئے، ایک تیزابی نظر کیجئے۔

طالبِ دعا: ابنِ جابر بن حیان

فزکس

ہمارے دل کی کشش آپ کے دل تک کب رسائی حاصل کرے گی۔ ہماری دھڑکنوں کی سپیڈ آپ کو دیکھتے ہی آواز کی رفتار جیسی ہو جاتی ہے۔ ہمارے جسم کے سبھی ایٹم، روح کے سارے عناصر، آپ کی یاد میں ڈبل فریکوئنسی سے چلتے پوٹینشل توانائی والے انجن کی طرح بے تاب ہیں۔ اللہ کے لئے روشنی کی سپیڈ سے ہماری جانب چلے آیئے۔

دعاجو: فقیر ابن الہیثم

بائیالوجی

دل کے چاروں خانوں میں آپ کے لئے خلوص و محبت کے زمزمے بہہ رہے ہیں۔ روح کے سبھی خلیے، جسم کے سب ٹشوز آپ کی یاد سے معطّر ہیں۔ ہماری زندگی میں آپ یوں ضروری ہیں جیسے بائیالوجی میں ڈارون کا نظریہ۔

مخلص: ابنِ رازی

اسلامیات

ہماری نظر جب کسی نامحرم پر پڑتی ہے تو ہم استغفر اللہ کا ورد کرتے ہیں مگر آپ کے معاملے میں ہم اللہ سے معافی کے طلب گار ہیں۔ ہم آپ کو دیکھتے ہیں تو دعا کرتے ہیں کہ خدا شرعی طریقے سے آپ کو ہمارا بنا دے کیونکہ ہم روایتی محبت میں گرفتار ہو کر گناہِ کبیرہ والوں کے زمرے میں آ کر جنت سے محرومی اور دوزخ کا ایندھن بننے سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

خیر خواہ: اللہ والا

جغرافیہ

ہمارے دل کے نقشے میں دریا صحرا' وادی' پہاڑ ہو یا میدان ہر طرف آپ کی یادوں کی گنجانی ہے۔ ہمارے دل کی ندّیاں' پگڈنڈیاں اور سڑکیں آپ کے دل تک جا کر ختم ہو جاتی ہیں۔ ہمارے دل وجاں کے حدود اربعہ میں آپ ہی کی حکمرانی ہے۔ آیئے! البیرونی کی طرح ہمارے دل کی راجدھانی میں سیاحت کیجئے۔

منتظر: ابنِ بطوطہ

کمپیوٹر

ہیلو! ہمارے دل کے کمپیوٹر میں آپ کی یاد کی ہارڈ ڈسک لگی ہے۔ میموری آپ ہی کے خیالات سے فل سپیڈ سے چل رہی ہے' اس سے پہلے کہ آپ کی یادوں کا وائرس اس سارے ڈیٹا کو ناکارہ کر دے' آپ سے گزارش ہے کہ ہمارے دل کے نیٹ کا کنکشن اپنے دل سے کنیکٹ کر دیجئے تا کہ سسٹم فُل سپیڈ سے پرفارم کر سکے۔ کوئی e-mail ہی کر دیجئے... نظر سے!

گڈ نائٹ: ایکس

میٹھے میٹکس

احسن جعفری

یارو ہمیں ریاضی نے عجب درد دیا ہے
وہ درد کہ جس کی نہ دوا ہے' نہ جزا ہے

آرام سے ہیں حضرتِ نیوٹن تو تہِ خاک
یاں ذہن کے ہر گوشے میں طوفان بپا ہے

بس رُول نہیں باعثِ بربادیٔ دل اب
لیگ[1] رینج کو دیکھو تو وہ اس سے بھی سِوا ہے

ٹیلر[2] ہی کو ٹھہرائیں نہ کیوں موردِ الزام
لیبنیز[3] کے تھیورم ہی نے کیا کچھ نہ کِیا ہے

اک یہ تو نہیں' اور بھی ہیں جان کے لاگو
بُولر[4] کا تھیورم تو عجب طُرفہ بلا ہے

ایلفا[5] بھی ہے' بیٹا[6] بھی ہے' تھیٹا[7] بھی ہے یارو
اومیگا[8] بھی' آئیوٹا[9] بھی' ڈیلٹا[10] بھی کھڑا ہے

یہ سائی[11] ہے وہ فائی[12] ہے یہ ایٹا[13]' وہ گیما[14]
ہر کام پہ الفاظ کا ایک مجمع لگا ہے

دیکھا جو گرفتارِ طلسماتِ ریاضی
دردِ غمِ محبوب بھی دل چھوڑ گیا ہے

بدتر ہے شبِ ہجر سے یہ وصلِ ریاضی
جس لفظ کو دیکھو وہ خمِ زلف بنا ہے

اب اس کی دوا ڈھونڈنا ہے کوششِ بے سُود
ہم نے تو زہر اپنے ہی ہاتھوں سے پیا ہے

''مجبوری و دعویٔ گرفتاریٔ الفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے''

(دعا گو: ریاضی داں)

1-Lagrange 2-Taylor 3-Leibnitz`s Theorem 4- Euler`s Theorem 5-Alpha 6-Beta 7-Theta 8-Omega 9-Iota 10-Delta 11-Psi 12-Phi 13-Eta 14-Gamma

معذرت کے ساتھ

مرزا غالب کے عقیدت مند ایک نسٹیئن کی جسارت

نہ اِدھر کے رہے

ایماں مجھے روکے ہے، تو کھینچے ہے مُجھے کفر
مسٹر مِرے پیچھے ہے، تو مُلّا مِرے آگے

فلمیریا

فلم نے غالب نکّما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

چھٹیاں

منحصر چھٹیوں پہ ہو جن کی اُمید
نا اُمیدی اُن کی دیکھا چاہئے

مفت کی ڈگری

مفت مل جائے گی اس سال تو ڈگری ہم کو
اِک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

بیچ بچاؤ

سگِ شہر سے اُلجھتا، تو پھر آج مَیں نہ بچتا
وہیں ایڑیاں رگڑتا، نہ اگر فرار ہوتا

حلوہ و شکم

حلوۂ مفت نظر ہُوں، مِری قیمت یہ ہے
کہ رہے مردِ شکم دار پہ احسان مِرا

بنام اہلِ نظر

مَیں بھی پاکٹ میں نوٹ رکھتا ہُوں
کاش پوچھو کہ مدّعا کیا ہے!

کر بھلا

سو پُشت سے ہے پیشۂ آبا گداگری
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

پی آر

یہ ہم نے گیٹ کیپر سے کہا، سُن
ہیں ریکٹر کے ، ہمارا پوچھنا کیا

الوداعیہ

کبھی تھپڑ، کبھی چانٹا، کبھی ڈنڈا، کبھی جُوتی
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

آپ کا کیا خیال ہے

سامی مفتی

یونان کے میلے میں ایک مصّور نے انگوروں کا خوشہ بنایا جسے انسانی ہاتھ نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ انگور اصل سے اس قدر مماثل تھے کہ پرندے ان پر چونچ مارنے کے لیے بار بار آ رہے تھے۔

یونان میں اس شاہکار کے چرچے ہو گئے۔

دوسرے دن ایک شخص نے اس شاہکار کو یہ کہہ کر باطل قرار دیا کہ اس تصویر میں بہت بڑا عیب یہ ہے کہ ہاتھ نقلی ہے۔ پرندوں نے نقلی ہاتھ کو پہچان لیا' اگر ہاتھ اصل ہوتا تو پرندے کبھی بھی انگور پر چونچ نہ مارتے۔ جو مصّور اصل انگور بنا سکتا تھا' وہ اصل ہاتھ کیوں نہ بنا سکا۔

ایک اور نقاد بولے کہ مصّور نے تضادات کے ذریعے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ نقلی ہاتھ اس مہارت سے بنایا کہ پرندے اس کی حقیقت سے واقف ہو گئے' حالاں کہ انسانی آنکھ بھی بہ ظاہر اس ہاتھ کو اصل سمجھ رہی ہے۔ اگر پرندوں کے لیے اصل ہاتھ جیسا ہاتھ بنایا جاتا تو لوگ انگوروں پر چونچیں مارنے کے منظر سے محروم رہتے۔ نقلی انگور اس کمال سے بنے کہ پرندوں نے اس پر نقلی ہونے کے باوجود اصل کا گمان کیا۔ یہی پرندے نقلی ہاتھ کو پہچان گئے' جبکہ انسانوں نے ہاتھ بھی اصل کے مماثل جانا۔ مصّور نے اس فن پارے کے ذریعے یہ بھی بتایا کہ پرندوں کی حِسّی صلاحیتیں انسانوں سے نصف بہتر ہوتی ہیں۔

ایک اور ناقد نے کہا کہ ہاتھ اور انگور' دونوں اصل سے مشابہ ہیں۔ اس شاہکار میں کوئی عیب یا نقص نہیں ہے۔ پرندوں نے یونان میں کبھی اتنے خوبصورت اور رسیلے انگور نہیں دیکھے' اس لیے وہ انسانی ہاتھ کو اصل جانتے ہوئے بھی اپنی جان پر کھیل کر ان انگوروں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

لوگ اس پر اَش اَش کر اُٹھے۔

پھر ایک نئے محقق نئی توضیع لائے۔ کہا کہ بہ ظاہر ہاتھ بھی اصل ہے اور انگور بھی' لیکن پرندوں نے چند پروازوں کے بعد اندازہ کر لیا کہ مصّور نے ہمیں انسانی ہاتھ کے ذریعے خوف زدہ کرنے کی کوشش کی۔ جو پرندے ہمّت کر کے ان جعلی انگوروں تک پہنچ گئے' مصّور نے اُن کو دھوکہ دیا کیونکہ انگور نقلی ہیں۔ اس لئے اب پرندے مسلسل غصے میں انگوروں کے خوشوں پر چونچیں مار رہے ہیں۔

اس پر ایک اور ماہرِ فن کا تبصرہ آیا کہ اگر پرندوں نے انسان کے دھوکے کو پہچان لیا' تو پھر ان کو چاہیے تھا کہ وہ انسانی ہاتھ پر انتقاماً چونچیں مارتے' انگوروں پر نہیں۔

ایک اور ہُنر وَر نے کہا کہ انسانی ہاتھ بالکل مُردہ نظر آتا ہے' لہٰذا پرندے مُردہ ہاتھ پر چونچ نہیں مارتے۔ انگوروں میں زندگی کے آثار نظر آتے ہیں' اس لئے وہ انگوروں پر چونچیں مار رہے ہیں۔ دھوکہ معلوم ہونے کے بعد بھی پرندے دھوکہ کھا رہے ہیں۔ یہی اس فن پارے کا کمال ہے۔

غرض جتنے منہ اتنی باتیں!

نسٹیئن بھائی اور بہنو! آپ کا کیا خیال ہے بیچ اس مسئلہ کے؟

[آپ کا تبصرہ نسٹیئن کے آئندہ شمارے میں آپ کے نام کے ساتھ شائع ہوگا۔ ایڈیٹر]

نسٹیئن کے حوالے سے اپنے تنقیدی تاثرات اور نسٹ کے کسی بھی پہلو سے متعلق تعمیری تجاویز ہمیں دیں یا اس پتے پر بھجوائیں
nustian@nust.edu.pk

نسٹیئن 2011ء (صفحہ 208) میں ہماری دعوت پر نسٹیئنز نے یہ تجاویز اور مشورے، مطالبے، شکائتیں نسٹیئن پوسٹ کو بھجوائے۔ مشیروں کے نام مشوروں کے اختتام پر!

- کنکارڈیا وَن کی دو کینو پیز میں سے ایک کو لڑکوں اور دوسری کو لڑکیوں کی جائے نماز بنائیے۔ جالی دار جنگلے لگا کر موسم کی شدّت سے بچا جا سکتا ہے
- سکولوں میں گرلز کامن روم بنائے جائیں
- بے ہنگم اور مضحکہ خیز لباس کی خطرناک بیماری کے موثر علاج کے لئے یونیفارم لازمی قرار دیجئے
- کیفے میں گُو پن اور کھانا لینے اور کھانا کھانے کی خاطر طالبات کے لئے الگ کاؤنٹر اور الگ جائے طعام بنوائیے
- ہر چار ماہ بعد مزاحیہ مشاعرہ ہونا چاہئے
- گرلز ہاسٹلز میں female staff تعینات کیجئے
- گرلز ہاسٹلز میں اَمّیوں اور بہنوں کے ایک آدھ دن یا رات ٹھہرنے کے لئے چند کمرے مخصوص کیجئے
- ششماہی جاب فیئرز کا اہتمام کیجئے
- Relative Grading ختم کرائیے
- طلبہ کی تعداد کنٹرول کیجئے، پروگرامز کے ساتھ ساتھ کلاس رومز بھی بڑھائیے
- دیر تک کلاسز طلبہ، والدین کیلئے پریشانی اور ناگفتنی معاملات کی جڑ ہیں
- نئی عمارات بنانے کے لئے پہاڑیوں کو تیشۂ فرہاد سے بچایا جائے
- کیفے ون، خصوصاً چھت اندھیروں میں کیوں ڈوبا رہتا ہے
- پوسٹ آفس شایانِ شان نہیں تو کارگو سروس کا آفس ہی کُھلوا دیجئے
- گندے، میلے کچلے لباس، بے ترتیب بال، پاؤں میں باتھ روم چپل! ٹیکنالوجی سمارٹ کمپس میں ان بُھوتوں کا داخلہ بند کیا جائے۔

کلثوم عباس SCEE، زرتاب طاہر SADA، محمد اسامہ، فہد امیر SEECS، راضین CAMP، غدیر ہاشمی ASAB، حسن چیمہ RCMS، قانتہ طیّبہ SCME، ایمان سیف NBS

ریکٹر کو رِش تر کہئے

نسٹیئن کی اشاعتِ اول میں ایک معلوماتی مضمون پڑھا۔ اس میں جا بجا لفظ ''ریکٹر سکیل'' سے سامنا ہُوا جو زلزلہ پیما کے موجد کے حوالے سے ہے جن کا نام Richter (رِش تَر) ہے۔ یہ جرمن زبان کا عام فہم لفظ ہے مگر یار لوگوں نے انگریزوں اور امریکیوں کی پیروی میں اسے ''رکٹر'' بنا دیا اور ذرائع ابلاغ نے یہاں بھی اپنی صنّاعی بروئے کار لا کر رکٹر کو ریکٹر بنا ڈالا۔ جرمن زبان کا اصول ہے کہ RH سے پہلے سافٹ واول ای اور آئی آئیں گے تو CH ش کی آواز دے گا جیسے Mich (مِش) Recht (زَیشت) Nicht (نِشت) وغیرہ۔ البتہ CH سے پہلے ہارڈ واول اے، او یا یُو آ جائیں تو CH خ میں بدل جائے گا جیسے

Nacht (نخٹ) Noch (نوخ) Buch (بوخ)۔جن کے دل ودماغ میں نسٹ کے ریکٹر صاحب بسے ہیں' ان کی مجبوری تو سمجھ میں آتی ہے' معلوم نہیں دوسروں کو Richter کو رِش تر لکھنے یا کہنے میں کیا چیر مانع ہے؟

[میاں غلام قادر۔حیات آباد'پشاور]

میاں صاحب! کیوں مرواتے ہیں؟ (ایڈیٹر)

مبالغہ آمیزی

قرآن پاک میں شاعروں کا تذکرہ ناپسندیدگی کے زمرے میں آیا ہے' نسٹیئن میں ان کی بے تکی باتوں کی اہتمام سے اشاعت کیوں' مثلاً:

نازکی اُس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے

کیا یہ مبالغہ آمیزی کی بدترین مثال نہیں۔[جمال احمد: آرمی میڈیکل کالج' راولپنڈی]

آپ اسے مبالغہ قرار دے رہے ہیں' اور صوفی تبسّم نے میر تقی میر کو یہی شعر کہنے پر یوں چارج شیٹ کیا:

وہ تیرے حُسن کی قیمت سے نہیں ہیں واقف
پنکھڑی کو جو تیرے لب کا بدل کہتے ہیں

تو جمال صاحب! معاملہ آپ کے جلال اور صوفی تبسّم صاحب کے کمال کے درمیان ہے۔ہم کیا کہہ اور کر سکتے ہیں؟ (ایڈیٹر)

نسٹیئن بیاض

افسوس! نسٹیئنز کی بیاض صرف دو صفحوں پر؟ [عائشہ مشتاق:NBS]

یہ شمارہ دیکھنے کے بعد بھی آپ صدمے کی حالت میں ہیں کیا؟ (ایڈیٹر)

عذرِ شرعی

نسٹیئن کے حصہ اردو میں افسانے اور مزاحیہ نظمیں شامل ہو گئیں' تو نظمیں غزلیں کس عذرِ شرعی کے تحت شائع نہ ہوئیں؟ [ریحانہ خان لعل خانی]

ذرا بتایئے کتنی نظمیں' غزلیں بھجوائی تھیں آپ نے نسٹیئن کے لئے کہ ان کے نہ چھپنے پر آپ سے معذرت کی جا سکے؟ (ایڈیٹر)

اندر کی بات

نسٹیئن کے اردو اور انگلش سیکشنز میں لڑکوں کی نسبت لڑکیوں کی نمائندگی زیادہ ہے۔اندر کی بات کیا ہے؟ [ساجد شفیع:SEECS]

اللہ کی مرضی پیارے! بورڈز اور یونیورسٹیوں کے نتائج میں بھی لڑکیوں نے اپنی محنت سے ساری ٹاپ پوزیشنز لے کر لڑکوں کو اندر کی بات پوچھنے پر لگا رکھا ہے۔(ایڈیٹر)

مختار نہیں' افتخار

نسٹیئن 2011ء صفحہ 197 پر شائع شدہ جدید علمی ڈکشنری حصہ اول حامد مختار کی نہیں' SCME کے حامد افتخار شیخ کی کاوش ہے' وہ اب CES میں پائے جاتے ہیں۔[اُسامہ حسن:Alumnai]

اچھا! اب سمجھ آئی کہ حامد افتخار شیخ نے ڈکشنری کا حصہ دوم کیوں نہیں بھیجا ہمیں۔یا پھر آپ نے اُن سے قلمی تعاون بند تو نہیں کر دیا (ایڈیٹر)

جینڈر ڈِس کرمینیشن!

نسٹیئن بیاض صفحہ 211' نیچے سے اوپر تیسرا شعر:

لڑکے ہیں اپنے باپ کی جاگیر کے رقیب
وہ گھر بھی کوئی گھر ہے' جہاں لڑکیاں نہ ہوں

Gender Discrimination کی بھی کوئی حد ہوتی ہے؟ [زاہد:SADA]

سبحان اللہ! حقیقت کا انگریزی ترجمہ جَینڈر ڈِس کرمینیشن کب اور کس نے کیا؟ (ایڈیٹر)

انتظار یہ

جنہیں مَیں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں، زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

— اقبالؒ

• یہ شمارہ چھپتے چھپتے موصول ہونے والی گرانقدر تحریریں

احوالِ بلوچستان

پروفیسرفتح محمد ملك

قیامِ پاکستان کے موقعہ پر بھارت نے حیدرآباد، جونا گڑھ اور متعدد دیگر ریاستوں پر مسلح فوجی جارحیت کے ذریعے قبضہ کیا تھا، مگر بلوچستان نے شعوری طور پر شفاف جمہوری اصولوں پر عمل کرتے ہوئے آئینی طریقے سے پاکستان میں شمولیت کی تمنا پوری کی۔ برطانوی سامراج نے بلوچستان میں سیاسی اور جمہوری عمل کوئٹہ میونسپلٹی تک محدود رکھا۔ سالہاسال تک آل انڈیا مسلم لیگ اپنے ہر سالانہ اجلاس میں یہ مطالبہ کرتی رہی کہ سیاسی اور معاشرتی اصلاحات کا دائرہ پورے بلوچستان تک پھیلا دیا جائے۔ قائدِ اعظمؒ کے مشہورِ زمانہ چودہ نکات میں بھی ایک نکتہ اِسی مطالبے سے پُھوٹا تھا۔ برطانوی حکومت اور کانگرسی قیادت، ہر دو اس مطالبے کی مخالفت میں سرگرمِ عمل رہیں۔ قراردادِ پاکستان سے فقط چار ماہ بعد خان لیاقت علی خانؒ کی صدارت میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بلوچستان شاخ کا پہلا سالانہ اجلاس جولائی 1940ء میں منعقد ہوا تھا۔ اِس اجلاس میں بھی یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ سیاسی اور تمدنی اصلاحات کو کوئٹہ میونسپلٹی تک محدود رکھنے کی روش کو ترک کر کے پورے بلوچستان میں سیاسی عمل کی اجازت دی جائے۔ مرکزی قیادت کی رہنمائی میں بلوچستان مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے بڑی سرگرمی سے تحریکِ پاکستان کا پیغام عام کرنے کا فریضہ سرانجام دیا۔ اکتوبر 1945ء میں قائدِ اعظمؒ نے اپنے دورۂ بلوچستان کے دوران اصلاحات کی ضرورت اور اہمیت کو اُجاگر کیا۔ اِس کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ نے کانگرس نواز سرداروں کے پراپیگنڈے کو غیر موثر بنانے کی خاطر کوئٹہ، فورٹ سنڈے مین، نوشکی اور دیگر مقامات پر جلسے کیے تھے اور مسلم لیگ کی شاخیں قائم کی تھیں۔

30 جون 1947ء کو شاہی جرگہ اور کوئٹہ میونسپلٹی کے ارکان کا اجلاس اِس سوال کا فیصلہ کُن جواب حاصل کرنے کی خاطر منعقد ہُوا کہ بلوچستان کو پاکستان میں شامل ہونا چاہیے یا نہیں؟ اِس سوال کا جواب 54 کے 54 موجود ارکان نے پاکستان میں شمولیت کے حق میں دیا اور یوں بلوچستان نے آئینی اور جمہوری انداز میں پاکستان میں شمولیت اختیار کی۔

بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' (RAW) کے سابق سربراہ شری بی رامن نے بلوچستان میں دہشت گردی میں مصروف عناصر کو مشورہ دیا ہے کہ وہ بنگلہ دیش کے قیام کی تحریک کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے پاکستان سے آزادی حاصل کر لیں۔ مقامِ حیرت ہے کہ تحریکِ پاکستان کے دوران کانگریس، غربت، پسماندگی اور بلوچ پشتون منافرت کے جس استدلال کے ساتھ بلوچستان کو پاکستان میں شامل نہ ہونے کا درس دے رہی تھی، آج نصف صدی سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد اُسی استدلال کو بلوچستان کی پاکستان سے علیحدگی کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ آج کی صورتِ حال کس نے پیدا کی؟ بھارت تو اس صورتِ حال کا اُسی طرح سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے جس طرح اُس نے مشرقی پاکستان میں ہماری مشکلات سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر پاکستان کا بازو کاٹ دیا تھا۔

دہشتگردی میں مصروف عناصر اِس مشورے پر عمل کریں یا نہ کریں، بھارت میں سرگرمِ عمل پاکستان دشمن لابی نے اِس پر عمل شروع کر رکھا ہے۔ ''را'' کے اِن مذموم عزائم کو ناکام بنانے کی خاطر ہمیں بلوچستان کی صورتِ حال کے اندرونی اور بیرونی محرکات و عوامل کا ٹھنڈے دل سے جائزہ بھی لینا ہے اور کسی فوجی جارحیت کے پیشِ نظر بلوچستان کی

دفاعی فصیلوں کو بھی مضبوط سے مضبوط تر بنانا ہے۔ دفاع کو مضبوط بنانے کی خاطر بلوچستان میں مناسب مقامات پر جلد از جلد فوجی چھاؤنیوں کا قیام بے حد ضروری ہے۔

ہمارے حکمران فوجی چھاؤنیوں کے قیام میں اِس لیے مجرمانہ غفلت کا شکار رہے کہ اُنہیں بلوچستان کے دفاع سے زیادہ سرداری نظام کے دفاع کی فکر لاحق تھی۔ 1976ء میں مرکزی حکومت نے پارلیمنٹ سے ''سرداری نظام کے خاتمے کا ایکٹ'' منظور کرایا تھا۔ وہ حکومت ختم کر دی گئی' تو اُس سے ناراض سرداروں نے اُس کے خاتمے کا پُر جوش خیر مقدم کیا۔ جواباً اِس ایکٹ پر عمل درآمد روک دیا گیا۔ بلوچستان میں انگریزوں کی فوجی چھاؤنیوں کے قیام میں اِن سرداروں کے آباؤ اجداد کا تعاون ہمیشہ شامل رہا۔ اِس تعاون کے بدلے میں انگریزوں نے انہیں اپنی پرائیویٹ فوجیں رکھنے اور پرائیویٹ جیلیں قائم کرنے کا اختیار دے دیا۔ برطانوی سامراج کے ساتھ یہ سودا بازی گورنر جنرل کے ایجنٹ کرنل سر رابرٹ سنڈے مین کی وساطت سے رُو بعمل آئی تھی۔ اُنیسویں صدی کے آخری عشرے میں منظرِ عام پر آنے والی' ٹی ایچ تھورنٹن کی لکھی' کرنل سر رابرٹ سنڈے مین کی سوانح حیات میں عصری معنویت کا حامل یہ واقعہ بھی درج ہے کہ جب سلطنتِ برطانیہ اور افغانستان کے امیر کے مابین سرحدی جھڑپیں شروع ہوئیں' تو... سرداروں نے افغان مجاہدین کے خلاف انگریزوں کی مدد کی تھی۔ آج وہی سردار بلوچستان میں قومی فوج کی چھاؤنیوں کے قیام کے خلاف قومی فوج اور اپنے غیر فوجی ہم وطنوں پر راکٹ برسا کر تخریب کاری پر اُترے ہوئے ہیں!

بلوچستان میں تحریکِ پاکستان کے قائدین نے سرداری نظام سے بلوچی عوام کو نجات دلانے کا وعدہ کیا تھا جو وفا نہ ہُوا۔ نتیجہ یہ کہ آج بلوچ عوام اور بلوچ سردار دو الگ الگ راہوں پر گامزن ہیں۔ قاضی عیسیٰ بلوچستان میں تحریکِ پاکستان کے نامور ترین قائدین میں سے ایک ہیں۔ اُن کے خاندان کے چشم و چراغ قاضی فائز عیسیٰ نے فروری 2006ء میں ایک مضمون بعنوان Nawabs, Sardars and Cantonments میں مشورہ دیا تھا کہ بلوچستان کے سرداروں سے مذاکرات کرنے کی بجائے مظلوم بلوچی عوام کی صدائے دردناک پر کان دھرے جائیں کیونکہ سرداروں اور عوام کے مفادات باہم متصادم ہیں۔ بلوچ عوام اِس صورتحال سے سخت نالاں ہیں۔ اُن کا مطالبہ یہ ہے کہ پاکستان کے آئین کے حرف و معنی پر مکمل عمل کیا جائے۔ اِس عمل کا آغاز سرداری نظام کی تنسیخ کے آئینی تقاضے پورے کرنے ہی سے ممکن ہے۔ قاضی صاحب نے اپنے اسی مضمون میں آگے چل کر لکھا تھا کہ ''یہ عمل انتہائی تکلیف دہ ہے کہ آج کچھ حلقے حکومت کو اُن سرداروں کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہونے کو کہہ رہے ہیں جو اس لیے دہشت گردی اور تخریب کاری پر اُتر آئے ہیں کہ حکومت ہر حالت میں عوام پر ترقی کے دروازے کھولنے میں مصروف ہے۔ اُس وقت سرداروں کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ تحریکِ پاکستان کے کامیابی سے ہمکنار ہونے کی صورت میں اُن کی وہ تمام مراعات ختم ہو جائیں گی جو انہوں نے برطانوی سامراج کی وفاداری کے صلے میں حاصل کی تھیں۔ آج اُنہیں یہ خطرہ درپیش ہے کہ جب بھی کسی پاکستانی حکومت نے پاکستان کے آئین کی مکمل پاسداری کا ارادہ کر لیا تو ''سرداری سسٹم کی تنسیخ کے ایکٹ 1976ء'' کی رُو سے اُن کی سامراجی مراعات چھن جائیں گی اور اُن کی پرائیویٹ جیلوں میں بند خلقِ خُدا آزادی' عزت اور مساوات کی انسانی قدروں سے فیضیاب ہونے لگے گی۔

''را'' کے سابق سربراہ نے اِن سرداروں کی اِس خطرے سے نجات بنگلہ دیش کے قیام کی تحریک سے ''کسبِ فیض'' میں دیکھی اور دِکھائی ہے۔ پیشتر اس کے کہ دہشت گردوں کے ٹھکانے خدانخواستہ کسی غیر ملک کی فوجی چھاؤنیوں کا روپ دھار لیں' ہمیں بلوچستان میں ہر قیمت پر افواجِ پاکستان کی چھاؤنیاں قائم کر کے بلوچی عوام کو سرداروں کے

سفّاک چنگل سے نجات دینی چاہیے۔

مغربی سپاہِ دانش کی بلوچستان میں روز افزوں غارت گری کو بھی اسی سیاق و سباق میں دیکھنا لازم ہے۔ ''کارنیگی وقف برائے بین الاقوامی امن'' نے اِس مقصد کے حصول کے لیے بہت سی سپاہِ دانش پال رکھی ہے۔ اِس سپاہ کی کمان سیلگ ایس ہیری سن کے ہاتھ میں ہے۔ ہیری سن صاحب کا کہنا یہ ہے کہ ''بلوچستان کی صورتِ حال پاکستان کا نہیں بلکہ امریکہ کا اندرونی معاملہ ہے۔ امریکہ پاکستان میں اپنے اِس اندرونی معاملے کی سنگینی پر غفلت کا شکار ہے' اُسے چاہیے کہ حکومتِ پاکستان پر پورا پورا دباؤ ڈالے'' گویا پاکستان کو مغرب کے تابعدار بلوچی سرداروں کے پاؤں چُھونے پر مجبور کردے۔

سوال یہ ہے کہ بلوچستان کے حالات کے پسِ پردہ کون ہے؟ ہیری سن صاحب کا جواب یہ ہے کہ بلوچستان میں آئے دِن داغے جانے والے میزائل' راکٹ اور تباہی پھیلانے والے دیگر اسلحہ کی فراہمی اور اِن کو استعمال کرنے کی تربیت میں بھارت کا کوئی ہاتھ نہیں۔

ساری دنیا جانتی ہے مذہب کے نام پر دہشت گردی کے خلاف جنگ میں کون ہمارا حلیف ہے اور علیحدگی پسندی کے نام پر دہشت گردی کے خلاف ہمارے دشمنوں کا حلیف کون ہے۔ مَیں کوئی تھنک ٹینک تو نہیں' تاہم درخواست کرتا ہوں کہ بلوچستان کے اندرونی معاملات پر پاکستان ہر غیر ملکی اور نامعقول دباؤ کو قبول کرنے سے ہمیشہ ہمیشہ انکار کرتا چلا جائے۔ یہی ہماری آزادی' سلامتی اور خودمختاری کا تقاضا ہے۔

سیلگ ہیری سن آزاد اور وسیع تر بلوچستان کے بہت پرانے نظریہ ساز ہیں۔ کم وبیش گزشتہ چھپن برس سے ''کارنیگی وقت برائے بین الاقوامی امن'' سے وابستہ ہیں۔ بنیادی اور حقیقی طور پر وہ ایک بھارت نواز صحافی ہیں جنہیں برِصغیر میں کارنیگی جرنلسٹس پروگرام کے تحت برس ہا برس تک نئی دہلی میں ''واشنگٹن پوسٹ'' کا بیورو چیف رہنے کا امتیاز حاصل ہے۔

ایک زمانے میں مغربی دنیا کو درپیش سوویت خطرات کے حوالے سے

> گزشتہ تین سو برس کی تاریخ شاہد ہے کہ توسیع پسندی کی مغربی یلغار میں ٹینک سے پہلے تھنک ٹینک اور برّی' بحری اور فضائی سپاہ سے پہلے سپاہِ دانش پیش قدمی کرتی چلی آتی ہے۔ عصرِ رواں نے تو یہ منظر بھی دیکھا کہ سپاہِ دانش نے اپنی ''پُرامن'' حکمتِ عملی سے سوویت یونین جیسی نظریاتی سُپر پاور کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا اور خود پر جارحیت کا الزام بھی نہ آنے دیا' گویا بقول کلیم عاجز:
>
> دامن پہ کوئی چھینٹ' نہ خنجر پہ کوئی داغ
> تُم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

سپاہِ دانش پاکستانی بلوچستان اور ایرانی بلوچستان کو گریٹر بلوچستان کے نام پر خطے میں اپنے کٹھ پُتلی حکمران شہنشاہِ ایران کے سپرد کرنے میں کوشاں تھی۔ ہیری سن ایک کتاب بھی لکھ رہے تھے' مگر کرنا خدا کا یوں ہُوا کہ ایران میں امام خمینیؒ کی قیادت میں انقلاب برپا ہو گیا۔ شہنشاہِ ایران بھاگ کھڑا ہوا۔ نتیجہ یہ کہ جب تک ہیری سن کی بلوچستان رپورٹ کتابی صورت میں منظرِ عام پر آتی' وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر مغربی دُنیا کا آشیانہ تھا۔ گریٹر بلوچستان کا تصور ہوا ہو گیا اور مغربی سپاہِ دانش اپنی بیرکوں میں واپس چلی گئی۔

افغانستان میں کرزئی حکومت کے قیام اور خطے میں امریکہ اور بھارت کی سیاسی یکدلی اور دفاعی یگانگت کے پیشِ نظر سپاہِ دانش ایک بار پھر بیرکوں سے نکل کر فکری محاذِ جنگ پر دادِ شجاعت دینے لگی ہے۔ اُس وقت خطے میں سوویت روس کے بڑھتے ہوئے اثرات کے تدارک کی خاطر پاکستان سے بلوچستان کو الگ کرنا لازم ٹھہرا تھا اور اب خطے میں چین کے بڑھتے اثر کے پیشِ نظر ایک ''آزاد'' بلوچستان میں مغربی دُنیا کے تابعدار سرداروں کی حکومت کا قیام ضروری نظر آنے لگا ہے۔ In Afghanistan's Shadow

سیلگ ہیری سن کی کتاب ہے آیئے! اس کے پہلے باب کی ایک آدھ سطر پڑھ ڈالیں:

> Soviet control of the Baluch coast would not only give Moscow a powerful new springboard for spreding its political influence throughout the Middle East and Southwest Asia, but would also radically alter the military balance in the region (p.2)

ازاراہِ کرم درج بالا سطر کو ایک بار پھر پڑھیں۔ اگر آپ اس عبارت میں ماسکو کی جگہ بیجنگ پڑھ سکیں تو آپ کو اُس وقت کی صورتِ حال اور اِس وقت کی صورتِ حال میں گہری مماثلت نظر آئے گی۔ سیلگ ہیری سن کے مضمون Pakistan's costly other war کے تب اور اب کے محرکات وعوامل بھی آپ کی سمجھ میں آجائیں گے۔

چین کی مدد سے تعمیر کیا جانے والا گوادر پورٹ جس کو اپنے عزائم کی تکمیل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ نظر آنے لگا ہے' گوادر پورٹ کی تعمیر کے مخالف عناصر اُسی کی جنگ لڑنے میں مصروف ہیں۔ آج تھنک ٹینک ہی نہیں' بلکہ امریکی سینیٹر بھی اِن کی حمایت میں آواز اُٹھاتے وقت قومی تنصیبات پر اِن کے حملوں کو دہشت گردی کی بجائے حریّت پسندی سے تعبیر کرنے لگے ہیں۔ ہیری سن بھی گوادر اور اُس کے گرد ونواح کو بلوچوں کی ''آبائی سرزمین'' قرار دیتے ہیں مگر یہ بتانا بھول جاتے ہیں کہ اِن بلوچ سرداروں کے آباؤ اجداد نے تو گوادر کا یہ خطۂ زمین بیچ ڈالا تھا! بعدازاں اس علاقے کو ملک فیروز خان نون کی وزارتِ عظمیٰ میں پاکستان کی مرکزی حکومت نے دوبارہ خرید کر بلوچستان کا حصہ بنا دیا تھا۔ آج گوادر بلاشبہ بلوچستان کا لازمی حصہ ہے اور اِس میں بھی کوئی شک نہیں کہ پورا بلوچستان پاکستان کا لازمی حصہ ہے۔ آج جو ممالک اور جو عناصر بلوچستان کے پاکستان کے ساتھ عضویاتی رشتے کو توڑنے میں دامے' دِرمے' سُخنے سرگرم عمل ہیں' وہ فی الواقع پاکستان کے دشمن ہیں۔ ہمیں ''دوستوں'' کی اس دُشمنی سے ہوشیار رہنا ہوگا۔ تاریخ کا سبق یہ ہے کہ جو قومیں اپنے دشمن کو دوست سمجھنے لگتی ہیں' اُن کے دوست اُنہیں فراموش کر دیتے ہیں۔

اللہ خیر کرے! اس سپاہِ دانش نے اب ایک قدم اور آگے بڑھ کر امریکی عوام کو بلوچستان کی جغرافیائی و سیاسی اہمیت اور بلوچستان میں مدفون معدنی وسائل سے متعارف کرانا شروع کر دیا ہے۔ امریکی پریس میں بلوچستان کے محلِ وقوع کی سیاسی نزاکت کے ساتھ ساتھ بلوچستان کے سرداروں کی ''مظلومیت'' کو اُجاگر کرنے کی سرگرمی زور پکڑنے لگی ہے۔ ''سنٹر فار انٹرنیشنل پالیسی'' میں ماہرِ بلوچستانیات مسٹر سیلگ ہیری سن نے بین الاقوامی برادری سے بڑی دردمندانہ اپیل کی ہے کہ وہ بلوچ سرداروں کو موجودہ سنگین صورتِ حال سے نجات دلانے کی خاطر بلوچستان میں فوری مداخلت کریں۔ سیلگ ہیری سن کے بعد اب امریکی سپاہِ دانش' Carnegie Endowment For International Peace کے ایک فرانسیسی کمانڈر فریڈرِک گرارے نے بھی انسانی حقوق کی (خودساختہ) پاکستان انجمن کی رپورٹ پر تبصرہ کرتے وقت بلوچستان کی صورتِ حال کو حالتِ جنگ سے تعبیر کیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ گزشتہ عشروں سے بلوچستان میں شورش برپا ہے۔ موصوف نے اِس شورش کو ''بلوچ قوم'' کی پاکستان سے بغاوت قرار دے کر باغیوں کے حق میں کھلی مداخلت کرنے کی اپیل کی ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پاکستان کی سالمیت کے خلاف اِس جنگ میں اس سپاہِ دانش کو بھارتی دانش سے کسبِ فیض کی سہولت بھی حاصل ہے' ورنہ وہ اتنی آسانی کے ساتھ ''را'' کو بلوچستان میں مداخلت سے بری الذّمہ قرار نہ دیتی۔ فریڈریک گرارے اگر ایک طرف پاکستان کے اُس بیان کی تردید ضروری سمجھتے ہیں جس میں بلوچستان میں بھارتی ایجنسی ''را''

کی منفی سرگرمیوں کو بے نقاب کیا گیا تھا' تو دوسری جانب وہ بلوچستان کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال کی ساری کی ساری ذمہ داری ''پنجابی بالادستی کی حامل مرکزی حکومت'' پر ڈال دیتے ہیں۔ گرارے صاحب نے جارج پرکووِچ کے اشتراک کے ساتھ ''بلوچستان اور پاکستان کا جمہوری خسارہ'' کے عنوان سے ایک مضمون شائع کروایا۔ یہ مضمون گویا اِن کے ''کارنیگی وقف برائے بین الاقوامی امن'' کی اُس رپورٹ کا خلاصہ ہے جو ''پاکستان میں بلوچ بیداری'' کے عنوان سے شائع کی گئی۔

دُنیا کے نقشے پر بلوچستان کے وجود سے بےخبر اور بلوچستان کی اہمیت سے ناآشنا لوگوں کو بلوچستان سے متعارف کرانا کیوں ضروری ہے؟ مذکورہ رپورٹ میں اس کی یہ وجوہات بیان کی گئی ہیں:

- یہ پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے جو تیل اور گیس کے بے پناہ ذخائر سے مالا مال ہے
- گوادر کے مقام پر چین ایک تجارتی بندرگاہ تعمیر کر چکا ہے
- یہ بندرگاہ خلیج فارس کے دہانے پر قائم ہے
- یہاں پر اڈے بھی قائم ہیں

میرے خیال میں یہ چاروں کی چاروں وجوہات ہی بلوچ سرداروں اور بلوچ عوام کے درمیان جاری تصادم کی اصل جڑ ہیں۔

کارنیگی سپاہِ دانش کے مضمون میں بلوچستان کو ''پنجاب کی کالونی'' کا نام دیا گیا ہے اور ''بلوچستان بلوچیوں کے لیے'' کا نعرہ ایجاد کیا گیا ہے۔ تھنک ٹینک صاحب نے بلوچستان میں آباد پشتونوں کو کس کے سپرد کرنے کا پروگرام بنایا ہے؟ یہ نہیں بتایا۔ بلوچستان میں ''پنجابی استعمار کے مظالم'' میں سرِفہرست گوادر میں بندرگاہ کی تعمیر اور ''پنجابی فوج'' کی چھاؤنیوں کا قیام ہے۔ بلوچستان کو ''پنجابی استعمار کے مظالم'' سے نجات دلا کر سُو پر استعمار کے ''جوارِ رحمت'' میں جگہ دینے کی خاطر مضمون نگاروں نے عمل کی دو راہیں سُجھائی ہیں:

1۔ پہلی راہ بلوچستان میں جمہوری حکومت کا قیام ہے۔ مگر سپاہِ دانش کے اصولوں کی رُو سے شفاف انتخابات وہ ہوتے ہیں جن میں دیندار اور محبِ وطن عناصر کے بجائے سیکولر ذہن کے ظلمت پسند' فوج دشمن اور تاریک اندیش قبائلی سردار اقتدار میں لائے جائیں۔ سپاہِ دانش نے اپنی حکومت کو مشورہ دیا ہے کہ وہ جلد از جلد بلوچستان کے جمہوری خسارے کو جمہوری منافع میں بدلنے کے لیے سیکولر سرداروں کو اقتدار میں لائے۔

2۔ بلوچستان کی نجات کی دوسری راہ سُو پر مفادات کے تحفظ کی تدابیر پر عمل کی راہ ہے۔ اِس راہ پر چلنا اِس لیے آسان ہے کہ ''پنجاب کی بالادستی'' کے نعرہ زن طبقے اور بلوچستان کے لوگوں کا باہمی ربط و ضبط سرداری نظام کی وجہ سے نوآبادیاتی نوعیت کا چلا آرہا ہے۔

اس مضمون میں سپاہِ دانش' جسے سپاہِ آتش کہنا زیادہ قرینِ انصاف ہے' کا اُٹھایا ہُوا یہ آتشیں سوال اہلِ پاکستان کے لیے غور طلب ہے کہ جب ''پاکستان بلوچستان کو جلتا چھوڑ بھاگ کھڑا ہو گا' تب بلوچستان میں امریکی مفادات کا کیا بنے گا''؟ ملاحظہ فرمائیے:

> If Islamabad chooses to leave Balochistan burning, the two US bases in that province, as well as other cooperation in combating terrorism in Afghanistan, could be compromised.

اِس سوال پر غور و فکر کرتے وقت یہ سوچنا بھی ضروری ہے کہ سپاہِ دانش دُنیا کو بلوچستان کی صورتِ حال میں پوشیدہ جن امکانات کی جانب متوجہ کرنے میں مصروف ہے' کیا وہ امکانات ہیں یا عزائم؟

کتابیات

1. T.H Thoronton, *Col.Sir Robert Sundaymen*
2. Ian Talbot, *Provincial Politics and Pakistan Movement.*
3. SeligS.Harryson, *In Afghanistan's Shadow.*

تہران پر طائرانہ نظر

قُدرت اللہ چودھری

نہ مصطفٰے ' نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق' بدن کی تلاش میں ہے ابھی

شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے ترکی کے مصطفٰے کمال اور ایران کے رضا شاہ کبیر کے بارے میں جب یہ حقیقت بیان کی تھی' اس وقت ان دونوں کے اقتدار کا سورج نصف النہار پر تھا۔ ترکی میں مصطفٰے کمال کے سیکولرازم کے پھریرے لہرا رہے تھے تو ایران میں رضا شاہ کبیر کی جدیدیت کی دوڑ اپنے کرشمے دکھا رہی تھی' لیکن علامہ اقبالؒ کے انتقال کے چھ سال بعد ہی ایران کے پہلوی خاندان کا بانی پہلے جلاوطن ہُوا' پھر اسی جلاوطنی کے عالَم میں ہی جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔ پہلوی خاندان کا دوسرا شہنشاہ' اپنی بادشاہت کے ڈانڈے سائرسِ اعظم سے ملاتا تھا۔ اس نے تختِ جمشید کے کھنڈروں میں پچیس سو سالہ بادشاہت کا جشن بڑے کرّ وفر اور طمطراق سے منایا تھا جس میں دنیا بھر سے شہنشاہ' بادشاہ' شہزادے' شیخ' امیر' صدور' وزرائے اعظم اور ممتاز لوگ شریک ہوئے۔ اس جشن کے دس سال بعد ہی وہ اُس شخص کے برپا کئے انقلاب کی بدولت جلاوطن ہو گیا جسے اس نے ملک سے نکال کر یہ سمجھ لیا تھا کہ اب اس کے اقتدار کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں۔ اس بوریا نشین نے' جو اس وقت تہران کے بہشتِ زہرا قبرستان کے قریب ابدی نیند سو رہا ہے اور دلوں پر حکومت کرتا ہے، اس کا تخت و تاج اس طرح اُچھالا کہ دنیا کے کسی ملک میں اسے پناہ نہ ملی۔ بالآخر اسی حالت میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ اب وہ مصر کی کسی گمنام قبر میں لیٹا ہوا ہے' ایران اور دنیا بھر میں اس کے محلات جائے عبرت بن کر رہ گئے ہیں!

ہندوستان کے ایک شاعر بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے تو اپنی زندگی میں بھانپ لیا تھا کہ اسے دفن کے لئے کُوئے یار میں دو گز جگہ بھی نہیں مل سکے گی' لیکن ایران کا یہ بادشاہ جو آخری وقت تک انقلاب کا راستہ روکنے کے لئے کوشاں تھا' اس جہاز کو بھی اترنے سے روکنا چاہتا تھا' جس میں اس کے اقتدار کا محل زمین بوس کر دینے والا فاتح آ رہا تھا... لیکن یہ صبح ٹل نہیں سکتی تھی کہ اس صبحِ انقلاب کے لئے لاکھوں انسانوں نے اپنے خون کا نذرانہ پیش کیا۔ انقلاب کی کامیابی کے کچھ عرصے بعد صفِ اول کی انقلابی قیادت ایک دھماکے میں اُڑا دی گئی تھی جس میں اس وقت کے صدر جوّاد باہُنر اور وزیرِ اعظم محمد علی رجائی بھی شامل تھے' لیکن انقلابیوں کی نئی کھیپ ان کی جگہ لینے کے لئے نہ صرف تیار تھی' بلکہ اب ایران میں گھومتے پھرتے' لوگوں سے ملتے ملاتے' بات چیت کرتے اور ایران کے حالات پر نظر رکھنے والے اہل الرائے سے تبادلۂ خیالات کے بعد احساس ہوتا ہے کہ انقلاب اس سرزمین میں اپنی جڑیں گہری کر چکا۔ جو لوگ انقلاب کے وقت پیش پیش تھے اور نوجوان تھے' وہ اب اُدھیڑ عمری میں قدم رکھ چکے، ان کے بال سفید ہو گئے یا سفید بالوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے۔

انقلاب کے بعد یوں تو سارا تہران بدل گیا ہے' لیکن بعض عمارتیں ایسی بھی

تعمیر ہوئی اور ہورہی ہیں جو عجائباتِ عالَم میں شمار کی جاسکتی ہیں۔میلاد ٹاور ایرانی انجینئرنگ کا ایک ایسا ہی شاہکار ہے۔اس مینار کی بلندی سے پورے تہران کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔یہ تہران کا بلند ترین ٹاور ہے اور ایرانی انجینئروں کی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار! نمائش کے لئے مخصوص وسیع وعریض عمارت کے ساتھ ہی ایک مسجد تعمیر کی جارہی ہے' جو فنِ تعمیر کا نادر نمونہ اور دنیا بھر کی چند بڑی مساجد میں شمار ہوگی۔اس وقت نماز جمعہ تہران یونیورسٹی میں ادا کی جاتی ہے۔ جمعہ کی نمازِ کے لئے یونیورسٹی کے اردگرد کی سڑکیں بند کردی جاتی ہیں۔ جمعہ کے روز صبح سے ہی نماز کی تیاری شروع کردی جاتی ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ سڑکیں بند ہونے کی وجہ سے ٹریفک متاثر نہ ہو۔خیال ہے کہ کئی منزلہ مسجد کی تعمیر کے بعد نمازِ جمعہ کا مقام تبدیل ہو جائے گا۔اس مسجد میں لاکھوں نمازیوں کے لئے نماز ادا کرنے کی سہولت ہوگی۔

امام خمینیؒ کے مزار کی عمارت کئی سال سے زیرِ تعمیر ہے۔ مزار کے اردگرد عمارتوں کا ایک وسیع کمپلیکس تیار کیا جارہا ہے جہاں امام خمینیؒ یونیورسٹی قائم کی جائے گی۔انقلاب کے بعد تہران میں کئی نئی یونیورسٹیاں بنا دی گئی ہیں۔ان یونیورسٹیوں میں جدید علوم اور دینی تعلیم ساتھ ساتھ دی جاتی ہے۔یونیورسٹیوں میں لائبریریوں کے قیام پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔''دانشگاہِ امام صادقؒ'' نسبتاً چھوٹی یونیورسٹی ہے' یہاں طلباء وطالبات کے لئے علیحدہ علیحدہ کلاسیں ہوتی ہیں۔یہاں لائبریری میں ایک لاکھ پینتیس ہزار کتابیں ہیں جن میں پینتیس ہزار انگریزی زبان میں ہیں۔

یونیورسٹیوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ میڈیکل کے شعبے میں بھی تہران تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔جدید ترین تحقیق کے ادارے قائم ہورہے ہیں۔ایسا ہی ایک ادارہ ''رویان'' ہے جہاں مصنوعی تولید اور کلوننگ پر کامیاب تحقیق ہورہی ہے۔اس طرح کے تحقیقی مرکز دنیا میں کم کم ہیں۔ایران ان چند ممالک میں شامل ہوگیا ہے جہاں یہ تحقیق کافی سُرعت سے آگے بڑھ رہی ہے۔

شہر کی ترقی پر نظر دوڑائی جائے تو کشادہ سڑکوں کا وسیع جال بچھا ہوا ہے۔ٹریفک کا اژدہام رہتا ہے' لیکن کہیں بھی ٹریفک رُکتی نہیں۔لین کی پابندی کی وجہ سے ٹریفک آہستہ آہستہ چلتی رہتی ہے۔یہ کشادہ سڑکیں بھی ٹریفک کے لئے تنگ محسوس ہونے لگیں تو بعض سڑکوں پر بسوں کے لئے ایک خصوصی ''فاسٹ ٹریک'' بنایا گیا۔اس پر جدید ترین' آرام دہ اور خوبصورت بسیں چلتی ہیں۔بس ٹریک کا فائدہ یہ ہے کہ کاروں والی لائن میں ٹریفک رُک بھی جائے تو بسیں چلتی رہتی ہیں۔اس کا فائدہ یہ ہے کہ لوگ ذاتی گاڑیاں چھوڑ کر بسوں میں سفر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اگر بسوں کا سفر آرام دہ ہو تو لوگ ذاتی گاڑیوں کی ضرورت سے بے نیاز ہوجاتے ہیں۔تہران کی بسوں کی خاص بات یہ ہے کہ ان کے کرائے قیمتوں کے مجموعی سٹرکچر کے مقابلے میں کم بلکہ بہت ہی کم ہیں۔

عوام الناس کے لئے سستی ٹرانسپورٹ سہولتوں کے ضمن میں ٹیکسی سروس بھی بڑی اہم ہے۔ٹیکسیوں کی شٹل سروس بھی ہے' جو ایک معیّنہ روٹ پر چلتی اور چار مسافروں کو لے کر روانہ ہوجاتی ہیں۔گنجائش ہو تو راستے سے بھی مسافروں کو اُٹھا لیتی ہیں۔یوں لوگ سستے داموں ٹیکسی کا سفر کر لیتے ہیں۔شٹل کے علاوہ بھی ٹیکسی سروس پورے شہر میں عام ہے۔خواتین کی سہولت کے لئے ایسی ٹیکسیاں بھی مخصوص ہیں جن کو خواتین ڈرائیو کرتی اور ان میں صرف خواتین ہی سفر کرسکتی ہیں۔

ٹرانسپورٹ کی سستی اور تیز رفتار سہولت فراہم کرنے کے لئے نہ صرف تہران کی سڑکوں کے اوپر ہی مناسب اقدامات کئے گئے ہیں' زیرِ زمیں ریلوے کا نظام بھی قائم کیا گیا ہے۔تہران خطے کے ان چند شہروں میں ہے' جہاں زیرِ زمیں ریلوے کا جدید ترین نظام قائم کیا گیا ہے۔دُنیا بھر میں عام طور پر اس نظام کو ''میٹرو'' کہا جاتا ہے۔فارسی زبان میں اسے مقّرس کر کے ''مترو'' بنا دیا گیا ہے۔اس تبدیلی کے سِوا باقی سب کچھ وہی

ہے۔ ویسے ہی عالمی معیار کے سٹیشن، پٹڑیاں اور گاڑیوں کے ڈبے، جن علاقوں میں یہ نظام سو سال سے چل رہا ہے، وہ اسے جدید بنا رہے ہیں۔ ایران میں چونکہ یہ سسٹم نیا ہے، اس لئے موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق ہے۔ یہ جدید ترین سسٹم عالمی پائے کا ہے اور اہلِ تہران کے لئے سفر کا سستا ترین ذریعہ بھی۔ اہلِ تہران گزشتہ پانچ چھ برس سے اس سہولت سے استفادہ کر رہے ہیں۔ تین مختلف قسم کی لائنیں زیرِ زمیں مترو پر رواں دواں ہیں۔ بجلی سے چلنے والی یہ گاڑیاں فی الحال درآمد شدہ ہیں، لیکن انہیں اندرونِ ملک تیار کرنے کا منصوبہ بھی ہے۔ توسیع کا کام بھی جاری ہے جس کے بعد یہ سلسلہ مزید پھیل جائے گا۔ یہ سفر بھی انتہائی آرام دہ اور سستا ہے۔ موازنے کے لئے عرض کرتے چلیں کہ تہران میں اوسط درجے سے بھی کم درجے کے کسی کیفے میں ایرانی چائے کا کپ 250 تومان میں ملتا ہے اور مترو کے ذریعے یک طرفہ سفر 300 تومان میں ہو جاتا ہے۔ آپ واپسی کا ٹکٹ بھی ساتھ ہی لے لیں تو صرف 450 تومان خرچ کر کے پورے تہران کا چکر لگا کر واپس آ سکتے ہیں۔ گویا آپ دو کپ چائے سے بھی کم قیمت میں اپنی منزل پر جا کر واپس لوٹ سکتے ہیں۔ زیرِ زمیں سفر کی سہولت نہ ہو تو تہران کی سڑکیں اپنی تمام تر کشادگی، وسعت، سینکڑوں انڈر پاسوں اور اوور ہیڈ پُلوں کے باوجود تنگ پڑ جائیں۔ خوب سے خوب تر کی تلاش کا سفر اور کوششیں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔

مروّج فارسی زبان میں بعض ایسے الفاظ مُستعمل ہیں جن کا اُردو مفہوم فارسی سے قطعاً مختلف ہے، بلکہ بعض فارسی الفاظ کا مفہوم بھی وقت کے ساتھ ساتھ بدل گیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کہا تھا:

نغمہ کُجا و من کُجا، سازِ سخن بہانہ ایست
سُوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

یہاں قطار سے مُراد اردو والی قطار ہی ہے، لیکن ایران میں اب ''قطار'' ریلوے ٹرین کو کہتے ہیں، اس لحاظ سے ریل کی پٹڑی راہِ قطار کہلاتی ہے۔

اُردو زبان میں فرش کا مطلب ہر کوئی سمجھتا ہے، لیکن ایران میں فرش، قالین کو کہتے ہیں۔ قالین سازی ایران کی قدیم صنعت ہے، اہلِ ایران کو جس پر فخر بھی ہے اور یہ ایرانی کلچر کا ایسا جزوِ لاینفک ہے کہ اس کے بغیر گھروں کا کوئی تصور نہیں۔ اوسط درجے کے گھروں میں آپ کو اعلیٰ ایرانی قالین بچھے ہوئے نظر آئیں گے۔

کافی کو یہاں ''قہوہ'' کہا جاتا ہے۔ کسی ریستوران میں اگر آپ قہوہ طلب کریں تو آپ کے سامنے دودھ یا کریم والی کافی لائی جائے گی۔ بغیر دودھ کے کافی بھی دستیاب ہوتی ہے یا پھر کیپی چینو لیکن اگر آپ نے سبز قہوہ پینا ہے تو پہلے ہی وضاحت کے ساتھ بتا دیں، بصورتِ دیگر آپ کی خدمت میں کافی پیش کی جائے گی۔ ہمارے ہاں ''روٹی'' اور ''نان'' دو الگ الگ آئٹم ہیں لیکن ایران میں ''نان'' روٹی کے معنوں میں مُستعمل ہے۔ روٹی تیار کرنے والی بیکریاں مختلف اقسام کی روٹیاں تیار کرتی ہیں۔ روٹی کا سائز کافی بڑا ہوتا ہے۔ متعدد بار شہر میں دیکھا کہ آدمی آٹھ دس روٹیاں ہاتھ میں پکڑے جا رہا ہے اور راستے میں چلتے چلتے روٹی ''ٹھونگتا'' بھی جاتا ہے۔ کھانے کے اوقات میں ایسے مناظر عام دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایک آدھ بار رومال میں لپٹی ہوئی روٹیاں بھی دیکھیں، لیکن عموماً لوگ ہاتھ میں اُٹھائے ہوئے ہی نظر آئے۔ موٹر سائیکل کے کیریئر پر بھی اسی طرح روٹیاں بغیر شاپر وغیرہ کے رکھ کر لے جائی جاتی دکھائی دیں۔ گھروں میں روٹی پکانے کا رواج کم کم ہے، عموماً بیکریوں سے روٹی خریدی جاتی اور ٹھنڈی کر کے کھائی جاتی ہے۔ کسی کو ہمارے ہاں کی طرح مُنہ جلانے والی روٹی کھاتے نہیں دیکھا۔ فارسی روزمّرہ میں ایک لفظ دن میں ہزاروں بار سُننے کو ملتا ہے اور وہ ہے ''بفرمائید''، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ''آپ فرمائیے''، بلکہ یہ ہے تشریف رکھئے، یا پھر اگر آپ سے کہا

جائے کہ آپ کار یا بس میں سوار ہو جائیں تو کہا جائے گا: ''بفرمائید''۔ آگے بڑھنے کے لئے بھی یہی لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ ''آب'' کا لفظ یہاں پانی کے علاوہ ''جُوس'' کے معنوں میں بھی بولا جاتا ہے۔ ''آبِ سیب'' کا مطلب ہے ''سیب کا جُوس'' یا ''آبِ انار'' کا مطلب ہے ''انار کا رس''۔

ایرانی معیشت میں تیل و گیس کی بڑی اہمیت ہے۔ تیل کے ذخائر اگر پچاس سال کے لئے کافی ہیں، تو گیس اگلے سَو سال کی ضروریات کے لئے کافی ہے۔ گیس کے نئے فیلڈ بھی دریافت ہو رہے ہیں۔ زرِمبادلہ کے ذخائر اس سال کے آخر تک 100 بلین ڈالر سے بڑھ جائیں گے۔ اسی طرح ایران کی نان آئل برآمدات بھی تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ اس وقت ایرانی نان آئل برآمدات 25 بلین ڈالر کے لگ بھگ ہیں جو پاکستان کی مجموعی برآمدات سے قریب تر ہیں۔

گزشتہ چند برسوں میں ایران میں خبر رساں ایجنسیوں کی تعداد میں بڑی تیزی سے اضافہ ہُوا ہے۔ خبروں کی ترسیل کے محاذ پر یہ خبر رساں ایجنسیاں بہت زیادہ سرگرمِ عمل ہیں۔ ''مطبوعاتِ جہانِ اسلام'' کی نمائش میں ڈیڑھ درجن کے لگ بھگ نیوز ایجنسیوں کے خوبصورت سٹال دیکھ کر اندازہ ہُوا کہ انہیں وسائل کی کوئی کمی نہیں۔ خبر رسانی کے لئے درکار جدید ترین وسائل اُن کے پاس موجود ہیں۔ ان نیوز ایجنسیوں میں رپورٹر بہت مُتحرک ہیں۔ خواتین ایک بڑی تعداد ان نیوز ایجنسیوں سے وابستہ ہے اور بڑی تندہی سے صحافتی فرائض انجام دیتی نظر آتی ہے۔ رپورٹنگ کے علاوہ فوٹو گرافی کے شعبے میں بھی خواتین اپنے جوہر دکھا رہی ہیں۔ جدید ترین کیمروں سے لیس یہ خواتین بلند پایہ فوٹو گرافر ثابت ہوئی ہیں۔ یہ تاثر اخبارات میں چھپی ہوئی اُن کی تصاویر دیکھ کر قائم ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر چونکہ ایرانی خواتین زندگی کے ہر شعبے میں مُتحرک ہیں، اس لئے اس کا عکس اخبارات اور نیوز ایجنسیوں میں بھی نظر آتا ہے۔

نیوز ایجنسیوں کے وسائل سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں کسی نہ کسی انداز میں سرکاری سرپرستی بھی حاصل ہے۔ ہماری بعض نیوز ایجنسیوں کو بھی سرکاری گرانٹ ملتی ہے، لیکن ان کے دفاتر میں اس امداد کا کوئی پرتَو نظر نہیں آتا۔ پروپیگنڈے کے محاذ پر بھی ایرانی حکومت پوری طرح ڈٹی ہوئی ہے۔ وہ اپنا نقطۂ نظر ڈنکے کی چوٹ پر دنیا کے سامنے رکھتی اور اپنے خلاف ہونے والے پروپیگنڈے کا مدلّل توڑ کرتی ہے۔ ایرانی اخبارات، مطبوعات اور خبر رساں ادارے اس ضمن میں اپنے وطن اور قوم کا نقطۂ نظر کسی ہچکچاہٹ کے بغیر دُنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اس سلسلے میں کسی معذرت خواہانہ روّیے کے قائل نہیں۔ انقلابِ اسلامی کے اپنے اہداف اور مقاصد ہیں جن سے سرِمُو انحراف بھی کسی انقلابی کے لئے گوارا نہیں۔ حکومت کے اہداف مُتعیّن ہیں اور ہر محاذ پر آگے بڑھنے کا جذبۂ فراواں بھی موجزن ہے۔

ایرانی مطبوعات کا معیارِ طباعت بہت بلند ہے۔ کلاسیکی شاعری کی کتابیں اب عام کے ساتھ ساتھ انتہائی خوبصورت انداز میں ڈیلکس ایڈیشن میں بھی چھاپی جاتی ہیں۔ مختلف کتابوں کا ایک ایڈیشن پانچ ہزار کی تعداد میں چھپتا ہے اور کئی کئی ایڈیشن شائع ہوتے ہیں۔ شاہنامہ فردوسی، حافظ و سعدی شیرازی، شمس تبریزی کے دیوان اور عمر خیام کی رباعیات کے انتہائی دیدہ زیب ایڈیشن شائع کئے جاتے ہیں۔ جدید شاعروں اور نثر نگاروں کے شعری اور نثری مجموعوں کے ساتھ ساتھ کُلیّات بھی شائع کئے جاتے ہیں۔ نثری کلیّات کا نام ''آثار'' رکھا گیا ہے۔ فروغِ فرخ زاد، احمد شاملو، جلال آل احمد، فریدون مشیری، منوچہر آتشی، فرخ تمیمی، حمید مصدق، نصرت رحمانی، م آزاد، م امید، قیصر امین پور اور صادق ہدایت جیسے معاصر شعراء اور ادباء کی کتابیں کئی بار شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے قارئین بھی موجود ہیں۔ انگریزی تصانیف کے تراجم بھی کتابوں کی دکانوں پر نظر آئے۔ شائع ہونے والی جارج بُش کی کتاب

''فیصلوں کے نکات'' کا فارسی ترجمہ بھی ہم نے دیکھا۔ کتابیں معیاری کاغذ پر نسخ رسم الخط میں شائع ہوتی ہیں۔ فارسی کتابت کا فن بہت ترقی یافتہ ہے۔ خطاطی میں کئی رسم الخط استعمال ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں کمپیوٹر کی کمپوزنگ نے اُردو خطاطی کو خاصا نقصان پہنچایا اور خطاطی گلدستۂ طاقِ نسیاں ہوگئی لیکن کمپیوٹر ایرانی خطاطی کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ کتابوں کے ٹائٹل عموماً خطاط ہی تیار کرتے ہیں۔ فارسی حروفِ تہجی سے بڑی ''ے'' رخصت ہوچکی ہے' اس کی جگہ اگرچہ چھوٹی ''ی'' نے لے لی ہے' لیکن خطاطی میں یہ نہ صرف موجود ہے' بلکہ اس کا استعمال بھی کثرت سے ہوتا ہے۔ بہت سے الفاظ جو چھوٹی ''ی'' پر ختم ہوتے ہیں' جب انہیں خطاط لکھتا ہے تو وہ مختلف اقسام کی بڑی ''ے'' کے ساتھ لکھے جاتے ہیں۔ جرائد کی کمپیوٹر ڈیزائننگ حددرجہ جاذبِ نظر ہوتی ہے۔

تہران کی لائبریریاں انتہائی اعلیٰ پائے کی ہیں۔ کئی منزلہ نیشنل لائبریری کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ مُختلف زبانوں کی لاکھوں کتابیں اس لائبریری میں رکھی گئی ہیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی لائبریریاں بھی بہت عمدہ اور معیاری ہیں۔ دینی مدارس کی لائبریریاں بھی علم کا خزانہ ہیں۔ قُم میں آیت اللہ مرعشی کی لائبریری زیادہ تر قلمی نسخوں پر مُشتمل ہے۔ یہاں قرآنِ حکیم کے کئی نادر قلمی نسخے موجود ہیں۔ کتابوں کی حفاظت کے لئے جدید ترین انتظام کیا گیا ہے۔ جو اوراق وقت کے ساتھ ساتھ بوسیدہ ہو جاتے ہیں' انہیں محفوظ کرنے کا طریقہ بھی بروئے کار لایا گیا۔

چونکہ کتابیں انتہائی نادر اور قیمتی ہیں' اس لئے براہِ راست استفادہ کرنے کی بجائے علم کے متلاشیوں کو ان تک مائیکرو فلموں کے ذریعے رسائی دی جاتی ہے۔ لائبریری کی کئی منزلہ عمارت میں یہ سارے انتظامات یکجا ہیں۔ گراؤنڈ فلور پر آیت اللہ مرعشی کا مزار اس جگہ بنایا گیا ہے' جہاں اُنہوں نے ستّر برس تک عشاء کی نماز ادا کی۔ آیت اللہ مرعشی کا چھوٹا سا مدرسہ اس لائبریری کے بالکل سامنے محفوظ رکھا گیا ہے۔ یہاں بیٹھ کر وہ اپنے شاگردوں کو درس دیتے تھے۔

آیت اللہ مرعشی کے بارے میں بتایا گیا کہ انہوں نے غربت اور تنگدستی میں زندگی گزاری لیکن جو کتاب خانہ انہوں نے یادگار چھوڑا' وہ اتنا قیمتی ہے کہ مُتموّل لوگ بھی اتنی گرانقدر کتب جمع کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتے۔ یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ وہ شکم کی بھوک سے زیادہ علم کی پیاس بجھانے پر یقین رکھتے تھے اور جو رقم بھی میسر آتی' اسے کتابوں پر خرچ کر دیتے۔ اس طرح کی ہستیاں اب خال خال ہیں۔

تہران سے بڑی تعداد میں اخبارات و جرائد شائع ہوتے اور زیادہ تر فارسی زبان میں ہیں۔ ''تہران ٹائمز'' انگریزی روزنامہ ہے۔ فارسی کے اخبارات انتہائی معیاری اور خوبصورتی سے طبع ہوتے ہیں۔ کمپیوٹر ڈیزائننگ بڑی شاندار ہے۔ ان میں روزناموں' روزناموں کے علیحدہ خصوصی ایڈیشن' ہفت روزے اور ماہنامے شامل ہیں۔ روزانہ اخبارات کے خصوصی ایڈیشنوں کی اپنی الگ سرکولیشن اور مانگ ہے۔ سپورٹس' اقتصادی امور' خواتین' باورچی خانہ' گاڑیوں کی دیکھ بھال' کمپیوٹر غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے کے متعلق خصوصی جرائد شائع ہوتے ہیں۔

تہران میں روزنامہ ''اطلاعات'' کے دفتر جانے کا اتفاق ہُوا۔ یہ اخبار اگرچہ سرکاری اہتمام میں شائع ہوتا ہے' لیکن اخبار کے چیف ایڈیٹر کا کہنا ہے کہ وہ اپنی طے شدہ پالیسی پر آزادی سے عمل کرتے ہیں۔ اخبار کے وسائل کا اظہار وسیع و عریض رقبے پر تعمیر شدہ دفتر کی عالی شان عمارتوں' جدید ترین پرنٹنگ پریس اور دوسری سہولتوں کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ اخبار میں صحافیوں سمیت تمام شعبوں میں 1300 کارکن کام کرتے ہیں۔ اخبار معیاری اور دیدہ زیب ہے۔ کمپوزنگ سے لے کر طباعت تک تمام کام جدید ترین کمپیوٹروں پر ہوتا ہے۔ طباعت کے بعد اخبار کے بنڈل بھی

مشین پر بنتے ہیں۔ اخبار کی پرنٹنگ کے علاوہ اسی اخباری کمپنی کے دوسرے جرائد چھاپنے کے لئے علیحدہ پرنٹنگ پریس ہے جس پر دوسرے جرائد اور کتابوں کی پرنٹنگ ہوتی ہے۔ اس اخبار کو ہر لحاظ سے دُنیا کے کسی بھی بڑے اخبار کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ اخبار میں صحتِ زبان کا بہت لحاظ رکھا جاتا ہے۔ دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنانے اور انہیں رواج دینے کے لئے ایک لینگویج اتھارٹی قائم ہے' جس کی منظوری کے بغیر دوسری زبانوں کے الفاظ اندھا دُھند استعمال نہیں کئے جا سکتے۔

سٹاف اور دوسری ضرورتوں کے لئے 150 گاڑیوں کا بیڑہ اس کی ملکیت ہے۔ اس کی گیس کی ضروریات پوری کرنے کے لئے انتظامیہ نے دفتر کے احاطے کے اندر ہی ایک گیس سٹیشن بھی قائم کر رکھا ہے۔ دفتر میں سیوریج کی ڈسپوزل کا اپنا انتظام ہے۔ سیوریج کے پانی کو صاف کر کے صفائی وغیرہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اخباری کاغذ کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دو کارخانے قائم ہیں' تاہم یہ ضرورت کے مطابق کافی نہیں' اس لئے بیرونِ ملک سے بھی نیوز پرنٹ درآمد کیا جاتا ہے' جرائد البتہ اخباری کاغذ کے ساتھ ساتھ سفید فائن کاغذ پر بھی چھپتے ہیں۔

روزنامہ ''اطلاعات'' تقریباً آٹھ عشروں سے باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتا آ رہا ہے۔ نئی سہولتوں اور نئی ٹیکنالوجی کی آمد کے ساتھ ہی یہ اس پر شفٹ ہو جاتا ہے۔ اخبار کی تاریخ کئی ادوار پر مشتمل ہے۔ ابتدائی دور کے اخبارات اُس زمانے کی ٹیکنالوجی کے مطابق شائع ہوتے تھے۔ لیتھو' ونڈ ائیک' آفسٹ وغیرہ کے ادوار سے گزر کر اب جدید ترین کمپیوٹر ٹیکنالوجی پر شائع ہوتا ہے۔ کمپیوٹر پر تیار ہونے والی کاپی کمپیوٹر سے سیدھی پلیٹ میکنگ کے لئے بھیجی جاتی ہے۔ اخبار کے مختلف مراحل اور ادوار کا نظری خزینہ بلڈنگ کے اندر ہی موجود ایک چھوٹے سے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ اس عجائب گھر میں وہ تاریخی شمارے اور اُن کی اوریجنل کاپیاں بھی رکھی گئی ہیں جو ایران کی تاریخ پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اپنے خلاف تحریک کے نقطۂ عروج پر 16 جنوری 1979ء کو جب شاہِ ایران کو لہولہان کر کے فرار ہُوا تو 17 جنوری کے اخبار میں تقریباً آدھے صفحے پر ''شاہ رفت'' کی سرخی لگی۔ میوزیم میں اس اخبار کی پلیٹ بھی محفوظ ہے۔ کوئی تین ہفتے بعد فروری میں امام خمینیؒ کی فاتحانہ آمد کی جلی سرخی تھی: ''امام آمد''۔ ایک بادشاہ کی ''رفت'' اور دوسرے یعنی دِلوں کے راج دلارے کی ''آمد'' کے یہ لمحات اخبار کے عجائب گھر کے اندر پلیٹوں میں محفوظ ہیں۔ 1963ء میں جلا وطنی کے بعد امام خمینیؒ پہلی بار ایران آ رہے تھے۔ اس عرصے میں لاکھوں ایسے ایرانی پیدا ہوئے تھے جو انہیں پہلی بار اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے' ورنہ صورتِ حال یہ تھی کہ عشروں تک اُن کی تصویر بھی اخبارات کے لئے شجرِ ممنوعہ تھی۔ شاہ کی وزارتِ اطلاعات اُن کے خلاف بے سروپا مضامین شائع کراتی رہتی تھی۔ ایک ایسے ہی بے بنیاد مضمون پر اتنا احتجاج ہُوا کہ مظاہروں میں سینکڑوں لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

شہر کا دُنیا بھر میں مشہور بازار ''بازارِ بزرگ'' کہلاتا ہے۔ یہ اپنے نام کی رعایت سے واقعی بہت بڑا ہے۔ یہ ایک تھوک مارکیٹ ہے جہاں دُنیا کی ہر چیز دستیاب ہے۔ مارکیٹ کے اندر بینک ہیں' چائے خانے اور ریستوران ہیں۔ اتنے طویل بازار میں بھیڑ بھاڑ کا وہی عالَم ہے جو لاہور کے کشمیری بازار' سُوہا بازار یا پھر انارکلی میں ہوتا ہے۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے' ریڑھی والے بھی سامان لاد کر گزر رہے ہوتے ہیں اور گاہک بھی۔ دکانوں پر خریداروں کا ہجوم رہتا ہے۔ بازار میں ایرانی کرنسی کے علاوہ ڈالر سمیت عالمی کرنسیوں کا لین دین بھی ہوتا ہے۔ بازارِ بزرگ اتنا معروف ہے کہ اگر آپ صرف ''بازار'' ہی کہیں گے تو اس سے مراد بازارِ بزرگ ہی مراد لی جائے گی، بازارِ بزرگ کی طرف جو بسیں چلتی ہیں' اُن پر بھی صرف ''بازار'' ہی لکھا ہوتا ہے۔

سوویت روس کا المیہ

سابق سوویت یونین کے آخری صدر میخائل گورباچوف کی چشم کُشا تحریر

تاریر: **وقاص آفریدی**

1985ء میں سوویت یونین میں سیاسی ومعاشی اصلاحات پر مبنی جو نظام (PRESTROIKA) مَیں نے شروع کیا تھا' وہ ہمیشہ تندوتیز بحث کا موضوع رہا ہے۔آج اس بحث نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا ہے۔صرف اس لئے نہیں کہ اس کی سلور جوبلی بھی تین سال پیچھے رہ گئی ہے' بلکہ اس لئے بھی کہ آج روس کو ایک بار پھر ایک بڑی تبدیلی سے مقابلے کا سامنا ہے' ایسے حالات میں یہ مناسب ہے اور ضروری بھی کہ ذرا ماضی میں جھانک لیا جائے۔

''پریسٹرائیکا'' متعارف کرانے کے پیچھے یہ سوچ کارفرما تھی کہ ہماری قومی قیادت کو یہ ادراک ہوگیا تھا کہ ہم جس نظام کو چلا رہے ہیں' اس میں مزید پیش رفت کرنے اور آگے بڑھنے کی سکت نہیں رہی۔''سوویت نظام'' کی بنیاد سوشلزم تھی جو عظیم جدِ وجُہد اور قربانیوں کے بعد وقوع پذیر ہوا تھا۔ ابتداء میں اس نے مضبوط صنعتی بنیاد فراہم کر کے ہمارے ملک کو ایک بڑی طاقت بنا دیا تھا۔ ہنگامی حالات میں سوویت یونین بہت طاقتور تھی لیکن عام سے زیادہ معمول کے حالات میں اس نظام نے ہمیں سوائے شرمندگی کے کچھ نہیں دیا۔

یہ بات مجھ پر ہی نہیں بلکہ دوسرے نوجوان لیڈروں پر بھی عیاں تھی اور ان عمر رسیدہ پارٹی ممبرز پر بھی جو''اولڈ گارڈز'' کہلاتے تھے اور''یونین'' کے مستقبل کے بارے میں فکرمند تھے۔ مجھے مارچ 1985ء میں وزیر خارجہ آندرے گرومیکو کے ساتھ ہونے والی اپنی گفتگو یاد آرہی ہے جو سینٹرل کمیٹی کے اُس اجلاس سے چند گھنٹے پہلے ہوئی جس میں مجھے پارٹی کا نیا سیکرٹری جنرل چنا گیا۔گرومیکو اس بات پر متفق تھے کہ اب انقلابی تبدیلی کی اشد ضرورت ہے تاہم وہ اسے ایک بڑا''رسک'' بھی قرار دے رہے تھے۔

مجھ سے اکثر پوچھا جاتا تھا کہ مَیں اور میرے رفقاء جو کرنا چاہتے ہیں' کیا اس کے امکانات سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ جواب ہاں میں ہوتا اور نہ میں بھی۔ نہ مکمل اور نہ ہی فوراً۔ جسے ہم بدلنا چاہتے تھے' وہ تو صاف ظاہر تھا کہ ایک بے لچک ونظریاتی' سیاسی اور معاشی نظام' باقی دنیا کے ساتھ محاذ آرائی اور اسلحہ جمع کرنے کی اندھا دھند دوڑ تھا' یہ سب ترک کرنے میں ہمیں عوام کی مکمل تائید وحمایت حاصل تھی۔ پارٹی کے عہدیدار جو زبردست سٹالن نواز بنے ہوئے تھے' خاموش رہنے پر مجبور تھے' بلکہ ایک طرح سے رضامند ہوکر چپ ہورہے۔

بعد میں اُٹھنے والے سوالوں کے جواب دینا زیادہ مشکل ہے۔ ہمارے اہداف کیا تھے؟ ہم کیا حاصل کرنا چاہتے تھے؟ جاری نظام کی اوورہالنگ سے لے کر اس کے متبادل کی ضرورت واہمیت اجاگر کرنے تک کیا ہم نے بہت کم وقت میں بہت بڑی چھلانگ لگائی تھی؟ مَیں آج بھی ارتقائی تبدیلی کا حامی ہوں۔یعنی پیش قدمی اس طرح سے کہ نہ لوگوں کو نقصان پہنچے نہ ملک کو اور نہ خونریزی ہو۔

جب انقلابیوں نے ہمیں تیز رفتاری پر اُبھارا تو قدامت پرست ڈٹ گئے۔ بعد میں ہونے والے واقعات کی ذمہ داری دونوں گروہ قبول کریں' مَیں بھی اپنی ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔ میں صاف صاف الفاظ میں اقرار کرتا ہوں کہ ہم اصلاح پسندوں سے جو غلطیاں سرزد ہوئیں' وہ واقعتاً ہمارے اور ہمارے ملک کے لئے مہلک ثابت ہوئیں۔

ہماری سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ ہم نے کمیونسٹ پارٹی کی تطہیر کرنے میں بہت دیر کردی۔ پارٹی نے ''پرائسٹر ائیکا'' کی ابتدا کی مگر یہ جلد ہی ہماری ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا۔ پارٹی کی اشرافیہ نے اگست 1991ء میں میرا تختہ الٹنے کی کوشش کی جس سے اصلاحات کا بیڑہ غرق ہو گیا۔ ہم نے یونین میں شامل ریاستوں کے اتحاد کو نئی شکل دینے میں بھی بہت دیر کردی۔ اُنہیں ایک وحدت اختیار کئے کافی مدت گزر ہو چکی تھی۔ وہ اپنی اپنی معیشت اور اشرافیہ کے ساتھ اپنے طور پر مکمل ریاستیں بن چکی تھیں۔ ہمیں ان کے لئے ایک ایسا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت تھی جو ایک غیر وفاقی ڈیموکریٹک یونین کے جھنڈے تلے انہیں مکمل خودمختار ریاستوں کے طور پر زندہ رکھے۔ مارچ 1991ء میں قومی سطح کے ایک ریفرنڈم میں ستّر فی صد لوگوں نے خودمختار ریاستوں کے نئے نظریے کی حمایت میں رائے دی۔ اگست میں میرے خلاف ہونے والی بغاوت نے مجھے بحیثیت صدر کمزور کر دیا جس سے یہ خواب ناممکن ہو کر رہ گیا۔ نتیجتاً سال کے آخر تک سوویت یونین کا وجود ہی باقی نہ رہا۔

ہم نے اور بھی بہت سی غلطیاں کیں۔ سیاسی گرما گرمی میں ہمیں بگڑتی ہوئی معیشت کا خیال ہی نہ رہا۔ لوگوں نے روزمرہ استعمال کی اشیاء اور اشیائے صَرف کے لئے قطاروں میں لگنے کو کبھی معاف نہیں کیا۔

آج بھی ''پریسٹرائیکا'' کی کامیابیوں کو نظرانداز یا مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ آزادی اور جمہوریت کے لئے بہت بڑا اقدام تھا۔ آج اس کے بارے میں عوامی رائے لی جائے تو اس کے مخالفین بھی یہ بات ماننے بلکہ تحسین کرنے پر مجبور ہوں گے کہ اس کے نتائج اچھے ہی تھے۔ مرکزی مطلق العنانیت کا خاتمہ' آزادیِ اظہار' اسمبلی یعنی اجتماعات منعقد کرنے کا حق' مذہبی سیاسی و معاشی سرگرمیوں کی کھلی آزادی ان نتائج کے چند پہلو ہیں۔

سوویت یونین کے انہدام کے بعد روسی قیادت نے مزید انقلابی اصلاحات کو اپنایا۔ ان کی ''شاک تھراپی'' ان کے اندازے سے زیادہ مہلک ثابت ہوئی۔ عوام کی اکثریت غربت تلے دب کر رہ گئی۔ غریب اور امیر کی آمدنی کا فرق رائی سے پہاڑ بن گیا۔ صحتِ عامہ اور تعلیم وثقافت کے شعبوں کا حلیہ بگڑ گیا۔ روس کی صنعتی بنیاد ہلنے لگی۔ اس کی معیشت کا مکمل انحصار تیل اور قدرتی گیس کی برآمد پر رہ گیا۔

نئی صدی کے موڑ پر ہم تباہ حال معیشت کے ساتھ مکمل تباہی کے دہانے پر کھڑے تھے۔ جمہوریت خطرے میں تھی۔ 1996ء میں صدر بورس یلسن کا انتخاب اور 2000ء میں اُن کے نامزد کردہ ''وارث'' ولادی میر پیوٹن کو اقتدار کی منتقلی بظاہر جمہوری عمل تھا مگر درحقیقت معاملہ اس کے برعکس تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب مَیں روس میں جمہوریت کے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہونے لگا۔

مجھے احساس تھا کہ روس کو جن حالات کا سامنا تھا' وہاں ریاست کا وجود ہی خطرے میں پڑ چکا تھا' اس لئے ہر وقت یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہی کچھ کیا جائے' جو کتابوں میں لکھا ہے۔ ایسے لمحات میں انتہائی سخت مگر فیصلہ کُن حتیٰ کہ آمرانہ اقدام بھی کرنا پڑتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے پیوٹن کے پہلے دورِ صدارت میں اُس کے اقدامات کی حمایت کی۔ ایسا کرنے والا اکیلا مَیں ہی نہیں تھا بلکہ اسّی فیصد لوگوں نے اُس کی

حمایت کی۔

ملکی استحکام کو تقویت دینا ہی واحد اور حتمی نصب العین قرار نہیں دیا جا سکتا۔ روس کو آج ترقی اور جدید خطوط پر استوار کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ باہمی انحصار پر قائم دنیا کی قیادت کر سکے۔ گزشتہ پانچ برسوں میں ہمارا ملک اس مقصد کی جانب پیش رفت نہیں کر سکا' باوجود یکہ ہم نے گزشتہ ایک دہائی میں اپنی اہم برآمدات یعنی تیل اور گیس سے بے پناہ پیسہ کمایا ہے۔ عالمی کساد بازاری نے دوسرے ملکوں کی نسبت روس کو زیادہ سخت اقتصادی دھچکا پہنچایا ہے جس کے لئے ہمیں کسی دوسرے کو نہیں' بلکہ خود کو موردِ الزام ٹھہرانا چاہیے۔ روس تبھی اعتماد کے ساتھ قدم آگے بڑھا سکتا ہے' اگر وہ صحیح جمہوریت کے راستے پر چلے۔ حال ہی میں اس سلسلے میں بہت سی حماقتیں کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر تمام اہم فیصلے حکمرانوں کے ایک ٹولے نے کئے جبکہ پارلیمنٹ کو معمول کی منظوری دینے والی یعنی محض مہر لگانے والا دفتر بنا کر رکھ دیا گیا۔ عدلیہ کی آزادی سوالیہ نشان بن کر رہ گئی ہے۔ ہمارے ہاں کوئی ایسا پارٹی سسٹم بھی نہیں ہے جو ہمیں واضح اکثریت کے ساتھ جیت کر آنے کے قابل بنانے کے ساتھ ساتھ' حزبِ اختلاف کے نقطۂ نظر کو بھی سامنے آنے کا موقع دے جس کی روشنی میں تمام نقطۂ ہائے نظر کو سامنے رکھ کر اہم فیصلے کئے جا سکیں۔ یہ احساس روز بروز بڑھتا جا رہا ہے کہ حکومت سول سوسائٹی سے خوفزدہ اور ہر چیز اپنے ہاتھ میں رکھنے کی خواہش مند ہے۔

کیا ہم یہی کچھ کرنے کے لئے وہاں ہیں؟ کیا ہم تھکے ہوئے پرانے سسٹم کی طرف واپسی چاہتے ہیں؟ میرا نہیں خیال کہ بشمول قیادت کوئی ایک بھی ایسا چاہتا ہے۔ مَیں صدر کے الفاظ میں مضمر خطرے کی بُو سونگھ رہا ہوں جب انہوں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کیا ہم خام اشیاء پر مبنی فرسودہ معاشی ڈھانچے اور بدعنوانی کے سائے میں مستقبل میں قدم رکھیں گے؟ انہوں نے ایسے آسودہ حال معاشرتی ڈھانچے کی تشکیل کے بارے میں انتباہ کیا کہ جہاں حکومت ہی سب سے بڑی آجر' سب سے بڑی پبلشر اور سب سے بڑی پیداواری قوت ہو۔ نظامِ انصاف جس کی مٹھی میں ہو' یہاں تک کہ وہ اپنی ذات میں قوم بھی خود ہی ہو' وہاں صورتِ حال کیا ہوگی؟

مجھے صدر سے اتفاق ہے' میں ان کے مقرر کردہ جدیدیت کے ہدف سے بھی متفق ہوں' لیکن اس ہدف کا حصول عوام کو ایک طرف کر کے یا انہیں محض شطرنج کے مہروں کی طرح استعمال کرنے سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ عام آدمی کو بطور ایک فرد کے کردار سونپنے اور شہری ہونے کا احساس دلانے کا واحد راستہ جمہوریت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قانون کی حکمرانی اور حکومت اور عوام کے درمیان ایک کُھلا دیانتدارانہ مکالمہ بھی ضروری ہے۔

اس وقت ایک انجانے خوف نے روس کو جکڑ رکھا ہے۔ عوام اور حکام دونوں ہی اس خدشے میں مبتلا ہیں کہ جدیدیت کا عمل ان کے ملک کو کہیں عدم استحکام یا کسی اور خلفشار کا شکار نہ کر دے۔ سیاست میں خوف سب سے بُرا رہنما ہے۔ ہمیں اس پر لازماً قابو پا کر اس سے نکلنا ہوگا۔

آج روس میں آزادانہ سوچ کے حامل ایسے افراد کی کمی نہیں جو آگے بڑھ کر جمہوری اقدار کی پاسداری کی ذمہ داری نبھانے کے لئے تیار اور جمہوریت کا علم بلند کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں' لیکن ان سے استفادہ کرنے کا انحصار خود حکومت کے طرزِ عمل پر ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ حکومتِ روس چاہتی ہے؟

بنگسا مورو: نئی اسلامی ریاست

مسئلہ کشمیر کو بُھول بُھلا کر بھارت سے دوستی کے لئے بے چین عناصر اور اپنی آزادی کی خاطر سب کچھ قربان کر دینے والے اہلِ کشمیر کے لئے یکساں مفید تحریر

محمد ایوب منیر

جنوبی فلپائن کے مورو مسلمان برس ہا برس کی قربانیوں کے بعد وسیع تر خودمختاری کے حصول میں کامیاب ہو گئے۔ حکومت فلپائن اور مورو اسلامک لبریشن فرنٹ کے درمیان گذشتہ 12 برس سے جاری مذاکرات نتیجہ ثابت ہوئے۔ 15 اکتوبر 2012ء کو طے پانے والے معاہدے کے تحت جزائر منڈاناؤ' سولو کے مسلمان نہ صرف خودمختاری حاصل کر لیں گے بلکہ 2015ء میں ان کی آزاد مسلم ریاست بھی وجود میں آ جائے گی جس پر رومن کیتھولک فلپائن حکومت کو کسی طرح کا اختیار حاصل نہ ہوگا۔

اس معاہدے کو ''فریم ورک معاہدہ برائے حتمی قیامِ امن'' کا نام دیا گیا ہے۔ مورو اسلامک لبریشن فرنٹ کے مصالحت کار رمھا گر اقبال اور حکومتِ فلپائن کے مصالحت کار ماروک لیونن نے منیلا کے صدارتی محل میں اس تاریخی دستاویز پر دستخط کیے۔

وسیع تر خودمختاری کے حصول کے بعد چھاپہ مار کارروائیاں بند ہو جائیں گی۔ آزادی کی منزل اور مسلم ریاست کے قیام کی جدّ وجُہد میں ڈیڑھ لاکھ مورو مسلمان جامِ شہادت نوش کر چکے ہیں۔ بنگسا مورو وطن کا تنازعہ ایشیا کے قدیم اور پیچیدہ تنازعات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل' امریکہ' روس' تمام اسلامی ممالک اور OIC کے سیکریٹری جنرل نے اس معاہدے کا خیر مقدم کہ اس سے نہ صرف ایشیا میں امن قائم ہوگا بلکہ فلپائن کی حکومت بھی اپنے عوام کے لیے دائمی امن وسکون کے قیام کو یقینی بنا سکتی ہے۔ مورو اسلامک لبریشن فرنٹ کے بارہ ہزار مجاہدین سروں پر کفن باندھ کر میدانِ عمل میں ڈٹے رہے۔ گذشتہ پچاس برس میں منڈانو' سولو' سلاوان کے مسلمانوں نے جس قسم کے اقتصادی' معاشرتی' سیاسی اور مذہبی بائیکاٹ کا سامنا کیا اور نسل در نسل جس قدر قربانیاں دیں' وہ ایک الگ داستان ہے۔

وسیع تر حقوق اور وسیع تر خودمختاری کے معاہدے کو رُو بہ عمل لانے کے لیے حکومت' فوج' پولیس' بنک' بلدیہ' ایکسچینج اور دیگر اہم اداروں کی تشکیل کے لیے درجنوں کمیشن تشکیل دے دیے گئے ہیں جس میں دونوں جانب سے نامزد نمائندے شامل ہیں۔

جس وقت معاہدے پر دستخطوں کی تقریب منعقد ہو رہی تھی' ہزاروں مورو مسلمان اپنے قصبوں' شہروں اور دیہات میں نعرہ ہائے تکبیر بلند کر رہے تھے۔ خواتین نے تہذیب وشرافت اور وقار کے دائرے میں رہ کر' اسلامی روایات کے عین مطابق بڑے بڑے جلوسوں کی صورت میں استعمار سے نجات کے آغاز کا خیر مقدم کیا۔ میڈیا میں اسے شہ سرخیوں میں جگہ دی گئی۔

وسیع تر خودمختاری کی حامل ریاست کا نام' بنگسا مورو (مورو مسلمانوں کا گھر) ہوگا۔ 13 صفحات پر مشتمل دستاویز میں واضح طور پر تحریر کیا گیا ہے کہ مورو مجاہدین بتدریج مسلم پولیس فورس میں مدغم ہو جائیں گے۔ پندرہ افراد پر مشتمل عبوری کمیشن مستقل دستور تشکیل دے گا۔ نئی خودمختار ریاست پانچ

صوبوں پر مشتمل ہے۔ باسلان، کوٹاباٹو، دواوڈیل سور، سلطان قدرت، تاوی، سولو، داوی، دِیولوگ اور دیتان کے علاقے ان پانچ صوبوں میں شامل ہیں۔ 1994ء میں حکومتِ فلپائن نے مورو لبریشن فرنٹ سے معاہدے کے بعد اس علاقے کو خودمختار قرار دینے کا اعلان کیا، لیکن بوجوہ اس پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ 2008ء میں ہونے والا ایک اور معاہدہ بھی مسلمانانِ بنگسا مورو کے لیے نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکا تھا۔ مورو لبریشن فرنٹ، جو گذشتہ برسوں میں حکومت سے معاہدے کرتا رہا ہے، کا کہنا ہے کہ ہمیں ہر دم چوکنا رہنے اور شدید دباؤ برقرار رکھنے کی ضرورت ہے، ورنہ کسی وقت بھی پینترا بدل سکتا ہے۔

مسلمان یہاں سیکڑوں برس سے آباد ہیں۔ 1570ء میں پرُتگیزیوں نے اس علاقے پر قبضہ کیا تھا۔ یہ علاقے قدرتی وسائل سے مالا مال ہیں۔ سونے، چاندی، تانبے، زرخیز زرعی زمین، چاول، کپاس، گنا، گوشت اور سیکڑوں میل پھیلی ہوئی سمندری پٹی کے ساتھ بے حد و حساب مچھلی و سمندری خوراک کی دستیابی ملک کی معیشت کو مستحکم کرنے اور تعمیر و ترقی میں مددگار ثابت ہوگی۔

ہمسایہ ملک ملائیشیا کی طرح یہاں کے مسلمان بھی اسلامی روایات پر نسل در نسل عمل پیرا چلے آ رہے ہیں۔ اُمید کی جاتی ہے کہ یہاں جلد ہی ایسی حکومت قائم ہو جائے گی جو دینِ اسلام کے حقیقی نفاذ کا عزم رکھتی ہے۔ اس حوالے سے اطمینان بخش بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی دونوں بڑی تنظیموں میں داخلی اختلافات کے باوجود خلافتِ راشدہ کی طرز پر ریاست کے قیام پر کوئی اختلاف نہیں۔

اللہ تعالےٰ رحم و کرم فرمائے اور شیطانوں کے شر سے محفوظ رکھے کہ بنگسا مورو کے خودمختار ریاست بننے کا اعلان ہی ہُوا ہے کہ مغربی طاقتوں نے وہاں ''القاعدہ ایجنٹوں'' کی موجودگی کا شوشہ چھوڑ دیا ہے، لیکن اس پر پریشانی کی ہرگز ضرورت نہیں۔ کیونکہ بقول حکیم الامت علامہ اقبالؒ یہ

دلیرانِ کشمیر کے لئے!

جس سَمت میں چاہے صفتِ سَیلِ رَواں چل
وادی یہ ہماری ہے، وہ صحرا بھی ہمارا

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دَو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سَرِ دارا

حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہُنر کر
کہتے ہیں کہ شیشہ کو بنا سکتے ہیں خارا

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدّر کا ستارا

محروم رہا دولتِ دریا سے وہ غوّاص
کرتا نہیں جو صحبتِ ساحل سے کنارا

دِیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملّت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو اُبھارا

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

تقدیرِ اُمَم کیا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا

اخلاصِ عمل مانگ نیاگانِ کُہن سے
''شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا''!

—— اقبالؒ

کوئی نئی بات تو نہیں ہے

ستیزہ کار رہا ہے اَزل سے تا اِمروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بُولہبی

سٹیو جابز ۔ بزبانِ خود

اسٹین فورڈ کالج کے طلبہ سے بابائے ایپل کا خطاب

تاریخ: **تسنیم مامون چیمہ**

عزیز طلبہ! میرے لیے یہ بات باعثِ اعزاز ہے کہ میں آج دنیا کی بہترین یونی ورسٹیوں میں سے ایک میں' آپ سے مخاطب ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے تعلیم کے حصول کے لیے کسی یونیورسٹی کی شکل نہیں دیکھی' حتیٰ کہ کسی کالج سے گریجویشن تک نہیں کیا' مگر آج میں اپنی زندگی کی کچھ کہانیاں آپ کو سُنانا چاہتا ہوں۔ اگرچہ یہ کوئی معرکتہ الآرا واقعات نہیں' محض تین کہانیاں ہیں۔

پہلی کہانی "Connecting the Dots" نقطوں کو باہمی طور پر ملانے سے متعلق ہے۔ مجھے چھ ماہ بعد ہی ریڈ کالج سے نکال دیا گیا تھا' مگر اس کے باوجود میں 18 ماہ تک کالج کے چکر لگاتا رہا اور آخر کار قطعی طور پر کالج سے باہر ہو گیا۔ مجھے کالج سے نکالا کیوں گیا؟ یہ کہانی میری پیدائش سے قبل شروع ہوئی۔ دراصل میری اصلی ماں' ایک نوجوان غیر شادی شدہ کالج گریجویٹ تھی۔ اُس نے میری پیدائش سے بھی قبل یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ مجھے کسی کالج گریجویٹ ہی کو گود دے گی اور پھر قرعہ فال ایک وکیل اور اس کی اہلیہ کے نام نکلا' مگر عین میری پیدائش کے دن وکیل اور اس کی بیوی نے یہ کہہ کر مجھے گود لینے سے انکار کر دیا کہ ''ہم درحقیقت کسی بچّی کو گود لینا چاہتے ہیں۔'' ویٹنگ لسٹ پر جو اگلے والدین تھے' انہیں نصف شب فون کر کے اطلاع دی گئی کہ ہمارے پاس ایک بچہ موجود ہے' کیا آپ اسے لینا پسند کریں گے؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا' لیکن میری حقیقی ماں کو جب علم ہوا کہ اب میرے والد کی ذمّے داری سنبھالنے والا شخص ہائی اسکول سے گریجویٹ نہیں' تو اس نے مجھے گود دینے کے لیے تیار کیے جانے والے کاغذات پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور بالآخر صرف اس شرط پر مجھے گود دینے پر آمادہ ہوئیں کہ میری تعلیم و تربیت پر کوئی سمجھوتا نہیں ہوگا۔ مجھے صحیح وقت پر کالج میں داخل کروایا جائے گا۔ لیکن مجھے سترہ سال بعد کالج جانا نصیب ہوا۔ میرا بھولپن دیکھیے' میں نے جس کالج کا انتخاب کیا' وہ اتنا ہی مہنگا تھا' جتنا اسٹین فورڈ کالج۔ نتیجتاً میرے محنت کش والدین کی تمام تر کمائی اور بچت میری کالج فیس کی نذر ہونے لگی' جب کہ میں نے جن مضامین کا انتخاب کیا' مجھے ان سے کچھ خاص دلچسپی بھی نہ تھی۔ چھ ماہ بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میری زندگی کا بدترین فیصلہ ہے۔ میں نے کالج سے نکل جانے کی ٹھانی اور واقعی ایک روز نکال دیا گیا۔ آج جب مُڑ کے پیچھے دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں' یقیناً وہ میری زندگی کا بہترین فیصلہ تھا۔ اگرچہ یہ سب کچھ زیادہ رومانوی نہیں تھا کہ میرے پاس تو ذاتی کمرہ تک نہ تھا۔ میں اپنے ایک دوست کے کمرے میں فرش پر سوتا۔ میں پانچ سینٹ میں کوک کی بوتلیں واپس کر کے اپنے لیے کھانے کا انتظام کرتا۔ ہر اتوار کو سات میل پیدل سفر کر کے ہری کرشنا مندر تک جاتا تاکہ ہفتے میں کم از کم ایک دن تو ڈھنگ کا کھانا نصیب ہو' لیکن پھر بھی یہ مجھے اچھا لگتا تھا کہ در در کی ٹھوکریں کھا کے اپنے تجسّس اور وِجدان کے سبب کچھ پانا بھی ایک بہترین تجربہ ہے۔ اُس زمانے میں ریڈ کالج خطاطی کے حوالے سے مُلک بھر میں رہنمائی فراہم کرنے والا

بہترین ادارہ تھا۔ کیمپس میں بننے والا ہر پوسٹر، لیبل، فن پارہ ایک شاہ کار ہوتا۔ میں چوں کہ باقاعدہ کسی کالج کا طالب علم نہیں تھا، تو میں نے خطاطی کی کلاسز لینے کا فیصلہ کیا۔ میں سیکھنا چاہتا تھا کہ کسی بھی تحریر کی بناوٹ کے کیا کیا زاویے، شکلیں، انداز ممکن ہو سکتے ہیں۔ حروف کے درمیان فاصلہ کتنا ہونا چاہیے۔ کس لفظ کو کس شکل میں ڈھالا جائے، تو وہ حسین تر ہو جاتا ہے، خصوصاً ٹائپوگرافی کتنا عظیم فن ہے۔ میں نے اُن کلاسز کے دوران یہ سب کچھ سیکھا، اگرچہ مجھے یقین نہیں تھا کہ اس فن سے مجھے آئندہ زندگی میں کوئی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ مجھے تجربات کرتے رہنا پسند تھا، شاید اسی لیے ٹھیک دس برس بعد جب ہم نے پہلا میکنٹوش کمپیوٹر متعارف کروایا تو اس عمل کے دوران میری اُس تمام محنت کی قیمت وصول ہو گئی جو میں نے خطاطی سیکھنے کے لیے کی تھی۔ آج مجھے سو فی صد یقین ہے کہ اگر میں خطاطی کی وہ کلاسز نہ لیتا تو دنیا ''میک'' کی اس بہترین اور خوب صورت ٹائپوگرافی سے کبھی متعارف نہ ہوتی۔ ٹائپ کی مختلف اشکال اور فونٹس، الفاظ کے درمیان مناسب فاصلہ اور وہ سب کچھ جو پرسنل کمپیوٹر ونڈوز کا خاصہ ہے، سب انہی خطاطی کی کلاسز کا نتیجہ ہے۔ جب میں کالج میں تھا، تو نقطوں کو آگے کی طرف بڑھانا، ایک دوسرے سے جوڑنا یقیناً ناممکن تھا، لیکن آج دس برس بعد جب پیچھے کی طرف مُڑ کے دیکھتا ہوں تو انہی نقطوں کو ان دس برسوں سے جوڑنا قطعاً مشکل نہیں لگتا۔ اگرچہ آج بھی نقطوں کو آگے کی طرف منسلک کرنا ناممکن ہے، لیکن یہ آگے بڑھتے نقطے ہی دراصل ایک بہترین مستقبل کی نوید ہیں، اگر آپ یقین رکھیں کہ یہ نقطے ایک روز بہت حسین منزل پر جا کر منتج ہوں گے، تو آپ زندگی سے کبھی مایوس نہیں ہوں گے۔ یہی قوت، خواہش، جوش و ولولہ آج مجھے اس مقام تک لایا ہے۔ اسی یقین اور اعتماد نے مجھے کبھی ٹوٹنے نہیں دیا کہ نقطے، نقطوں سے مل کے بالآخر ایک شاہ کار کی تخلیق کا سبب بنتے ہیں۔

یہ ہے میری پہلی کہانی: "Connecting the Dots"

میری دوسری کہانی محبت اور کھو دینے کی کہانی ہے، "Love and Loss" کی کہانی۔ میں اس اعتبار سے خاصا خوش نصیب ہوں کہ میں نے ابتدائی عمر ہی میں وہ مقصد ڈھونڈ لیا، جسے پانا چاہتا تھا۔ وہی کیا، جو میرے لیے بہترین تھا۔ میں نے اور واز (دوست) نے ایپل کی بنیاد، والد کے گیراج میں رکھی، تب میں 20 برس کا نوجوان تھا۔ اور آج 2 افراد سے شروع ہونے والا کام دو ارب ڈالر مالیت کی ایک کمپنی کا روپ دھار چکا ہے، جس سے چار ہزار کارکن منسلک ہیں اور ہم دنیا کے سامنے میکنٹوش کی صورت اپنی بہترین تخلیق بھی پیش کر چکے ہیں۔

ایک سال قبل، جی ہاں، ایک سال قبل مجھے اُس کمپنی سے بے دخلی کا صدمہ بھی سہنا پڑا، جس کا میں روحِ رواں تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کسی کمپنی کے تخلیق کار اور بانی ہوں اور اسی کمپنی سے آپ کو نکال باہر کیا جائے، مگر ایسا بھی ہوتا ہے، اور یہ میرے ساتھ ہوا۔ دراصل جب ''ایپل'' کامیابی کی طرف گام زن ہوئی تو میں نے سوچا، کیوں نہ کمپنی کے لیے ایسے شخص کی خدمات حاصل کی جائیں، جو حقیقتاً بہت باصلاحیت ہو اور کمپنی کو آگے لے جانے میں معاون ثابت ہو۔ میری خواہش پوری ہوئی، سال بھر سب کچھ ''بہت اچھا'' ہوتا بھی رہا، مگر جب ہم نے مستقبل کے شان دار منصوبوں پر کام شروع کیا، تو پیچیدگیاں بڑھنا شروع ہو گئیں اور میرے اپنے ہی تشکیل کردہ بورڈ آف ڈائریکٹرز نے میرے مقابلے میں اُسے سراہا اور مجھے کمپنی سے نکال دیا گیا۔ یہ سب باقاعدہ علانیہ طور پر ہوا۔ اُس لمحے مجھے لگا، مَیں ایک بار پھر صفر پر آ گیا ہوں۔ زندگی نے مجھے دوبارہ وہیں لا پٹخا ہے، جہاں سے سفر کا آغاز ہوا تھا۔ چند ماہ تو میری سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ آخر میں کیا کروں، اسی دوران میری ملاقات بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ارکان، ڈیوڈ پیکارڈ اور باب نوئس سے ہوئی۔ پچھلی

غلطیوں کی تلافی اور ازالے کی بات ہوئی۔ امید کی ایک ننھی کرن پھر سے طلوع ہوئی۔ ''ایپل'' میرا وسیلۂ روزگار ہی نہیں' میرا عشق' میرا جنون تھا' لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ وقت' جب مجھے ایپل سے نکالا گیا' میری زندگی کا ایک بہت یادگار دور اور میرے شاندار مستقبل کی طرف ایک اہم پیش رفت تھی۔ کامیابی کا خمار توڑنے میں بے کاری کا ایک دھکا خاصا معاون ہوتا ہے اور پھر یہی دھکا ایک نئی تخلیقی دنیا میں داخلے کا موجب بنتا ہے۔ تب ہی یہ چند برس کا عرصہ میری زندگی کا بہترین تخلیقی دور ثابت ہوا۔

اگلے پانچ برس میں' مَیں نیکسٹ اور پکسر کے نام سے دو نئی کمپنیوں کا آغاز کر چکا تھا۔ اور اسی عرصے میں' میری زندگی میں ایک بہترین عورت داخل ہوئی۔ میں محبت جیسے ان مول رشتے اور بے مثل احساس سے آشنا ہوا۔ وہ شان دار عورت' آج میری قیمتی متاع' میری بیوی ہے۔ ان ہی پانچ برسوں کے دوران پکسر کے تحت دنیا کی پہلی کمپیوٹر انیمیٹڈ فلم' ٹوائے اسٹوڈیو ہماری ملکیت ہے۔ ''ایپل'' نے نیکسٹ کو خریدنے میں دل چسپی ظاہر کی اور پھر اسے خرید بھی لیا۔ مَیں ایک بار پھر ایپل میں تھا۔ اس کے بعد ایپل کے بینز تلے ان تمام ٹیکنالوجیز کا بھرپور استعمال ہوا' جو ہم نے نیکسٹ اور پکسر کے ذریعے حاصل کی تھیں۔ اسی عرصے میں مَیں' لورین (اہلیہ) اور میرے بچوں (ایوا ایرن اور ریڈ) نے ایک آئیڈیل فیملی کی حیثیت سے وقت گزارا۔ مجھے سو فی صد یقین ہے کہ اگر میں ایپل سے نکالا نہ جاتا تو آج اس قدر کام یاب انسان نہ ہوتا۔ وہ بہت کڑوی گولی تھی' مگر مرض کے علاج کے لئے کڑوی گولی ہی ضروری ہوتی ہے۔ کبھی زندگی ایسی چپت لگاتی ہے کہ آپ سیدھے کسی دیوار سے جا ٹکراتے ہیں' لیکن وہ ٹکّر حوصلہ نہ ہارنے دے اور ایک نئی راہ پر گامزن کر دے' تو وہ یقیناً کسی نعمت سے کم نہیں ہوتی۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ جو بات مجھے آگے اور آگے بڑھنے پر آمادہ کرتی رہی' وہ میری' میرے کام سے محبت تھی وہ کام جس کے ساتھ ہمیں اپنی زندگی کا بیش تر وقت گزارنا ہوتا ہے' وہ کام جو ہمیں' ہمارے چاہنے والوں کی نظر میں معتبر کر دیتا ہے۔ میں ''عظیم کام'' کرنے پر یقین رکھتا ہوں۔ مجھے اپنے کام سے عشق تھا اور میں نے اپنے اس جنون کی لَو کبھی مدھم پڑنے نہیں دی۔ آپ بھی' اپنے دل و دماغ کو مجتمع کریں' آپ جان جائیں گے کہ آپ درحقیقت چاہتے کیا ہیں۔ جس طرح رشتے' بندھن وقت کے ساتھ ساتھ خوب صورت' مضبوط تر ہوتے جاتے ہیں' اسی طرح آپ کی اپنے کام سے لگن اور شدید محبت بھی ایک ''شان دار کامیابی'' کی صورت میں بہترین ہمراہی ثابت ہوتی ہے۔

> میں ہر صبح آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا اور سوچتا کہ اگر یہ دن میری زندگی کا آخری دن ہُوا' تو کیا مَیں وہ سب حاصل کر سکوں گا' جو کرنا چاہتا ہوں۔ جب جواب آتا ''نہیں'' تو مَیں پہلے سے زیادہ مستعد ہو جاتا۔ کمر کس لیتا کہ منزل کے حصول کے لیے آج کا دن بے حد اہم ہے۔ یاد رکھیں ''اہم ترین'' پر توجہ مرکوز رکھیں۔ معمولی اور نظر انداز کیے جانے کے قابل باتوں پر ہرگز توجہ نہ دیں۔ ناکامی کے خوف کو کام یابی کی راہ میں روڑے نہ اٹکانے دیں' تو دنیا کی کوئی طاقت آپ کو کام یاب ترین انسان بننے سے نہیں روک سکتی۔

میری تیسری کہانی موت کے گرد گھومتی ہے۔ اُس موت کے گرد' جو زندگی کی سب سے تلخ حقیقت ہے۔ میں جب 17 برس کا تھا' میں نے ایک قول پڑھا: ''اگر آپ زندگی کے ہر دن کو' زندگی کا آخری دن سمجھ کے گزاریں تو اِک روز آپ یقیناً دنیا کے کام یاب ترین انسان ہوں گے۔'' پھر اس روز کے بعد سے آج تک' میں نے اپنی زندگی کے اگلے 33 برس کا ہر دن زندگی کا آخری دن سمجھ کے گزارا۔

ایک سال قبل، میرے جسم میں کینسر کی تشخیص ہوئی۔ صبح ساڑھے سات بجے کا وقت تھا، جب سکیننگ رپورٹ نے میرے لبلبے میں ٹیومر کی نشان دہی کی۔ حد تو یہ ہے کہ میں اُس وقت، یہ تک نہیں جانتا تھا کہ درحقیقت لبلبہ ہوتا کیا ہے جسم میں اس کے افعال کیا ہیں، مگر ڈاکٹرز نے سخت نا اُمیدی کا اظہار کرتے ہوئے مجھے چھ ماہ کا وقت دے دیا۔ ڈاکٹرز نے کہا یہ کینسر لاعلاج ہے، آپ گھر جائیں اور اپنے اُن تمام کاموں کو جلد از جلد ترتیب وار انجام دے لیں، جو آپ کے خیال میں نہایت اہم ہیں۔ میں سوچ رہا تھا، میں محض چھ ماہ میں، وہ تمام امور کیسے انجام دے لوں جو میں نے اگلے دس برس کے لیے پلان کر رکھے ہیں۔ میں چھ ماہ میں اپنی بیوی، بچّوں سے وہ ساری باتیں کیسے کرلوں، جو مجھے کم از کم اگلے دس برس تک کرنا تھیں۔ کیا میں اتنی جلدی دنیا کو ''خدا حافظ'' کہہ دوں۔

میں نے اُس تشخیصی رپورٹ کے ساتھ صرف ایک دن گزارا۔ شام کو میری لبلبہ کی بائیوآپسی ہونا تھی اور جب اینڈواسکوپی کے لیے میرے حلق کے راستے لبلبے میں سوئی داخل کی گئی اور وہ ٹیومر کے کچھ ٹشوز باہر کھینچ لائی، جن کا خُردبین کے ذریعے مشاہدہ ہونا تھا، تو یقین کیجیے، وہ میری زندگی کا سب سے ناقابلِ یقین لمحہ تھا۔ لیبارٹری میں موجود میری بیوی اور ڈاکٹرز باقاعدہ آنسوؤں سے رو رہے تھے کہ میرے لبلبے میں پلنے والا سرطان، ان چند کم یاب کینسرز میں سے تھا جو قابلِ علاج تھے۔ یہ میری زندگی کی موت سے قریب ترین ملاقات تھی۔ میں یہ سوچ کر ہی جی اٹھا کہ اب میں یقیناً اپنے آئندہ برس کے عزائم پایہ تکمیل تک پہنچا سکوں گا۔ بلاشبہ مرنا کوئی بھی نہیں چاہتا۔ موت کا تصور بھی ہولناک ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ موت کا ایک دن مقرر ہے۔ ہمارے پاس جینے کے لیے محدود وقت ہے اور ہمیں اسی محدود وقت میں اپنے اہداف حاصل کرنے ہیں۔ میرے کینسر کے ''قابلِ علاج'' ہونے کا مژدہ ہم سب میں ایک نئی روح دوڑا گیا۔ مَیں ایک کامیاب سرجری کے عمل سے گزرا اور آج ایک صحت مند انسان کے روپ میں آپ کے سامنے ہوں۔

جب مَیں نوجوان تھا، اُس وقت "Whole earth catalog" کے نام سے ایک جریدہ شائع ہوا۔ یہ اسٹیوارٹ بانڈ کی کاوش تھی۔ اس میں وہ زندگی کو بڑے شاعرانہ رُخ سے سامنے لایا۔ پرسنل کمپیوٹر کی سہولت اُس وقت موجود نہ تھی۔ ٹائپ رائٹرز، قینچیاں اور پولورائیڈ کیمرے ہی ایسی تخلیقات کے موجب بنتے تھے۔ اسٹیوارٹ اور اس کی ٹیم نے اس جریدے کے کئی شمارے نکالے، مگر جب اسے نصاب کا حصّہ بنانے کا فیصلہ ہوا تو پھر اس کا ایک آخری شمارہ مارکیٹ میں آیا۔ اس آخری شمارے کے بیک کور پر ایک تصویر شائع ہوئی تھی۔ اس میں صبح سویرے اک نئے دن کا آغاز کا منظر تھا جب ہر شخص بے حد متجسّسانہ انداز میں ایک بالکل نئے سفر پر گامزن ہوتا ہے۔ تلاش اور حصول کے سفر پر رواں دواں، جیسے اِک نئے شہر میں کوئی اجنبی مسافر اور نیچے صرف ایک سطری کیپشن تھا: ''بھوکے رہو، احمق رہو'' کہ ہمیشہ بھوک اور حماقت ہی انسان کو تلاش و جستجو اور زندگی میں کچھ کر گزرنے پر آمادہ اور مائل بہ پرواز رکھتی ہے۔ دنیا کے سارے بھید راز، اسرار و رموز اسی حماقت اور بھوک ہی کی سبب آشکار ہوتے ہیں۔ ہر عظیم کامیابی انہی کی مرہونِ منت ہے۔

تو عزیز طلبہ! آج آپ کے گریجویشن کی تکمیل اور کالج کے آخری دن کے موقع پر، جب کہ یہاں سے آپ اپنی عملی زندگی کا باقاعدہ آغاز کرنے جا رہے ہیں، مَیں اسی پیغام کے ساتھ رخصت چاہوں گا: ''بھوکے رہو، احمق رہو''!

1896ء – 2012ء

اولمپکس کا سفر

عتیق احمد

اولمپکس مقابلوں کے انعقاد کی ابتدائی تاریخ شہر ''اولمپیا'' سے جُڑی ہوئی ہے۔اب تک کے اولمپکس کا مختصر جائزہ پیشِ خدمت ہے:

ایتھنز اولمپکس-1896

جدید اولمپکس کا اولین میدان اپنی جنم بھومی یعنی یونان کے شہر ایتھنز میں گرم ہُوا۔ حیرت اور خوشی کے جذبے کے ساتھ سجایا جانے والا بین الاقوامی کھیلوں کا یہ میلہ 6 اپریل سے 15 اپریل تک جاری رہا' جس میں انجام دی جانے والی ہر کارکردگی کو جدید اولمپکس کا ریکارڈ ساز لمحہ کہا جا سکتا ہے۔ اولیں اولمپکس مقابلوں میں شریک چودہ ممالک میں سے دس ملکوں کے کھلاڑیوں نے تمغے حاصل کیے۔ان مقابلوں میں امریکا نے سونے کے گیارہ تمغوں کے ساتھ اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ واضح رہے کہ پہلے اولمپکس مقابلوں میں خواتین کھلاڑیوں کو شرکت کی اجازت نہ دی گئی۔

پیرس اولمپکس-1900

نئی صدی کے پہلے اولمپکس 14 مئی سے 28 اکتوبر تک پیرس میں جاری رہے۔ان مقابلوں میں 24 ملکوں کے 997 کھلاڑیوں نے 19 کھیلوں میں شرکت کی۔ کھیلوں کا مرکزی اسٹیڈیم Velodrome de Vincennes تھا۔ان اولمپکس کی خاص بات برطانیہ سے تعلق رکھنے والی Charlotee Cooper کی فتح تھی' جنہوں نے ٹینس سنگل کا مقابلہ جیت کر سونے کا تمغہ اور تمغہ جیتنے والی پہلی خاتون کا اعزاز حاصل کیا۔ پیرس کے چودہ مختلف مقامات پر ہونے والے ان مقابلوں میں میزبان ملک فرانس سونے کے 26 تمغوں کے ساتھ سرِفہرست رہا۔

سینٹ لوئیس اولمپکس-1904

اولمپکس 1904ء امریکہ کے شہر سینٹ لوئیس (میسوری) میں یکم جولائی سے 23 نومبر تک جاری رہے۔ان مقابلوں کا افتتاح متمول امریکی تاجر اور سیاست داں David R Francis نے کیا۔مقابلوں میں سترہ کھیلوں کے 91 ایونٹس میں 651 کھلاڑیوں نے شرکت کی' جن کا تعلق 12 مختلف ممالک سے تھا۔کھیلوں کا مرکزی اسٹیڈیم واشنگٹن یونیورسٹی کا Francis Field کیمپس تھا۔ان مقابلوں میں میزبان ملک امریکہ نے سونے کے 78 تمغے جیت اول پوزیشن حاصل کی۔

لندن اولمپکس-1908

لندن میں ہونے والے یہ مقابلے روم میں منعقد ہونا تھے' تاہم نیپلز شہر کے اطراف آتش فشاں Vesuvius کے پھٹنے کے باعث انہیں لندن منتقل کر دیا گیا۔ یہ مقابلے 27 اپریل سے 31 اکتوبر تک جاری رہے۔ 22 ملکوں کے 2,008 کھلاڑیوں نے 22 کھیلوں کے 110 ایونٹس میں حصہ لیا۔لندن کے وائٹ سٹی اسٹیڈیم میں منعقد ہونے والے ان مقابلوں کا افتتاح بادشاہ ایڈورڈ ہفتم نے کیا تھا۔ان کھیلوں میں

اولمپکس کی تاریخ کا اب تک کا واحد موقع آیا تھا' جب سونے کے تمغے کے حصول کے لیے جیتنے والا بلا مقابلہ (walkover) فاتح قرار دیا گیا۔ان مقابلوں میں برطانیہ 56 سونے کے تمغوں کے ساتھ سرِفہرست رہا اورامریکہ دوسرے نمبر پر۔

اسٹاک ہوم اولمپکس-1912

سوئیڈن کے دارالحکومت اسٹاک ہوم میں یہ مقابلے 5 مئی سے 22 جولائی تک منعقد ہوئے۔ مقابلوں کا مرکزی مقام اولمپیا اسٹیڈیم اسٹاک ہوم تھا' جس میں 14 کھیلوں کے 102 ایونٹس منعقد ہوئے۔28 ممالک کے 2,406 کھلاڑیوں نے شرکت کی۔کھیلوں کا افتتاح سوئیڈن کے بادشاہ گستاف پنجم نے کیا تھا۔یہ واحد اولمپکس ہے جس میں میراتھن ریس کے دوران پرتگال سے تعلق رکھنے والا ایک کھلاڑی Francisco Lazaro جان کی بازی ہار گیا تھا۔مقابلوں کا فاتح ملک امریکا تھا جس نے 25 سونے کے تمغے حاصل کیے تھے' جب کہ میزبان ملک سوئیڈن ایک تمغے کی کمی سے دوسرے نمبر پر رہا۔

اینٹورپ اولمپکس-1920

پہلی جنگِ عظیم کے اختتام پر ہونے والے یہ مقابلے بلجیئم کے شہر Antwerp میں منعقد ہوئے تھے۔20 اپریل سے 12 ستمبر تک جاری رہنے والے ان مقابلوں میں 29 ممالک کے 2,626 کھلاڑیوں نے شرکت کی تھی۔مجموعی طور پر 22 کھیلوں کے 154 ایونٹس منعقد کیے گئے تھے۔کھیلوں کا افتتاح بادشاہ ایڈورڈ اول نے کیا تھا۔مقابلوں میں امریکا نے سونے کے 41 تمغوں کے ساتھ اول پوزیشن حاصل کی جب کہ سوئیڈن دوسرے نمبر پر رہا۔

پیرس اولمپکس-1924

1924 کے اولمپکس مقابلے پیرس میں منعقد ہوئے تھے۔کھیلوں کا افتتاح

> 1936ء کے اولمپکس میں جرمنی کے کھلاڑیوں نے ہٹلر کے خوف سے سخت محنت اور بھرپور جذبے کا مظاہرہ کیا۔ نتیجہ سونے کے 33 تمغے جیت کر جرمنی کی پہلی پوزیشن کی صورت میں سامنے آیا

فرانس کے صدر Gaston Doumergue نے 4 مئی کو کیا تھا' جب کہ کھیل 27 جولائی تک جاری رہے۔ان مقابلوں میں 44 ملکوں کے 3,089 کھلاڑیوں نے شرکت کی تھی۔ مجموعی طور پر 17 کھیلوں کے 126 ایونٹس منعقد ہوئے۔ ان مقابلوں میں امریکا کے ایتھلیٹ Harold Osbom نے ہائی جمپ اور ٹرپل جمپ میں ورلڈ ریکارڈ قائم کیا تھا۔مجموعی طور پر امریکا 45 سونے کے تمغوں کے ساتھ اول جب کہ فن لینڈ دوسرے نمبر پر رہا۔

ایمسٹرڈیم اولمپکس-1928

دو دفعہ منتخب نہ کیے جانے کے بعد ایمسٹرڈیم کو 28 جولائی سے 12 اگست تک اولمپکس گیمز منعقد کرانے کا اعزاز حاصل ہوا۔ مقابلوں کا افتتاح نیدرلینڈ کے شہزادے Hendrik نے کیا۔مالی طور پر خسارے میں جانے والے ان اولمپکس میں 46 ملکوں کے 2,883 کھلاڑیوں نے 15 کھیلوں کے 109 ایونٹس میں حصہ لیا۔ یہ اولمپکس اس لحاظ سے یادگار ہیں کہ کسی بھی ایشیائی ملک کی جانب سے پہلا سونے کا تمغہ جاپان کے Mikio Oda نے ٹرپل جمپ کے مقابلے میں حاصل کیا تھا۔ان مقابلوں میں امریکہ 22 سونے کے تمغوں کے ساتھ اول جب کہ جرمنی دوئم رہا۔

لاس اینجلس اولمپکس-1932

شدید عالمی کساد بازاری کے باعث لاس اینجلس میں منعقد ہونے والے ان مقابلوں میں پچھلے اولمپکس کی نسبت نصف کھلاڑیوں نے شرکت کی

تھی۔ 30 جولائی سے 14 کھیلوں کے 16 ایونٹس منعقد ہوئے۔ ان مقابلوں کا افتتاح صدر امریکہ ہربرٹ ہوور کی عدم شرکت کے باعث نائب صدر چارلس کرٹس کے ہاتھوں ہوا۔ کھیلوں کا اختتام امریکہ کی سونے کے 41 تمغوں کی جیت کے ساتھ ہوا۔

برلن اولمپکس-1936

ہٹلر کے عروج میں منعقد کیے جانے والے ان اولمپکس میں ہٹلر نے یہودیوں کی شرکت پر پابندی لگا دی تھی' تاہم بعد میں عالمی دباؤ کے باعث اس نے یہ فیصلہ واپس لے لیا تھا۔ ہٹلر ہی کے ہاتھوں یکم اگست کو کھیلوں کا افتتاح ہوا' جو 16 اگست تک جاری رہے۔ برلن میں ہونے والے ان مقابلوں میں 49 ممالک کے 3,963 کھلاڑیوں نے 19 کھیلوں کے 129 ایونٹس میں حصہ لیا۔ ہٹلر کے خوف سے جرمن کھلاڑیوں نے نہایت محنت اور جذبے سے کھیلوں میں حصہ لیا جس کا نتیجہ 33 سونے کے تمغوں کے ساتھ جرمنی کی اول پوزیشن کی صورت میں سامنے آیا۔

لندن اولمپکس-1948

بارہ سال کے وقفے کے بعد ہونے والے ان مقابلوں میں جنگِ عظیم دوم کی تباہ کاریوں کے باوجود 59 ممالک کے 4,104 کھلاڑیوں نے شرکت کی۔ جاپان اور جرمنی کو دوسری جنگِ عظیم میں جارحانہ رویوں کے باعث شرکت کی دعوت نہیں دی گئی۔ مجموعی طور پر 17 کھیلوں کے 136 ایونٹس منعقد ہوئے۔ کھیلوں کا اختتام 14 اگست کو امریکہ کی 38 سونے کے تمغوں کے ساتھ جیت پر ہوا۔ دوسری پوزیشن سوئیڈن نے حاصل کی۔ ان کھیلوں کی یادگار کارکردگی تین بچوں کی والدہ Fanny Blankers-Koen کی تھی۔ تیس سالہ فینی نے ایتھلیٹکس میں سونے کے چار تمغے حاصل کیے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہونے والے ان پہلے اولمپکس میں پاکستان نے 35 کھلاڑیوں کے ساتھ پہلی مرتبہ شرکت کی۔

- 1896ء میں پہلی بار جدید اولمپکس منعقد کروانے والے ملک یونان کو 2004ء میں 108 سال بعد دوبارہ اولمپکس کی میزبانی کا موقع ملا
- 1904ء کے اولمپکس میں یادگار کارکردگی امریکہ کے جارج ایزر کی تھی۔ جارج کی ایک ٹانگ ایک حادثے میں ضائع ہوگئی تھی۔ انہوں نے لکڑی کی مصنوعی ٹانگ کے ساتھ کھیلتے ہوئے 6 تمغے جیت کر دُنیا کو حیران کر دیا
- 1948ء کے اولمپکس میں یادگار کارکردگی 3 بچوں کی والدہ 30 سالہ فینی بلینکرز کی تھی جنہوں نے ایتھلیٹکس میں سونے کے 4 تمغے جیتے

ہیلسنکی اولمپکس-1952

دوسری جنگِ عظیم کے باعث 1940ء میں فن لینڈ کے شہر ہیلسنکی میں ہونے والے اولمپکس گیمز منسوخ کر دیئے گئے تھے تاہم فن لینڈ کو یہ اعزاز 1952ء میں حاصل ہو گیا۔ اس ایونٹ میں بہت سے ریکارڈ قائم ہوئے۔ مجموعی طور پر 69 ممالک کے 4,955 کھلاڑیوں نے 17 کھیلوں کے 149 ایونٹس میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ کھیلوں کا افتتاح 19 جولائی کو صدر Juho Kusti Paasikivi نے کیا' جب کہ اختتامی تقریب تین اگست کو منعقد ہوئی۔ ان کھیلوں میں پہلی مرتبہ سوویت یونین اور اسرائیل نے شرکت کی۔ کھیلوں کی فاتح امریکہ کی ٹیم رہی' جس نے سونے کے چالیس تمغے جیتے' سوویت یونین نے پہلی شرکت میں دوسری پوزیشن حاصل کر کے سب کو حیران کر دیا۔

میلبورن اولمپکس-1956

آسٹریلیا کے شہر میلبورن میں منعقد ہونے والے یہ مقابلے اس لحاظ سے منفرد تھے کہ گھڑ سواری کے مقابلے گھوڑوں کی طبی جانچ اور نگہداشت یعنی قرنطینہ (Quarantine) کے باعث پانچ ماہ قبل سوئیڈن کے شہر اسٹاک ہوم میں منعقد کیے گئے۔ اسی طرح یہ مقابلے پہلے مرتبہ براعظم یورپ اور

شمالی امریکا سے باہر منعقد ہوئے۔ کھیلوں کا آغاز 22 نومبر کو پرنس فلپ نے کیا' جب کہ کھیلوں کا اختتام 8 دسمبر کو ہوا۔ ان مقابلوں میں 72 ممالک کے 3,314 کھلاڑیوں نے حصہ لیا۔ 17 کھیلوں کے 145 ایونٹس ہوئے۔ مرکزی میدان کے لیے مشہورِ زمانہ میلبورن کرکٹ گراؤنڈ کو منتخب کیا گیا۔ ان مقابلوں میں تمغوں کی دوڑ میں سوویت یونین نے امریکہ کو شکست دی اور 37 تمغوں کے ساتھ اول پوزیشن حاصل کی۔ پاکستان نے ہاکی میں چاندی کا تمغہ حاصل کیا جو پاکستان کا اولمپکس کا اولیں تمغہ تھا۔

روم اولمپکس-1960

اٹلی کے شہر روم میں منعقد ہونے والے یہ مقابلے پاکستان کے لیے انتہائی یادگار ہیں۔ ان مقابلوں میں پاکستان نے پہلی مرتبہ ہاکی کا فائنل جیت کر سونے کا تمغہ حاصل کیا' جب کہ محمد بشیر نے فری اسٹائل پہلوانی میں کانسی کا تمغہ جیتا۔ 25 اگست سے 83 ممالک کے 5,338 کھلاڑیوں نے 17 کھیلوں کے 150 ایونٹس میں شرکت کی۔ کھیلوں کا افتتاح صدر Giovanni Gronchi نے کیا۔ مقابلوں کا فاتح ایک مرتبہ پھر سوویت یونین رہا' جب کہ امریکہ دوسرے نمبر پر آیا۔ دونوں ملکوں نے بالترتیب 43 اور 34 سونے کے تمغے حاصل کیے۔

ٹوکیو اولمپکس-1964

ٹوکیو میں منعقد ہونے والے یہ مقابلے براعظم ایشیا کے اولیں اولمپکس مقابلے تھے' جن میں 93 ممالک کے 5,151 کھلاڑیوں نے شرکت کی۔ ان اولمپکس میں 19 کھیلوں کے 163 ایونٹس کا اہتمام کیا گیا تھا۔ دس اکتوبر سے 24 اکتوبر تک جاری رہنے والے ان مقابلوں کا افتتاح جاپان کے شہنشاہ ہیروہیٹو نے کیا تھا۔ کھیلوں کے اختتام پر امریکہ کو بالادستی حاصل ہوئی۔ اس نے سونے کے 36 میڈل جیتے' سوویت یونین تیس تمغوں کے ساتھ دوسرے نمبر پر رہا۔ پاکستان نے ہاکی کے مقابلوں میں چاندی کا تمغہ حاصل کیا۔

میکسیکو سٹی اولمپکس-1968

میکسیکو سٹی میں منعقد ہونے والے یہ مقابلے لاطینی امریکی خطے کے پہلے اولمپکس مقابلے تھے۔ 12 سے 27 اکتوبر تک جاری رہے۔ 112 ممالک کے 5,530 کھلاڑیوں نے 20 کھیلوں کے مقابلوں میں حصہ لیا۔ ان مقابلوں میں امریکہ نے سونے کے 45 تمغے حاصل کیے' جب کہ دوسرے نمبر پر رہتے ہوئے سوویت یونین نے 29 تمغے جیتے۔ پاکستان نے ایک مرتبہ پھر ہاکی فائنل جیت کر سونے کا تمغہ اپنے نام کیا۔

میونخ اولمپکس-1972

میونخ میں منعقد ہونے والے ان اولمپکس مقابلوں کو کھیل سے زیادہ اولمپک ویلج میں ہونے والی قتل و غارت گری کے باعث یاد کیا جاتا ہے' جس میں 6 اسرائیلی کھلاڑیوں سمیت 17 افراد دہشت گردی کا نشانہ بنے تھے۔ یہ اولمپکس 26 اگست سے 10 ستمبر تک منعقد ہوئے۔ افتتاح صدر Gustav Heinemann نے کیا تھا' مقابلوں میں 121 ممالک کے 7,170 کھلاڑیوں نے شرکت کی تھی اور 23 کھیلوں کے 195 ایونٹس کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سوویت یونین ایک مرتبہ پھر فاتح ٹھہرا' جس نے سونے کے 50 تمغے حاصل کیے' جب کہ امریکہ 33 تمغوں کے ساتھ دوسرے نمبر پر رہا۔ پاکستان کی ہاکی ٹیم اپنے اعزاز کا دفاع نہ کر سکی اور اسے چاندی کے تمغے پر اکتفا کرنا پڑا۔

مونٹریال اولمپکس-1976

ملکہ ایلزبتھ دوئم کے ہاتھوں افتتاح پذیر ہونے والے ان مقابلوں کا انعقاد کینیڈا کے شہر مونٹریال میں ہوا۔ کھیلوں کا آغاز 17 جولائی اور اختتام یکم اگست کو ہوا۔ مقابلوں میں 92 ممالک کے 6,028 کھلاڑیوں نے

21 کھیلوں کے 198 ایونٹس میں شرکت کی۔ مجموعی طور پر سوویت یونین نے سونے کے 49 تمغے حاصل کیے' اس کے روایتی حریف امریکہ کے بجائے مشرقی جرمنی دوسرے نمبر پر رہا جس نے سونے کے 40 تمغے جیتے۔ پاکستان ہاکی میں تیسرے نمبر پر رہا۔

ماسکو اولمپکس-1980

افغانستان پر سوویت یونین کی جارحیت کے باعث اولمپکس گیمز کا بڑے پیمانے پر بائیکاٹ کیا گیا' تاہم ماسکو میں ہونے والے یہ اولمپکس 19 جولائی سے 3 اگست تک جاری رہے۔ مقابلوں کا افتتاح سوویت یونین کے سربراہ مسٹر برزنیف نے کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بائیکاٹ کے باوجود 80 ممالک کے 5,179 کھلاڑیوں نے شرکت کی۔ حیرت انگیز طور پر بائیکاٹ کرنے والے ممالک کے بہت سے کھلاڑیوں نے اپنے ملک کے بجائے اولمپکس کے پرچم تلے شرکت کی۔ مجموعی طور پر 21 کھیلوں کے 203 ایونٹس کا انعقاد کیا گیا۔ امریکہ کے بائیکاٹ کے باعث سوویت یونین سونے کے 80 تمغوں کے حصول میں کامیاب رہا۔

لاس اینجلس اولمپکس-1984

سوشلسٹ بلاک نے ان اولمپکس کا بائیکاٹ کیا تاہم 140 ممالک کے 6,829 کھلاڑیوں کی شرکت نے 23 کھیلوں کے 221 ایونٹس میں مہارت دکھائی۔ لاس اینجلس میں منعقد ہونے والے ان کھیلوں کا افتتاح امریکی صدر رونالڈ ریگن نے 28 جولائی کو کیا۔ پاکستانی ہاکی ٹیم نے سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ امریکہ سونے کے 83 تمغے جیت کر اول رہا۔

سیؤل اولمپکس-1988

براعظم ایشیا کا دوسرا اولمپک میلہ جنوبی کوریا کے شہر سیؤل میں 17 ستمبر سے 2 اکتوبر تک جاری رہا۔ ان مقابلوں میں 160 ممالک کے 8,391 کھلاڑیوں نے شرکت کی۔ مجموعی طور پر 27 کھیلوں کے 263 ایونٹس میں

- قیامِ پاکستان کے بعد پہلے اولمپکس (1948) میں 35 کھلاڑیوں پر مشتمل پاکستانی دستے نے پہلی بار شرکت کی
- 1960ء کے اولمپکس میں پاکستان نے پہلی بار ہاکی کا گولڈ میڈل جیتا
- 1988ء کے اولمپکس میں پاکستان نے ایک بار پھر ہاکی کا گولڈ میڈل جیتا
- 1996ء کے اولمپکس کے نمایاں کھلاڑی یونان کے 50 سالہ سپائی ریڈن تھے۔ مشکیزے میں پانی بھر کر بیچنے (بہشتی) کے پیشے سے منسلک سپائی ریڈن نے میراتھن ریس میں اول پوزیشن حاصل کر کے سونے کا تمغہ جیتا
- بیجنگ اولمپکس 2008ء ''ایک دُنیا-ایک خواب'' کے نعرے کے ساتھ منعقد ہوئے' ان میں 204 ممالک کے 11,028 کھلاڑیوں نے شرکت کی۔ یہ ممالک اور کھلاڑیوں کی اب تک کی ریکارڈ تعداد ہے
- 2012ء کے اولمپکس کے دو پہلو منفرد تھے: سعودی عرب' قطر اور برونائی کی خواتین کھلاڑیوں نے پہلی بار اولمپکس میں حصہ لیا اور خواتین کی باکسنگ کے مقابلے پہلی بار اولمپکس کھیلوں کا حصہ بنے

کھلاڑیوں کو اپنی صلاحیتیں دکھانے کا موقع ملا۔ کھیلوں کا افتتاح Roh Tae-woo نے کیا۔ اسکائی ڈائیورز نے فضا میں اولمپکس کے پانچ دائرے بنا کر افتتاحی تقریب کو یادگار بنا دیا۔ عالمی سیاسی تبدیلیوں کے باعث یہ سوویت یونین اور مشرقی جرمنی کے آخری مقابلے ثابت ہوئے۔ ان مقابلوں میں سوویت یونین نے 55 اور مشرقی جرمنی نے 37 سونے کے تمغے حاصل کر کے بالترتیب اول اور دوئم پوزیشن حاصل کی۔ پاکستان کے محمد حسین شاہ نے باکسنگ کے مڈل ویٹ مقابلے میں کانسی کا تمغہ جیت کر پاکستانی قوم کو تحفہ پیش کیا۔

بارسلونا اولمپکس-1992

170 ممالک کے 9,356 کھلاڑیوں نے 25 جولائی سے 19 اگست تک 32 کھیلوں کے 286 ایونٹس میں حصہ لیا۔ مقابلوں کا افتتاح اسپین کے

بادشاہ Juan Carlos نے کیا۔ان اولمپکس کی اہم بات سابق سوویت یونین کی بارہ ریاستوں کا Commonwealth of Independent States کی حیثیت سے شرکت کرنا تھا۔اس ٹیم کو Unified ٹیم کا نام دیا گیا تھا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ پہلی اور آخری مرتبہ شرکت کرنے والی اس ٹیم نے سونے کے 45 تمغوں کے ساتھ اول پوزیشن حاصل کی اور امریکہ سونے کے 37 تمغوں کے ساتھ دوسرے نمبر پر رہا' جب کہ پاکستان نے ہاکی میں تیسری پوزیشن حاصل کرتے ہوئے کانسی کا تمغہ جیتا۔

اٹلانٹا اولمپکس-1996

امریکہ کے شہر اٹلانٹا میں منعقد ہونے والے ان اولمپکس مقابلوں میں 197 ممالک کے 10,320 کھلاڑیوں نے شرکت کی۔کھیلوں کا افتتاح 19 جولائی کو صدر بل کلنٹن نے کیا' جب کہ اختتام 4 اگست کو ہوا۔متحدہ جرمنی اور روس کے نام سے دو نئے ملک شریک ہوئے۔26 کھیلوں کے 271 ایونٹس میں کھلاڑیوں نے شرکت کی۔مقابلوں کا اختتام امریکہ کے 44 اور روس کے 26 سونے کے تمغوں کے ساتھ اول اور دوئم پوزیشنوں پر ہُوا۔

سڈنی اولمپکس-2000

15 ستمبر سے یکم اکتوبر تک جاری رہنے والے ان مقابلوں میں 199 ممالک کے 10,651 کھلاڑیوں نے 28 کھیلوں کے 300 ایونٹس میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔افتتاح آسٹریلیا کے گورنر جنرل Sir William Deane نے کیا۔ جمناسٹک مقابلوں میں چین کی خواتین کی ٹیم کو کم عمر کھلاڑی کھلانے کے باعث اپنے سونے کے تمغے سے ہاتھ دھونا پڑا۔یہ تمغہ دوسرے نمبر پر آنے والی امریکی ٹیم کو دے دیا گیا۔مجموعی طور پر مقابلوں کا فاتح امریکہ ٹھہرا جس نے سونے کے 37 تمغے جیتے۔

ایتھنز اولمپکس-2004

اولمپکس کی جنم بھومی یونان کو 108 سال بعد ایک بار پھر اولمپکس منعقد کرانے کا اعزاز حاصل ہوا' جس میں 201 ممالک کے 10,625 کھلاڑیوں نے شرکت کی۔مقابلے 13 سے 29 اگست تک جاری رہے۔ کھیلوں کا افتتاح یونانی صدر نے کیا۔امریکہ نے سونے کے 35 تمغوں کے ساتھ اول پوزیشن حاصل کی۔چین محض تین تمغوں کی کمی سے دوسرے نمبر پر رہا۔چین نے اپنی کارکردگی سے کھیلوں کے حلقوں کو حیرت زدہ کر دیا۔

بیجنگ اولمپکس-2008

''ایک دنیا' ایک خواب'' کے خوب صورت موٹو کے ساتھ منعقد کیے گئے اولمپکس 2008ء میں سب سے زیادہ ممالک اور کھلاڑیوں نے شرکت کی۔ 8 اگست سے 25 اگست تک بیجنگ میں منعقد ہونے والے ان مقابلوں میں 204 ممالک کے 11,028 کھلاڑیوں نے شرکت کی۔ ان کھلاڑیوں نے 28 کھیلوں کے 302 ایونٹس میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔افتتاح چین کے صدر Hu Jintao کے ہاتھوں ہوا۔اولمپکس 2008ء میں 43 عالمی ریکارڈ اور 122 نئے اولمپکس ریکارڈ قائم ہوئے۔ چین نے سونے کے 51 تمغوں کے ساتھ اول پوزیشن حاصل کی' جب کہ امریکہ 36 تمغوں کے ساتھ دوسری پوزیشن پر رہا۔

لندن اولمپکس-2012

27 جولائی سے 12 اگست 2012ء تک سٹیرڈ فورڈ لندن میں برپا ہوئے۔ 204 ممالک کے دس ہزار سے زائد کھلاڑیوں نے حصہ لیا۔سعودی عرب' قطر اور برونائی کی خواتین کھلاڑیوں نے پہلی بار اولمپکس میں حصہ لیا۔ خواتین باکسنگ کے مقابلے بھی پہلی بار اولمپکس کھیلوں کا حصہ بنے۔ امریکہ پہلے اور عوامی جمہوریہ چین دوسرے نمبر پر رہا۔

ریوڈی جنیرو اولمپکس-2016

برازیل کا صدر مقام ریوڈی جنیرو جنوبی امریکہ کے پہلے میزبان شہر کے اعزاز کے ساتھ آئندہ اولمپکس کی میزبانی کرے گا۔

روہنگیا مسلمان

سلیم منصور خالد

برما (موجودہ نام میان مار) کی شمال مغربی ریاست اراکان (تبدیل شدہ نام رکھائن) کے صدر مقام اکیاب (تبدیل شدہ نام سائٹوے) میں، مسلم کش فسادات میں لاتعداد مسلمان قتل کر دیئے گئے، زخمیوں کا کوئی ذکر نہیں۔ دنیا برسوں بعد، کبھی کبھار اس نوع کی کوئی خبر پڑھ لیتی ہے۔ دیکھنے سننے کی نوبت اس لیے نہیں آتی کہ سمعی و بصری ذرائع ابلاغ کے کار پردازوں کے لیے اس میں کوئی خبریت، دلچسپی اور مفاد نہیں ہے۔ پڑھنے کو کچھ ملتا ہے تو وہ روایتی انداز کا، ناقص اور نامکمل ہوتا اور اکثر خلافِ واقعہ وحقیقت بھی۔ سوال یہ ہے کہ یہ مسئلہ ہے کیا؟

یہ برما کے زیرِ قبضہ یا زیرِ انتظام صوبے اراکان کی بات ہے۔ بیس ہزار مربع میل پر محیط یہ خطہ ایک مسلم مملکت تھا، جس پر 1784ء میں برما نے قبضہ کر لیا تھا۔ 1824ء میں اراکان پر برطانیہ کا تسلط ہُوا۔ 48-1947ء میں انگریزوں نے انخلاء کیا تو اہلِ اراکان کی شدید خواہش اور کوشش کے باوجود کشمیر، حیدر آباد اور جونا گڑھ جیسی ریاستوں کی طرح اراکان کو بھی خود مختاری دی گئی نہ پاکستان کا حصہ بنایا گیا۔ اراکان ایک مسلم اکثریتی خطہ تھا اور آج بھی ہے۔ ہر چند کہ حقیقی اور حتمی اعداد و شمار دست یاب نہیں اور نہ قابض برمی حکومت اس کا کوئی اہتمام کرتی ہے، مگر محتاط اندازہ ہے کہ آج بھی اراکان میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ساٹھ فی صد سے کم نہیں۔ اس تعداد میں وہ مسلمان شامل نہیں ہیں جو گزشتہ صدی عیسوی میں دونوں عالمی جنگوں کے موقعوں پر بچ تو گئے تھے مگر جبری انخلاء اور ترکِ وطن یا ہجرت سے محفوظ نہ رہ سکے۔

اوسطاً سال میں ایک مرتبہ اراکان میں بڑے پیمانے پر مسلمانوں کے خلاف کارروائی کی جاتی ہے یا مذہبی و نسلی فساد برپا کروایا جاتا ہے۔ سیکڑوں قتل، ہزاروں زخمی اور لاکھوں بے گھر کر دیئے جاتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ اور مواصلات کی حیرت انگیز ترقی کے باعث حکمرانوں کی ہزار کوشش کے باوجود رنگون سے کچھ نہ کچھ خبریں باہر نکل ہی آتی ہیں، مگر اراکان کی صورتِ حال بالکل مختلف ہے۔ وہ اس کے غیر مسلم باشندوں کے لیے تو نہیں، لیکن مسلمانوں کے لیے ضرور ایک محصورہ ہے جس سے سب کچھ چھوڑ کر، خالی ہاتھ، ننگے پاؤں، تن کے کپڑوں میں کبھی واپس نہ آنے کے لیے باہر نکل سکتے ہیں۔ نہیں نکلیں گے تو کسی روز مار دیئے جائیں گے ورنہ فقر و فاقے، خوف و ذلت، بیماری و مسکنت اور غلامی کی زندگی گزارتے رہیں۔

میانمار کی حکومت بظاہر اس منظر نامے میں تماشائی دکھائی دیتی ہے، لیکن حکومت اور انتظامیہ کی ہر حرکت یہ بتاتی ہے کہ وہ براہِ راست اس قتلِ عام اور درندگی کے کھیل میں برابر کی شریک ہے۔ برمی بدھ لیڈروں اور عبادت کے نام پر فارغ بدھ بھکشوؤں کے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کی دبی چنگاری نے آناً فاناً غیظ و غضب کی آگ میں تبدیل ہو کر پورے اراکان کو اپنی لپیٹ میں ہی نہیں لیا، بلکہ اس کو بڑھانے کے لیے وہاں مسلسل فضا بنائی گئی۔ 14 جولائی 2012ء کو برمی صدر تھن سین نے اعلان کیا: ''روہنگیا مسلمانوں کو

میانمار سے نکالا اور اقوامِ متحدہ کے کیمپوں میں دھکیلا جائے گا۔ اس مسئلے کا واحد حل لازماً یہی ہے''۔ (تہران ٹائمز' 15 جولائی 2012ء) برما میں 3 جون 2012ء سے اُٹھنے والی خونیں یلغار میں 28 ہزار سے زیادہ مسلمان موت کے گھاٹ اُتارے گئے۔ جن مظلوموں نے جان بچا کر پڑوسی ملک کے ساحلوں پر جانے کی کوشش کی' انہیں وہاں کی ساحلی پولیس نے پہلے تو خشکی پر قدم ہی نہیں رکھنے دیا' چند گھنٹے کے لیے ساحل پر اُترنے دیا اور بعد ازاں انہی کی کشتیوں میں ٹھونس کر کھلے سمندر میں دھکیل دیا۔ دنیا بھر کا میڈیا اس المیے سے عملاً نظر چرائے رہا اور مسلم دنیا کے میڈیا نے بھی اس سفاکی میں برابر لاتعلقی برتی۔ اس قتلِ عام پر سنگ دلی کا رویہ اُن خاتون نے بھی اختیار کیا' جنہیں لوگ آنگ سان سوچی کے نام سے جانتے ہیں' جو اپنے ملک میں انسانی حقوق کی پامالی کا مقدمہ پیش کرتے ہوئے ایک بے نیام تلوار قرار دی جاتی ہیں' مگر مظلوم مسلمانوں سے ہمدردی کے لیے ان کے پاس دو بول تک نہ تھے۔ انہیں اس سے کوئی غرض تھی اور نہ کوئی پریشانی کہ حکمران فسادی بدھوں کے سرپرست ہیں۔ نوبیل انعام یافتہ آنگ سان سوچی برمی مسلمانوں کو برما کا شہری بھی تسلیم نہیں کرتیں۔ انہوں نے لندن سکول آف اکنامکس میں' 28 جون 2012ء کو خطاب کرتے ہوئے کہا: ''روہنگیا مسلمانوں کو برما کا شہری نہیں تسلیم کیا جانا چاہیے''۔ دس ڈاؤننگ سٹریٹ میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اس مسئلے پر ایک حرف نہ کہا' جب صحافیوں نے سوال اُٹھایا تو صرف اتنا کہا: ''اس نسلی فساد کا دانش مندی سے جائزہ لینا چاہیے''۔

'روحنگ' اصطلاح' لفظ 'رحم' (ہمدردی) سے پھوٹی ہے۔ روحنگی مسلمانوں کی یہاں آبادکاری کا آغاز آٹھویں صدی عیسوی میں ہوا' جب عرب تاجر اور ملاح چین جاتے ہوئے یہاں رُکے۔ اُن کے حُسنِ سلوک اور رحم بھرے جذبے سے متاثر ہو کر مقامی لوگوں نے انہیں مسلمان کے نام سے یاد کرنے سے زیادہ ''رحم کرنے والے'' لوگوں سے پہچانا اور پکارا۔ اس طرح نہ صرف یہاں کے لوگوں میں اسلام پھیلنا شروع ہوا' بلکہ مسلمانوں کے نام کے ساتھ ''روحنگ'' اور ''روحنگیا'' کا لاحقہ بھی منسلک ہو گیا۔

عجب بات ہے کہ جب یہاں کے لوگ ایمان کی دولت سے فیض یاب ہوئے' تو یہی دولت ان کے حقِ زندگی کے خلاف قتل کا جواز بھی بنائی گئی۔

اراکانی مسلمانوں میں چین کے صوبے ''یوہان'' کے علاوہ ہندوستان اور کچھ بنگالی النسل مسلمان بھی موجود ہیں۔ ان کی آبادی 10 لاکھ سے زیادہ ہے اور اقوامِ متحدہ کی رپورٹوں کے مطابق: ''روحنگی مسلمان دنیا کی مظلوم ترین اقلیتوں میں شمار ہوتے ہیں''۔

برمی مسلمانوں کے خلاف فرقہ پرست بدھوں کی یلغار کے آثار گزشتہ صدی کے دوسرے عشرے میں اُبھرے۔ گزشتہ 35 برس کے دوران میں جو بڑے واقعات ہوئے' ان میں 1978ء میں 2 لاکھ برمی مسلمانوں کو بنگلہ دیش دھکیل دیا گیا۔ پھر 1992ء میں ڈھائی لاکھ کو ملک بدر کیا گیا۔ افسوسناک یہ صورت ہے کہ ان تباہ حال مسلمانوں کو کوئی مسلمان ملک قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جو لوگ جان بچا کر تھائی لینڈ کی طرف گئے' انہیں تھائی ساحلی پولیس نے فائرنگ کر کے چھوٹی کشتیوں میں' کھلے سمندر میں ڈوبنے کے لیے چھوڑ دیا۔ 16 مارچ 1997ء کو ڈیڑھ ہزار بدھ بھکشوؤں کا ایک جلوس نفرت انگیز نعرے بلند کرتا سڑکوں پر نکل آیا' سب سے پہلے مسجدوں پر حملہ کر کے آگ لگا دی۔ قرآن کریم کے نسخے چُن چُن کر جلائے گئے۔ کینگ ڈن اور منڈالے کے شہر اس سے بُری طرح متاثر ہوئے۔ 15 مئی 2001ء کو تاونگو شہر میں بھکشوؤں نے مسلمانوں کے خلاف ہزاروں پمفلٹ تقسیم کیے' اور سورج غروب ہونے سے پہلے مسلمانوں کو گھیر گھیر کر جلایا' مارا اور لُوٹا گیا۔

بے شک روہنگیا مسلمانوں کا مسئلہ عالمی ضمیر کے لئے امتحان ہے!